CONFIDENTIAL
MEDICAL
MAFIA

بسمہ اللہ الرحمن الرحیم

DNA
ڈی این اے

نور راجپوت

انتساب

بابا...آپ کے نام!
ان تمام شکووں کے باوجود جو مُجھے آپ سے ہیں،
میں کہنا چاہتی ہوں کہ میری پہچان کی جڑیں آپ ہی سے جڑی ہیں۔
میں نے آپ کے ساتھ سب سے کم وقت گزارا ہے لیکن،
اگر میں ذہین ہوں۔اگر میں تخلیق کار ہوں۔
اگر میں ضدی ہوں تو اس کی وجہ آپ ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ جڑیں کٹ بھی جائیں تو شجر اپنی پہچان نہیں بدلتے۔
اور خون تو گلے شکووں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔
بابا...محبت اپنی جگہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔
فقط آپ کی بیٹی!

پیش لفظ

میں ایک عام انسان ہوں۔ایک عام لکھاری جسکا علم اور تجربہ محدود ہے اور آج میں خوش ہوں کہ آپ لوگوں کے ساتھ ایک نیا سفر شروع کرنے جارہی ہوں۔ڈی این اے میرا اب تک لکھا جانے والا سب سے مشکل پروجیکٹ ہے۔یہ کیوں لکھا جارہا ہے اسکا سوال شاید دینا ممکن نہیں کیونکہ فکشن رائٹر ہونے کی حیثیت سے میری پہلی ترجیح تفریح ہی ہے مگر اس کے ساتھ بہت سے اہم موضوعات ہیں جنہیں زیر بحث لانی چاہتی ہوں۔اسکی بیک اسٹوری ناول reveal کرنے پر ہی بتادی گئی ہے۔میں یہاں مزید ڈسکس نہیں کروں گی البتہ یہ کہوں گی کہ کہانی مکمل ہونے پر بہت سی باتیں ڈسکس ہوں گی۔ڈی این اے میرے مشکل ترین دور میں لکھا جانے والا ناول ہے۔ایک لکھاری کا المیہ اور اس کی سب سے بڑی طاقت یہی ہوتی ہے کہ جب اس کی اپنی دنیا بکھر رہی ہوتی ہے تو وہ لفظوں کی ایک نئی دنیا تخلیق کرنے بیٹھ جاتا ہے۔آج پہلی قسط آج آپ پڑھنے جارہے ہیں اور میں نے پہلی قسط ،دو اقساط کے برابر لکھی ہے تاکہ آپ سب کہانی سے جڑ سکیں۔ کردار زیادہ ہیں اسی لیے پہلی قسط میں صرف کرداروں کے تعارف پر توجہ دی گئی ہے تاکہ آپ کو کردار سمجھ آجائیں۔اگر آپ نہایت سنجیدہ کتابیں پڑھنے والے قاری ہیں تو شاید یہ آپ کو پسند نہ آئے البتہ اگر آپ پیچیدہ قصے کہانیاں پسند کرتے ہیں تو یہ آپ کے لیے ہے۔شروع کرنے سے پہلے سمجھ لیں کہ یہ ناول ہے۔اسکا سارا حصہ فکشن ہے سوائے ایک دو چیزوں کو چھوڑ کر جو ابھی اسپائلر کی وجہ سے ڈسکس نہیں کیا جاسکتا۔فکشن ناول ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس ناول میں کچھ چیزیں relatable لگیں گی جبکہ باقی حصہ بالکل ہی فکشن ہوگا۔کچھ چیزیں متنازعہ ہیں اور میں نے سوچ سمجھ کر شامل کی ہیں تاکہ انہیں زیر بحث لایا جاسکے۔زبان کا خاص خیال رکھا ہے تاکہ ہر طرح کے قاری پڑھ سکیں البتہ ایک دو جگہ پہ ایک دو الفاظ متنازعہ استعمال ہوئے ہیں۔میں نے انہیں کئی بار ہٹا کر دیکھا ہے مگر ان کے ختم کرنے سے جملے کا حسن نہیں بن رہا تھا اسی لیے شامل کرنا ضروری ہے۔

کہانی کیسی ہے یہ آپ پڑھ کر ہی جانیں گے۔کسی کو پسند آتی یا نہیں آتی یہ ہر قاری کی ذاتی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے تقریباً چھ مہینے کی محنت کے بعد میں بس یہ ایک قسط ہی لکھ پائی ہوں اور امید ہے آپ پہلی قسط پڑھنے کے بعد کہانی سے جڑ سکیں گے۔میں ڈاکٹر نہیں ہوں البتہ بہت سے ڈاکٹروں سے بہت سی چیزیں ڈسکس کرنے کے بعد انہیں قلمبند کیا گیا ہے۔یہاں میڈیکل مافیا کا راج دکھایا جائے گا مگر حقیقت میں کسی بھی پیشے کو برا دکھانا، ہرگز ہرگز مقصد نہیں ہے۔
جنہیں طویل ناول ایک ساتھ پڑھنے سے الجھن ہوتی ہے ان کے لیے مشورہ ہے کہ وہ ساتھ ساتھ پڑھیں کیونکہ اس سے طوالت کا احساس نہیں ہوتا اور قسط وار پڑھنے کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔میں آپ کے reviews کا انتظار کروں گی۔آپ جس بھی پلیٹ فارم پر اسے پڑھیں یا سنیں گے تو مجھے یاد رکھیے گا۔میں نیچے اپنا انسٹاگرام اکاؤنٹ اور ای میل دے رہی ہوں جہاں آپ مجھے اپنے خیالات بھیجتے رہیے گا۔

اور آخر میں کہنا چاہوں گی کہ میرے بھائی کے لیے ایک بار سورہ فاتحہ پڑھ کر ان کی مغفرت کی دعا لازمی کریں۔ جزاک اللہ!

نور راجپوت

انسٹاگرام:@itsnoorrajpoott

ای میل:noorrajpootwrites@gmail.com

تعارف

ڈی این اے!
یہ صرف جسم کا کوڈ نہیں ہوتا۔
یہ وہ سچ ہے جو چھپایا جا سکتا ہے مگر مٹایا نہیں جا سکتا۔

ہر جرم کا ایک DNA ہوتا ہے۔
کبھی کسی دوا کی شیشی میں کبھی انجیکشن کی سوئی میں،
کبھی کسی لیبارٹری کی خاموش میز پر،
اور کبھی مسیحا کے روپ میں کھڑے انسان کے لہجے میں۔
ہم سمجھتے ہیں کہ شفا دینے والے ہاتھ ہمیں زندگی دیتے ہیں،
مگر اکثر یہی ہاتھ، موت کے کوڈ بھی تحریر کر رہے ہوتے ہیں۔
وہ زہر جو جسم میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ پورے وجود کو بدل دیتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب طاقت اور دولت کا DNA بگڑ جائے
تو ہسپتال عبادت گاہیں نہیں رہتے، لیبارٹریاں شفا نہیں بناتیں،
اور عدالتیں انصاف نہیں بانٹتیں۔ وہ صرف ایک چیز پیدا کرتی ہیں، کنٹرول!
ڈی این اے انہی بگڑے ہوئے کوڈز کی کہانی ہے۔
وہ کوڈ جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔
وہ زہر جو خون میں نہیں نظام میں شامل ہوتا ہے۔

کچھ لوگ اپنی رگوں میں صرف خون نہیں رکھتے،
وہ ایک سوچ، ایک فریب، ایک قاتل نظام کا DNA اٹھائے پھرتے ہیں۔
ان کے وعدے محفوظ لگتے ہیں، ان کے لہجے مسیحائی ہوتے ہیں،
مگر ان کے فیصلے زندگی اور موت کے درمیان لکیر کھینچتے ہیں۔

یہ لوگ شطرنج کے مہروں کی طرح انسانوں کو حرکت دیتے ہیں۔

یہ ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں، قاتل بھی۔

یہ دوست بھی ہوتے ہیں، غدار بھی۔

یہ نجات دہندہ بھی بنتے ہیں اور خاموش جلاد بھی۔

ہم سمجھتے ہیں ہم محفوظ ہیں۔

ہماری دوائیں ہمیں بچا رہی ہیں۔

ہماری محبتیں ہمیں زندگی دے رہی ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے،

ہم اکثر مرنا تب شروع کرتے ہیں

جب ہمیں لگتا ہے ہم ٹھیک ہو رہے ہیں۔

کبھی کسی علاج کے نام پر،

کبھی کسی رشتے کی آڑ میں،

کبھی کسی خواب کی قیمت چکا کر۔

کبھی کوئی لمس...

ایک لمحے کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ساتھ کھول دیتا ہے۔

کبھی ایک بے جان چیز

اپنے اندر چھپی ہوئی چیخوں کو سنانے لگتی ہے۔

اور کبھی...

ایک انسان صرف چھو کر بتا دیتا ہے کہ

جرم کہاں نہیں ہوا... بلکہ کیوں ہوا؟

مگر مسئلہ یہ ہے ایسے لوگ ثبوت نہیں ہوتے۔

ایسے سچ عدالت میں نہیں بولے جاتے۔

اور ایسے احساسات...

سائنس کی زبان میں جھوٹ کہلاتے ہیں۔

اسی لیے...انہیں کہانیوں میں چھپا دیا جاتا ہے۔
خاموش رکھا جاتا ہے۔
یا پاگل قرار دے دیا جاتا ہے۔
کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ
ہر جرم کا ایک نظر نہ آنے والا عکس بھی ہوتا ہے۔
تو پھر دنیا کے سب سے بڑے راز
صرف DNA میں نہیں رہیں گے۔

یہ ایک ایسی دنیا کا در کھولتا ہے جہاں،
دوا اور زہر کا فرق مٹ جاتا ہے۔
ڈاکٹر اور قاتل کی سرحد دھندلا جاتی ہے۔
محبت اور نفرت ایک ہی چہرے پر اتر آتے ہیں۔
اور انسان اپنی مرضی سے نہیں مرتا،
بلکہ آہستہ آہستہ سم (زہر) سے مسموم (زہر خوردہ) ہو جاتا ہے۔

یہ صرف ایک کہانی نہیں۔
یہ اس دور کا سچ ہے
جہاں جرم کا چہرہ بدل چکا ہے۔
جہاں زہر وراثت بن جاتا ہے۔
مگر اس کا کوڈ آج بھی وہی ہے...ڈی این اے!

☆☆☆☆☆

باب اول

CHAPTER #1

سم (زہر)

میں سَم ہوں۔

میں سَم ہوں۔

میں نظر نہیں آتا مگر جب رگوں میں اتر جاؤں تو خون کا رنگ بدل دیتا ہوں۔

میں شور نہیں مچاتا۔ میں آہستہ آہستہ کام کرتا ہوں۔ میں چیختے چلاتے ہوئے نہیں آتا۔

میں مسکرا کر داخل ہوتا ہوں۔ کبھی دوستی کی صورت میں، کبھی محبت کے وعدے میں لپٹا ہوا اور کبھی خلوص کے نام پر پیش کیا گیا ایک گھونٹ ہوتا ہوں۔

میں ایک دن میں نہیں بنتا۔ مُجھے برسوں لگتے ہیں۔

برسوں کی خاموشی، دبے ہوئے شکوے، ادھوری باتیں اور وہ سوال جو کبھی پوچھے نہ گئے... یہ سب مل کر مُجھے جنم دیتے ہیں۔

میں اکثر دوستی میں پلتا ہوں۔

وہ دوستی جو بہت قریبی ہو، بہت گہری، جہاں فاصلے باقی نہ رہیں۔

کیونکہ جہاں فاصلے نہیں ہوتے، وہیں توقعات جنم لیتی ہیں۔

اور جہاں توقعات ہوتی ہیں، وہیں مایوسی میرا پہلا ہتھیار بنتی ہے۔

میں محبت میں بھی جنم لیتا ہوں۔ اس محبت میں جو بے لوث نہ رہے۔

جو مالک بننا چاہے، جو برابری قبول نہ کرے۔

وہ محبت جو وقت کے ساتھ نفرت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہو،

وہی مُجھے زندہ رکھتی ہے۔

میں صرف دشمن پیدا نہیں کرتا۔ میں دشمنی کو جنم دیتا ہوں۔

میں رشتوں کو نہیں توڑتا میں انہیں اندر سے کھوکھلا کرتا ہوں۔

پہلے اعتبار مرتا ہے پھر احترام اور آخر میں یادیں بھی زہر آلود ہو جاتی ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ دشمن باہر سے آتا ہے مگر اصل دشمن وہ ہوتا ہے،

جو کبھی دوست تھا، جسے سب کچھ معلوم تھا... کمزوریاں بھی، خواب بھی،

اور وہ مقام بھی جہاں وار کیا جا سکے۔

سَم صرف ایک لفظ نہیں بلکہ اس بدترین دشمنی کا عنوان ہے جو کسی گہرے دوست کے دل میں پلتی تھی کیونکہ جب محبت راستہ بدلتی ہے تو وہ سیدھی نفرت کی کھائی میں جا گرتی ہے اور وہاں سے لوٹنے والا ہر انسان ایک جیتا جاگتا درندہ بن جاتا ہے!

بزدار میڈیکل کالج (BMC)!

باہر بادل زور و شور سے گرج رہے تھے مگر کالج کے مرکزی آڈیٹوریم کے اندر کی فضا اس سے کہیں زیادہ سپاٹ اور تناؤ زدہ تھی۔ آڈیٹوریم طلبہ سے بھرا ہوا تھا۔ مستقبل کے ڈاکٹرز جو سانس روکے اسٹیج پر موجود اس شخص کو سن رہے تھے جس کی آواز کی کاٹ اندر تک اترتی تھی۔ اسٹیج کے پیچھے ایک دیوہیکل گلاس وال تھی جس کے پار برستی بارش اور کالی رات کا مہیب منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسٹیج پر کھڑا شخص، جس کے سفید کوٹ پر اس کا نام جلی حروف میں لکھا تھا مائیک سنبھالے ڈی این اے (DNA) کے پیچیدہ موضوع پر لیکچر دے رہا تھا۔

"ڈی این اے صرف ایک کوڈ نہیں ہے..." اس کی آواز ہال میں گونجی۔ "یہ ایک ایسی زنجیر ہے جو آپ کو آپ کے ماضی، آپ کے گناہوں اور آپ کی نسلوں کے ہر اس سچ سے جوڑتی ہے جسے آپ چھپانا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا چہرہ بدل سکتے ہیں، اپنا نام بدل سکتے ہیں مگر اپنی جبلت میں چھپا وہ حیوان نہیں بدل سکتے جو آپ کو وراثت میں ملا ہے۔"

آڈیٹوریم کے آخری حصے تک اس کی آواز پہنچ رہی تھی۔ طلبہ اونچائی کی جانب رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ باہر طوفانی بارش یونہی جاری تھی اور کالج کی سب سے اونچی عمارت 'اکیڈمک ٹاور' کی چھت پر ہوائیں تیز ترین تھیں۔ یہ ٹاور دراصل مرکزی آڈیٹوریم سے متصل تھا اور اونچائی میں اس سے کئی گنا بڑا تھا۔ اس ٹاور کی منڈیر پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سفید لباس بارش میں بری طرح بھیگ چکا تھا اور ہوا کے تھپیڑوں سے اس کے کھلے بال چہرے پر طمانچے مار کر اب گردن اور چہرے سے چپک چکے تھے۔ نیچے آڈیٹوریم کی چھت ایک وسیع شیشے کے گنبد کی طرح نظر آ رہی تھی جو اندر جلتی روشنیوں کی وجہ سے تاریک رات میں ایک روشن جزیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ چھت کا صرف وہ حصہ شیشے کا تھا جہاں اسٹیج تھا اور اسٹیج پہ کھڑا شخص اس لڑکی کو یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔
اس کے ذہن میں آوازوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے جینے نہیں دے رہا تھا۔ وہ تھک چکی تھی۔ اس دباؤ سے، اس سچ سے جو اس کے اندر زہر بن کر پھیل رہا تھا۔ وہ اسٹیج پر کھڑے اس شخص کا سر دیکھ رہی تھی جو بڑے فخر سے خاندانی سچائیوں اور حیوانی جبلت پر تقریر کر رہا تھا۔

"جھوٹ... سب جھوٹ ہے۔" لڑکی کے نیلے پڑتے لبوں سے ایک سرگوشی نکلی۔
اس کا سر چکرا اٹھا۔ دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اسے لگا جیسے دماغ ابھی پھٹ جائے گا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنا پورا بوجھ آگے کی طرف منتقل کر دیا۔

"آپ کا ڈی این اے ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ جلا نہیں سکتے۔" پروفیسر کی آواز گونجی۔ "آپ کا خون وہ گواہی دے گا جو آپ کی زبان

نہیں دے سکتی۔انسان کے اندر کا جانور..."

ابھی جملہ ادھورا تھا کہ چھت کی جانب سے ایک خوفناک آواز آئی۔اگلے ہی سیکنڈ...
ہال کے اندر موجود طلبہ نے ایک ہولناک آواز سنی۔ یہ آواز کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔اچانک کچھ اسٹوڈنٹس کی نظریں اوپر اٹھیں اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں انہوں نے دیکھا کہ ٹاور سے چھلانگ لگانے والا وہ وجود، کششِ ثقل کی پوری رفتار کے ساتھ شیشے کے موٹے سلیب کو توڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔آڈیٹوریم کی اونچی شیشے والی چھت جو اسٹیج کے عین اوپر تھی، ایک ہی لمحے میں ریزہ ریزہ ہوگئی۔ ہزاروں، لاکھوں کانچ کے ٹکڑے ہیروں کی بارش کی طرح نیچے گرے اور ان کے ساتھ ہی وہ سفید لباس والی لڑکی سیدھی اسٹیج کے وسط میں پروفیسر کے سامنے آگری۔ایک لرزا دینے والی آواز کے ساتھ ہڈیاں ٹوٹنے کی صدا آئی۔ پورے ہال میں چیخیں گونج اٹھیں۔افراتفری مچ گئی۔وہ لڑکی اب خون کے تیزی سے پھیلتے ہوئے سرخ تالاب میں پڑی تھی۔اس کا جسم عجیب زاویے پر مڑا ہوا تھا۔کانچ کی کرچیاں اس کے وجود میں پیوست تھیں۔چھت کے اس ٹوٹے ہوئے حصے سے بارش کا پانی اب اسٹیج پر گر کر اس کے خون کو مزید پھیلا رہا تھا۔وہ بالکل اسی شخص کے قدموں میں گری تھی جو ڈی این اے کے اٹل سچ پر لیکچر دے رہا تھا۔اس شخص کے بوٹوں پر لڑکی کے خون کی چھینٹیں پڑی تھیں۔اس نے ساکت نظروں سے نیچے دیکھا۔شیشے کے وہ ٹکڑے جو ہال کی لائٹس میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے اب اس لڑکی کے جسم میں پیوست تھے۔زیادہ تر اسٹوڈنٹس چیختے چلاتے باہر کی جانب بھاگے تھے لیکن اسٹیج پہ کھڑے شخص کے آس پاس خاموشی ایسی تھی کہ بارش کی بوندوں کے گرنے کی آواز بھی واضح سنائی دے رہی تھی۔ مستقبل کے ڈاکٹرز کا وہ ہال کچھ دیر بعد ایک کرائم سین میں بدل چکا تھا۔وہ لڑکی مر چکی تھی مگر اس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں اب بھی اسٹیج پر موجود اس شخص سے ایسا سوال پوچھ رہی تھیں جس کا جواب کسی ڈی این اے رپورٹ میں موجود نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کی گہری سیاہی میں بھی 'بزدار ہسپتال' کی آسمانی عمارت کسی دیو قامت ستون کی طرح شہر کی فضا میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔شیشے اور اسٹیل کی یہ جدید عمارت اپنی روشنیاں بکھیرتی ایک ایسا قلعہ لگ رہی تھی جہاں امید اور خوف دونوں کا بیک وقت بسیرا تھا۔ہسپتال کے وسیع گراؤنڈ میں ایمرجنسی وارڈ کے سامنے ایمبولینسوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ان کی سرخ اور نیلی روشنیاں رات کے سناٹے کو چیر رہی تھیں۔اندر گلیاروں اور راہداریوں میں سفید اور نیلے کوٹ پہنے ڈاکٹرز اور نرسیں، فائلوں اور ادویات کی ٹرالیوں کے ساتھ سرگرداں تھے۔ ہر چہرے پر پیشہ ورانہ مصروفیت کے ساتھ ایک تھکن بھی عیاں تھی۔مگر یہ سب کچھ اس عمارت کی سب سے اوپری منزل پر موجود ایک ایسے دفتر سے نظر نہیں آسکتا تھا جو شہر کے تمام شور سے ماورا تھا۔ یہ بزدار ہسپتال کی سب سے آخری اور اونچی منزل تھی جسے ایک خاص سیکیورٹی حصار میں رکھا گیا تھا۔یہیں پر قریباً اسی سالہ امجد بزدار کا ذاتی دفتر تھا۔طاقت، دولت اور اسرار کا گڑھ۔دفتر کی بڑی گلاس ونڈو سے شہرِ بے

اماں کی جلتی روشنیاں کسی بکھرے ہوئے موتیوں کے ہار کی طرح چمک رہی تھیں۔ نیچے اس ہسپتال کے میدان میں دوڑتی انسانی زندگی کی تگ ودو محض ایک مبہم عکس بن کر رہ جاتی تھی۔ کمرے میں مدھم زرد روشنی تھی اور مہنگے سگار کا دھواں فضا میں لہریں بنا رہا تھا۔ امجد بزدار، اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کی کمر میں ہلکا سا خم تو آ چکا تھا مگر آنکھوں میں اب بھی ذہانت باقی تھی۔ ان کے پرانے اور قریبی دوست، ظہور لغاری، سامنے پڑے چمڑے کے صوفے پر بیٹھے سگار پھونک رہے تھے۔ ان کی طویل میڈیسن پر چلتی طویل گفتگو کچھ لمحے پہلے ہی ختم ہوئی تھی اور ظہور صاحب کی آنکھوں میں اب ایک تجسس اور بے چینی کی رمق سی ابھری۔

"امجد صاحب!" انہوں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، "آپ کا کاروبار اب اس نہج پر ہے جہاں دشمنوں کی گنتی کرنا ناممکن ہے۔ حفاظتی اقدامات مزید سخت کرنے ہوں گے۔ صرف سیکیورٹی گارڈز کافی نہیں، کوئی ایسی ڈھال چاہیے جو لوہے کی ہو۔ کیا خیال ہے؟"

حال ہی میں امجد بزدار صاحب کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ ان پر جان لیوا حملہ ہوا تھا مگر وہ بچ گئے۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ یہ سنتے امجد بزدار کے لبوں پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔ یوں جیسے وہ محظوظ ہوئے ہوں۔ یوں جیسے انہیں اس بات کی توقع نہ ہو۔

"حفاظتی اقدامات بزدل کرتے ہیں، شکاری تو صرف دہشت پالتے ہیں۔"

وہ کرسی سے اٹھے۔ ان کی جسامت اور قد واضح ہوا۔ اسی کی عمر میں بھی وہ کافی چست اور صحت مند لگتے تھے۔ صاف رنگت، سرمئی بال اور ذہین آنکھیں جو دور تک دیکھنے کی عادی تھیں۔ شہر کی روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، وہ ایک قصہ گو کے انداز میں بولے۔

"میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔"

بزدار صاحب کے مقابلے میں، دبلی پتلی جسامت والے ظہور لغاری کی نظریں ان کی پشت پر جمی تھیں۔

"بہت پرانی بات ہے، ایک چرواہا تھا جس کے پاس سینکڑوں مویشی تھے۔ گائے، بھینسیں، بھیڑیں۔ اس کا ریوڑ اتنا بڑا ہو گیا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ جنگلی جانوروں کے ڈر سے اس نے بڑے بڑے شکاری کتے پالے، اونچی دیواریں بنائیں، پہرے دار بٹھائے مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی کوئی درندہ ریوڑ سے ایک آدھ جانور اٹھا لے جاتا۔"

وہ آنکھیں چھوٹی کیے، باہر رینگتی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔

" آخر کار اس چرواہے نے ایک عجیب کام کیا۔اس نے کتوں کی جگہ ایک بھیڑیا پالا۔ایک ایسا زخمی بھیڑیا جس کی ول (Will) ٹوٹ چکی تھی، جسے اپنوں نے رد کر دیا تھا اور جس کے اندر صرف بھوک اور انتقام باقی تھا۔ چرواہے نے اسے گوشت نہیں دیا، بلکہ اسے دشمنوں کا لہو چکھنا سکھا دیا۔"

" بھیڑیا؟ وہ تو خود ریوڑ کے لیے خطرہ بن سکتا تھا؟" ظہور صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ یہ کیسا قصہ تھا؟

"یہی تو راز ہے۔ بھیڑیا کبھی ریوڑ کو نہیں کھاتا اگر اسے یہ یقین دلا دیا جائے کہ ریوڑ اس کی اپنی جاگیر ہے۔ وہ کتا نہیں تھا کہ دم ہلاتا، وہ ایک خاموش موت تھی جو ریوڑ کے گرد پہرا دیتی تھی۔ جس دن جنگل کے دوسرے درندوں کو پتا چلا کہ اس ریوڑ کی حفاظت ایک بھیڑیا (beast) کر رہا ہے، اس دن کے بعد جنگل کے شیروں نے بھی راستہ بدل لیا۔"

ان کی آخری بات پر ظہور صاحب کو اپنے اندر سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اپنا سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور بے چینی سے انہیں دیکھا۔

امجد بزدار اپنی میز کی جانب واپس پلٹے اور میز پر ایک جانب رکھا فوٹو فریم اٹھایا۔ جس میں ایک خوش شکل نوجوان نظر آ رہا تھا جس کی آنکھیں بھیڑیے جیسی نیلی تھیں۔ روشن اور سرد!

"اور میرے پاس وہ بھیڑیا موجود ہے، ظہور صاحب!" ان کا لہجہ فخر سے لبریز تھا۔

" میرا کاروبار کتنا ہی پھیل جائے، میری سلطنت پر کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس کی سرحدوں پر 'حق بزدار' کھڑا ہے۔"

یقیناً فوٹو فریم میں نظر آتا وہ لڑکا، حق تھا۔ یہ اس کے لڑکپن کی تصویر تھی۔ وہ شکل وصورت میں امجد بزدار جیسا تھا۔ اپنے دادا جیسا لیکن اس کی آنکھیں مختلف تھیں۔

" مگر پھر بھی..." ظہور صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

"جب تک حق زندہ ہے، بزدار خاندان کو کوئی چھو نہیں سکتا۔" انہوں نے گہری سانس لیتے فریم واپس رکھ دیا جبکہ ظہور صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے صرف سر ہلایا۔ امجد بزدار صاحب نے گفتگو کا رخ ایک بار پھر میڈیسن کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆☆☆

دوسری جانب اسی شہر کے ایک پرسکون کونے میں واقع عرب ٹاؤن اپنی خاموشی اور کشادہ سڑکوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی ٹاؤن کی گلی نمبر سات کے موڑ پر 'شبگیر ہاؤس' ایستادہ تھا۔ بارہ مرلے کا ایک دومنزلہ مکان، جس کی دیواروں پر اترا ہوا روغن نہ زیادہ نیا تھا اور نہ بہت پرانا۔ یہ گھر اپر مڈل کلاس طبقے کی اس رکھ رکھاؤ والی زندگی کا آئینہ دار تھا جہاں ساری آسائشیں تو نہ تھیں مگر جڑیں اب بھی پرانی روایات میں پیوست تھیں۔ گہرے بھورے رنگ کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک درمیانہ گیراج تھا اور پھر اس کے ساتھ بڑا سا باغیچہ تھا جہاں پودوں کے ساتھ ساتھ دھنیا پودینہ اور ٹماٹر اگائے جاتے تھے جبکہ بائیں جانب کھلا صحن تھا جس میں ایک جانب لوہے کی چار کرسیاں اور میز رکھی تھی، جن کا سفید روغن بارش میں بھیگ کر کچھ حد تک اتر چکا تھا اور لوہے کا ہی جھولہ رکھا تھا جس کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ وزنی ہونے کے باوجود انہیں سالوں پہلے جہاں لا کر رکھا گیا تھا آج تک وہیں پڑے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے نہیں تھے بس روغن اتر گیا تھا۔ صحن ختم ہوتے ہی بائیں جانب پتلی راہداری گھر کے پچھلے حصے میں جا رہی تھی جہاں لانڈری ایریا تھا اور دائیں جانب داخلی دروازہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب سیڑھیاں تھیں جو اوپر جا رہی تھیں اور بائیں جانب کچن تھا جہاں اس وقت زہرہ بیگم روٹیاں بنا رہی تھیں۔ سیڑھیوں سے آگے ڈرائنگ روم تھا جو مہمانوں کے آنے پر ہی کھلتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ڈائننگ ایریا تھا جو کچن اور لاؤنج کے درمیان ایک پل کا کام کرتا تھا۔ گھر کا اصل دل اس کا گول لاؤنج تھا۔ یہ ایک وسیع دائرہ نما ہال تھا، جس کے گرد چار کمرے کسی تسبیح کے دانوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ اس لاؤنج کے عین مرکز میں رکھی پرانی وضع کی صوفہ نشینی پر دادی کا مستقل قبضہ رہتا تھا جہاں سے وہ پورے گھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی تھیں۔ اوپر کی منزل بھی بالکل اسی نقشے کی نقل تھی۔ چار کمرے اور ایک ہال مگر اس وقت زندگی کی ساری گہما گہمی نچلے پورشن میں سمٹی ہوئی تھی۔ یہ گھر اپنی ساخت میں جتنا سادہ تھا، اپنی روایت میں اتنا ہی وزنی بھی تھا۔ مغرب کا وقت کب کا ڈھل چکا تھا اور آسمان پر گہری سیاہی چھا رہی تھی۔ گھر کے اندر ایک عجیب سی بے چینی کا راج تھا۔ کچن سے آنے والی تپش اور روٹیاں پکنے کی آواز کے ساتھ ساتھ زہرہ بیگم کے بڑبڑانے کی آوازیں گھر کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔

" آگ لگے اس اجلاس کو! ہر روز کا یہی تماشہ ہے، ادھر تو اچولہے پہ دھرا نہیں اور ادھر ان کے عالمی مسائل شروع ہو گئے۔"

باہر ڈائننگ ہال میں بھاری میز کے سرے پر کمالہ بیگم یعنی دادی بیٹھی تھیں۔ وہ اپنی مخصوص ململ کی چادر اوڑھے، ہاتھ میں عقیق کی تسبیح گھما رہی تھیں مگر ان کی توجہ ذکر پر کم اور اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں اور کچن کے دروازے پر زیادہ تھی۔ ان کی بھنویں سکڑی ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی گہرے حساب کتاب میں مصروف ہوں۔ گھر میں سامان پرانا تھا مگر سلیقے سے رکھا گیا تھا۔

زہرہ بیگم چہرہ پونچھتیں کچن سے باہر نکلیں، ہاتھوں میں گرم روٹیوں کا ہاٹ پاٹ تھامے اسے میز پر دھر دیا۔ پھر تیکھی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر پہلی سیڑھی پر چڑھتے ہی ریلنگ پر ہاتھ جمایا اور آواز لگائی۔ ان کا چہرہ چولہے کی تپش اور غصے سے تپ رہا تھا۔

"نیمل...؟ سلال...؟ نامرہ...؟ تارہ...نوفہ؟"

ان کے پکارنے کی ترتیب کبھی نہیں بدلتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے پانچ بچوں کے نام ترتیب سے پکارتی تھیں۔

"تم سب نیچے آ رہے ہو یا میں اوپر آؤں؟" ان کی آواز میں وہ گرج تھی جو ماں کی آخری وارننگ ہوتی ہے۔ یعنی اب کے آواز نہیں چپل آئے گی۔ دادی نے تسبیح کے دانوں کی رفتار تھوڑی دھیمی کی اور عینک کے اوپر سے بہو کو دیکھا۔

" کیوں اپنا لہو جلاتی ہو زہرہ؟ تم جانتی ہو یہ ان کے روز کا کام ہے۔"

زہرہ بیگم نے مڑ کر ساس کو دیکھا، "ہاں میرا خون جلانا ان کا روز کا کام ہے۔ مجال ہے جو پہلی پکار پر اتر آئیں۔"

دادی کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آئی، انہوں نے تسبیح کی ڈوری کو انگلی پر لپیٹا اور آرام سے بولیں۔

"ارے بھئی، جوان خون ہے۔ اوپر والے کمرے میں شاید دنیا فتح کرنے کے نقشے بنا رہے ہوں گے۔ کچھ غلط تو نہیں کر رہے نا۔" دادی نے بچوں کی طرف داری کی۔

" آپ آج کل کے بچوں کو اچھے سے جانتی ہیں انہیں دنیا فتح کرنے میں نہیں، تباہ کرنے میں زیادہ دلچسپی زیادہ ہے۔" وہ آخری نظر سیڑھیوں پہ ڈالتے ہوئے واپس پلٹیں۔ ان کی بات پر دادی کی بھنویں ہلکی سی سکڑیں۔

" تمہیں کیا لگتا ہے پہلے کے بچے شریف تھے؟ ارے تمہارے یہ پانچ بچے اگر لڑیں گے تو ایک دوسرے کا ہی سر پھاڑیں گے۔ میں نے ان کے باپ اور چچا کو اکیلے جھیلا ہے۔ سقراط تو باہر والوں کا پھاڑ کر آتا تھا۔ شکر کرو یہ بچے شریف ہیں۔ آج کل کے بچوں کو پالنا آسان ہے بس پیدا ہوتے ہی اسکرین ہاتھ میں پکڑا دو... ان بچوں کا کھانا پینا اور آکسیجن سب کچھ وہی اسکرین بن جاتی ہے۔"

دادی نے برا سا منہ بناتے ہوئے فوراً اپنا درد کہہ ڈالا۔ سقراط کے مزاج سے تو زہرہ بیگم بھی اچھے سے واقف تھیں۔

" سر پھاڑیں یا دنیا فتح کریں۔ مُجھے مطلب ہے تو بس اس گرم روٹی سے جواب ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" زہرہ بیگم نے تلملا کر کہا اور دوبارہ اوپر کی سمت منہ کر کے پکارا۔ " آخری بار کہہ رہی ہوں، اگر پانچ منٹ میں نیچے نہ آئے تو کچن کو تالا لگ جائے گا!" اب وہ واپس آ کر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکی تھیں۔ دادی نے تاسف سے ایک گہری سانس لی۔

" بہو تمہیں مسئلہ روٹیوں سے نہیں اس خاموشی سے ہے جو اس وقت گھر پہ چھائی ہے۔" دادی اپنی بہو کو اچھے سے جانتی تھیں۔ زہرہ بیگم کو روز کی اس خاموشی سے کوفت ہوتی تھی جو پندرہ بیس منٹ کے لیے پورے گھر پہ چھا جاتی تھی جب بچے اوپر جاتے تھے۔ ان کی بات پر زہرہ بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

" نہیں ایسی بات نہیں..."

" میں تمہیں اچھے سے جانتی ہوں زہرہ! میرے سامنے بننے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ بچے ابھی نیچے اتر آئیں گے اور اس کے ساتھ ہی طوفان آ جائے گا اور تم پھر انہیں ڈانٹو گی۔" زہرہ بیگم نے خفگی سے اپنی ساس کو دیکھا۔ وہ واقعی انہیں اچھے سے جانتی تھیں۔

" ماؤں کو عادت ہوتی ہے۔ مُجھے بھی تھی اور اب بھی ہے... لو دیکھو ذرا..."

یہ کہتے ہی انہوں نے تسبیح میز پر دھری اور ساتھ ہی ان کی آواز ابھری۔

" سرمد... ارے او سرمد... ماں کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے تمہارے پاس؟ چالیس منٹ ہو گئے فیکٹری سے آئے ہوئے۔ مجال ہے جو..."

دادی کا چہرہ مصنوعی غصے سے سرخ ہوتے دیکھ کر زہرہ بیگم کا چہرہ خفت سے سرخ پڑا۔دوپٹے منہ پر رکھتے ہوئے انہوں نے مسکراہٹ ضبط کی۔ہاں شاید یہ ہر ماں کی عادت ہوتی ہے۔ان کے خفگی بھرے بول، گھر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ڈائننگ اور لاؤنج میں ان کی آوازیں گونج رہی تھیں جبکہ ان کے پیچھے سیڑھیوں کے اختتام پر دائیں جانب والا وہ کمرہ، جسے گھر والے تو محض لائبریری کہتے تھے مگر ان پانچ بچوں کے لیے وہ ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔اس کمرے کی مرکزی لائٹ بند تھی لیکن چھت کے عین بیچوں بیچ لٹکا ہوا ایک تیز پیلا بلب اس گول میز پر اپنی پوری روشنی انڈیل رہا تھا جس کے گرد پانچ کرسیاں جمی تھیں۔منظر ایسا تھا جیسے کسی زیرِ زمین تنظیم کا خفیہ اجلاس ہو رہا ہو۔ پیچھے کی دیوار پر کتابوں کے شیلف تھے جن میں قانون اور میڈکل کے علاوہ ڈھیروں فکشن اور نان فکشن کتابیں تھیں۔اور سامنے والی دیوار پر لگے میڈلز اور سرٹیفکیٹس اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ پانچ بچے محض عام بچے نہیں بلکہ محنتی اور میدان مارنے والے تھے۔

"ٹھیک ہے، ہمارے پاس وقت کم ہے۔امی کا پارہ ہائی ہو چکا ہے۔" سلال کی بھاری آواز سنائی دی۔

وہ ترتیب میں دوسرے نمبر پر تھا اور میز پر اپنی ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔اس کے دائیں جانب نیمل بیٹھی تھی۔سب سے بڑی بہن، پرسکون مگر کنٹرولڈ! اس کی موجودگی ہی اس کمرے کے نظم وضبط کو قائم رکھتی تھی۔میز کے گرد ترتیب کچھ یوں تھی کہ سلال کے بائیں جانب نیمل، دائیں نامرہ، اور پھر جڑواں تارہ اور نوفہ تھیں۔(نیمل کے ساتھ نوفہ اور نامرہ کے ساتھ تارہ) وہ گول میز کے گرد دائرے میں ہی بیٹھے تھے۔ نامرہ کا حال سب سے الگ تھا۔وہ کرسی پر ایسے ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھی جیسے اس کی روح نیند کے کسی گہرے سمندر میں غوطے کھا رہی ہو۔وہ زیادہ تر نیند میں رہتی تھی۔خاص کر اس وقت۔یہ اسکا روز کا کام تھا۔سردیوں کی شدت کم پڑ چکی تھی مگر وہ سلال کی ہڈی پہنے ہوئے تھی۔

"چلو، نوفہ سے شروع کرتے ہیں۔جلدی بتاؤ نوفہ، آج کا کیا ڈن (Done) ہے؟"

سلال نے قلم انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا۔اس کی گہری اور سمجھدار آنکھیں نوفہ پر جمی تھیں۔نوفہ اور تارہ دونوں جڑواں تھیں۔شکلیں کس قدر ایک جیسی ہونے کے باوجود دونوں میں پہچان کرنا بہت آسان تھا۔نوفہ تھوڑی گول مٹول تھی جبکہ تارہ دبلی پتلی۔نیمل نے ایک بڑی اور بھاری ڈائری نما نوٹ بک نوفہ کی طرف سرکا دی۔
نوفہ سب سے چھوٹی مگر سب سے زیادہ تصوراتی تھی، اس نے ڈائری اپنی جانب کرتے ہوئے پھرتی سے ایک سفید صفحہ نکالا اور قلم سے موٹے حروف میں لکھنا شروع کیا۔

" آج میں نے شطرنج کی ایک نئی اوپننگ (Opening) سیکھی۔"

اس نے فخر سے سب کو دیکھا مگر پھر فوراً سر جھکا کر دوسرا پوائنٹ لکھا جو اصل میں اس کی آج کی الجھن تھی۔

" کیا روحی اگلی ملکہ ہوگی؟ کیا وہ اچھی ملکہ بنے گی یا پھر...؟"

"ایک منٹ! یہ روحی کون ہے؟"

نامرہ کے سوا (جو ابھی تک اونگھ رہی تھی) باقی تینوں یعنی نیمل، سلال اور تارہ نے ایک ساتھ، ایک ہی لے میں پوچھا۔ جبکہ نوفہ نے حیرت سے سر اٹھایا جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کے بہن بھائی اتنے انجان ہو سکتے ہیں؟

" آپ سب روحی کو نہیں جانتے؟ عنکبوت کی روحی! میں اس سے بے حد متاثر ہوں، پر تھوڑی متجسس بھی ہوں کہ وہ کون سا راستہ چنے گی؟ حق کا یا...؟"

"ایک اور کتاب، ایک اور ناول..." سلال نے اپنا ماتھا پیٹا۔ "نوفہ تم کب ان قصوں کہانیوں سے باہر بھی نکلو گی؟ یہ ہمارا ڈیلی لاگ (Daily Log) ہے کوئی بک ریویو نہیں!"

" قصے ہی تو زندگی بناتے ہیں سلال بھائی!" نوفہ نے معصومیت مگر پر اعتمادی سے جواب دیا۔

"اور روحی کا کردار عام نہیں ہے، وہ ایک گتھی ہے جسے میں سلجھانا چاہتی ہوں۔" اسکا گول مٹول سا چہرہ یہ بتاتے ہوئے سرخ پڑا جبکہ نیمل اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر دھیما سا مسکرائی۔ نوفہ اس گھر کا سب سے فرمانبردار اور کام کرنے والا بچہ تھی۔

" ٹھیک ہے نوفہ، تمہاری الجھن نوٹ کر لی گئی ہے۔ اب تارہ کی باری۔"

نیمل کے کہنے پر نوفہ نے سرخ چہرے کے ساتھ سر ہلاتے، ڈائری تارہ کی جانب کھسکا دی۔

نیچے سے زہرہ بیگم کی ایک اور وارننگ کی گونج آئی تو سب کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے سکتہ طاری ہوا مگر پھر وہ دوبارہ اپنی اس چھوٹی سی کائنات میں مگن ہو گئے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ دن بھر کی تھکن، الجھنیں اور کامیابیاں اس گول میز کے سپرد کر کے وہ ہلکے پھلکے ہو کر نیچے اترتے تھے۔ روزانہ کی ایک نئی الجھن اور روزانہ کی ایک نئی سیکھ۔ اس ڈیلی لاگ نے ان کی زندگی کو ایک نئی سمت دے دی تھی۔
نین تارہ کی باری آئی تو اس نے اپنی کرسی میز کے قریب کی اور جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل ہینڈ کیمرہ نکال کر میز پر ایسے رکھا جیسے کوئی بہت بڑی ٹرافی ہو۔ وہ شکل وصورت میں نوفہ جیسی ہی تھی مگر مزاج میں اس کے برعکس۔ جہاں نوفہ لفظوں کی قید میں رہتی، تارہ ثبوتوں اور مشاہدوں کی طالب تھی۔ اس کی آنکھیں ہر وقت کمرے کے کونوں کھدروں کا جائزہ لیتی تھیں جیسے کہیں کوئی سراغ چھپا ہو۔

"میرا ڈن تو بہت ہی کلاسک ہے۔" اس نے شرارتی نظروں سے سب کو دیکھا اور کیمرے کی سکرین ان کی طرف موڑی۔ اس کا انداز پر اعتماد تھا۔

"آج میں نے ریکارڈنگ کے دوران 'باڈی لینگوئج ریڈنگ' کی ایک نئی ٹیکنیک آزمائی ہے۔"

"مطلب؟" سلال نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آج جب پاپا فیکٹری سے آئے اور امی نے ان سے آپی (نیمل) کے جہیز کے کچھ سامان پوچھا جس کی لسٹ میں نے انہیں واٹس اپ کی تھی تو انہوں نے اپنی بائیں آنکھ جھپکائی اور ناک کو چھوتے کہا کہ وہ سامان فیکٹری میں بھول آئے ہیں۔ کل لے آئیں گے۔ ڈی ٹیکٹو سائنس کے مطابق یہ 'چھپانے' کی علامت ہے۔ میں نے اس پندرہ سیکنڈ کے کلپ کو فائل نمبر 402 میں سیو کر لیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے پاپا جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں۔ ابھی میں نیچے جا کر یہ ویڈیو انہیں دکھاؤں گی اور..."

سلال اور نیمل نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے اختیار ہنس دیے۔

"تارہ اگلی شرلاک ہومز بننے کے چکر میں گھر والوں کو ہی مجرم بنا دے گی۔" سلال نے کس قدر ڈرامائی انداز میں کہا جبکہ تارہ اپنا ڈن لکھ چکی تھی۔

"اچھا اب اپنی الجھن بتاؤ، وقت ختم ہو رہا ہے۔" نیمل نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا جس کی ٹک ٹک اب تیز محسوس ہو رہی تھی۔تارہ کا چہرہ اچانک تھوڑا سنجیدہ ہو گیا۔اس نے کیمرے کو بند کیا اور اپنی نوٹ بک پر دوسرا پوائنٹ لکھا۔

"میری الجھن یہ ہے، کیا نظر آنے والا سچ ہمیشہ سچ ہوتا ہے؟" نیمل، سلال اور نوفہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"میری الجھن میری کلاس فیلو جویریہ کے بارے میں ہے۔"

"وہی جو ہمیشہ فرسٹ آتی ہے؟" نیمل نے پوچھا۔وہ اپنے بہن بھائیوں کے کلاس فیلوز کا ڈیٹا رکھتی تھی۔

"ہاں، وہی۔" تارہ نے کیمرے کی سکرین پر ایک تصویر کھولی۔"وہ پوری کلاس میں سب سے زیادہ ہنستی ہے، سب سے زیادہ باتیں کرتی ہے مگر آج جب میں نے لنچ بریک میں دور سے اسے ریکارڈ کیا تو وہ اکیلی بیٹھی تھی۔وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی، صرف خالی آنکھوں سے دیوار کو گھور رہی تھی اور مسلسل اپنے ناخن چبا رہی تھی۔میری الجھن یہ ہے کہ...کوئی اتنا پرفیکٹ کیسے ہو سکتا ہے کہ کلاس میں قدم رکھتے ہی اس کے چہرے سے اداسی کا نام و نشان مٹ جائے؟ وہ کون سا سوئچ دباتی ہے جو اسے ایک دم سے ہنستا مسکراتا بنا دیتا ہے؟"

کمرے میں موجود چاروں ذہن (نامرہ کے علاوہ) ایک لمحے کے لیے رک کر سوچنے لگے۔تارہ کی جاسوسی نظر نے ایک ایسی دراڑ ڈھونڈ لی تھی جو عام آنکھ کو نظر نہیں آتی تھی اور پھر سلال کی آواز سنائی دی۔

"مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس کے بچے اسی طرح پرفیکٹ ہونے کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں تاکہ گھر والوں کو پریشان نہ کریں۔"

ابھی اس فلسفیانہ نکتے پر بات آگے بڑھتی کہ نیچے سے زہرہ بیگم کی آواز کسی توپ کے گولے کی طرح اوپر آئی۔

"اب اگر تم لوگ نیچے نہ آئے تو یہ دونوں ڈائریاں کل صحن میں، جلی ہوئی ملیں گی۔"

"اوہ ہو! امی تو اب بلیک میلنگ پر اتر آئی ہیں۔" سلال نے ہڑبڑا کر اپنی نوٹ بک بند کی۔

تارہ نے جلدی سے وہ ڈائری نامرہ کی طرف سرکائی جو اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر، نیند اور بیداری کی ایک ایسی دھندلی سرحد پر تھی جہاں سے واپسی اسے محال لگ رہی تھی۔ بائیس سالہ نامرہ جو تیسرے نمبر پر تھی یعنی درمیانی اولاد، وہ شبگیر خاندان کی سست ترین روح مانی جاتی تھی۔ گریجویشن کے آخری سال کے بوجھ کو اپنی پلکوں پر لادے بس سونا چاہتی تھی۔ سب کی نظریں اس پر جمی تھیں جو آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ سلال نے ہاتھ بڑھا کر، اپنی درمیانی انگلی کو انگوٹھے کے شکنجے سے آزاد کیا اور ایک بھرپور ٹک کی آواز کے ساتھ نامرہ کے ماتھے پر ضرب لگائی۔ نامرہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ مگر خوبصورت آنکھیں نیم وا ہوئیں۔ اس نے خفگی سے سلال کو دیکھا جس نے سکون سے ڈائری کی جانب اشارہ کیا۔ سلال کے سوا ان چاروں بہنوں کی آنکھیں ایک جیسی تھیں۔ ان کی آنکھیں درمیانے سائز کی اور ہلکی سی لمبوتری تھیں۔ اوپری پلک پر کریز بہت ہلکی تھی، اس لیے آنکھیں عام طور پر بادام کی شکل کی نظر آتی تھیں۔ پتلیاں گہری سیاہ اور آنکھوں کی سفیدی زیادہ نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ آنکھوں کے بیرونی کنارے ہلکے سے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے جس سے چہرے پر نرم مگر مختلف تاثر آتا ہے۔ یہ آنکھیں انہیں اپنی دادی (کمالہ بیگم) سے ملی تھیں جنکا تعلق نیپال سے تھا۔ عرب ٹاؤن کے علاوہ بھی لوگ پہلی نظر میں انہیں اکثر چائنی سمجھ لیتے تھے حالانکہ ان کے چہرے کے باقی خدوخال مقامی تھے۔ سوائے نامرہ کے جو دادی سے زیادہ ملتی تھی۔ کمالہ بیگم کی جینیاتی وراثت ان چاروں بہنوں کی آنکھوں میں آج بھی زندہ تھی۔ نامرہ کے بال کندھوں تک لیئرز میں کٹے ہوئے تھے مگر ماتھے پر آتے ہوئے bangs ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلال کے اٹھانے پر نامرہ نے ایک لمبی جمائی لی، ہڈی کی لمبی آستینوں سے اپنے ہاتھ باہر نکالے، آنکھیں ہتھیلیوں سے مسلیں اور بھاری دل کے ساتھ پین اٹھایا۔

"آج کا ڈن..." اس نے نوٹ بک پر لکھنا شروع کیا، "آج پھر میری کالج میں ثالث سے بحث ہوئی اور میں نے اسے اچھی خاصی سنا دیں۔"

"ثالث بزدار؟" باقی چاروں نے ایک ساتھ حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نام کا وزن کمرے میں موجود پیلی روشنی کو بھی بھاری کر گیا۔

"ہاں، وہی منحوس..." اس نے ایک اور جمائی روکتے ہوئے کہا، "پوری کلاس میں ایک وہی ہے جو مُجھے زہر لگتا ہے۔ اسے خاموش کروا کر اب میں سکون میں ہوں۔"

اس نے اپنا ڈن مکمل کیا مگر جب الجھن (Conflict) والے کالم پر پہنچی تو اس کا پین رک گیا۔ اس کی بھنویں سکڑ گئیں اور صاف چہرے پر ایک واضح پریشانی ابھر آئی۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر لکھا۔

"الجھن یہ ہے کہ...آج اس نے مُجھے پلٹ کر کچھ بھی نہیں کہا۔ کیوں؟"

لکھنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر سلال کی طرف دیکھا جیسے وہ اس خاموشی کا ترجمہ ڈھونڈ رہی ہو۔

بلب کی زرد روشنی میں سلال کے خدوخال بالکل واضح ہوئے۔ وہ اپنی چاروں بہنوں سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں بہنیں اپنی نیپالی آنکھوں اور مقامی رنگت کی وجہ سے پہچانی جاتی تھیں، وہاں سلال کی رنگت گلابی مائل سفید تھی اور اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ اس کی گھنی پلکیں اور نقش و نگار اسے کسی مشرقِ وسطیٰ کے باشندے جیسا روپ دیتے تھے۔ یہ شبگیر خاندان کا وہ پوشیدہ باب تھا جو برسوں پہلے فلسطین سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے ان کے آباؤ اجداد کی یاد دلاتا تھا۔ سلال کے چہرے پر وہی فلسطینی وقار اور نرمی جھلکتی تھی جو اس خاندان کی اصل شناخت تھی۔ نامرہ نے اپنی الجھن بتائی اور دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"ثالث بزدار کی خاموشی؟" نیمل نے دھیرے سے دہرایا۔

"عجیب ہے..." سلال نے دھیمے لہجے میں کہا، "بزدار خاندان کے لوگ خاموشی سے دستبردار ہونے کے عادی تو نہیں ہیں۔" اس کے ذہن میں عالیہ بزدار کا چہرہ گھوما جسے اس نے سر جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔ بزدار خاندان فی الوقت اتنا اہم نہیں تھا۔ ان کے مسائل زیادہ بڑے تھے۔ سلال شبگیر کے لیے یہ صرف ایک ڈیلی لاگ نہیں تھا بلکہ یہ اس کی زندگی کا ایک اہم مقصد تھا۔ وہ اس گول میز کا وہ حصہ تھا جس پر پورے گھر کا بوجھ ٹکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بھوری آنکھوں سے باری باری اپنی چاروں بہنوں کو دیکھا۔ ان کی معصومیت، ان کی الجھنیں اور ان کے خواب...سلال کے لیے یہ سب کسی مقدس امانت سے کم نہیں تھے۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے اپنی نوٹ بک کھولی اور نہایت نفاست سے لکھنا شروع کیا۔ کمرے کا درجہ حرارت جیسے کچھ متوازن ہو گیا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح دھیما مگر پراعتمادی سے بھرپور تھا۔

"میرا ڈن سادہ ہے۔" اس نے نیمل کی طرف دیکھ کر ایک مختصر مسکراہٹ کا تبادلہ کیا، "میڈیکل کا آخری سال شروع ہونے والا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جیسے ہی آخری سال کا آغاز ہو گا، میں اپنی پارٹ ٹائم جاب چھوڑ دوں گا اور پاپا کے ساتھ فیکٹری جایا کروں گا۔ انکا کام بڑھ گیا ہے۔ انہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔"

نامرہ نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا جبکہ تارہ نے فوراً پوچھا۔

"مطلب اب آپ ہمارے لیے ایکسٹرا ٹائم نہیں نکال پائیں گے؟"

سلال نے قلم کی نوک اپنی ڈائری پر ٹھک ٹھکائی اور الجھن والے کالم کی طرف بڑھا۔اس نے الجھن کو کاٹ کر وہاں ڈن لکھا۔آج اسے کوئی الجھن نہیں تھی بلکہ دونوں ڈن تھے۔اسے ایک اہم سوال کا جواب ملا تھا۔

"نہیں تارہ! میرا وقت ہمیشہ تم لوگوں کے لیے ہی رہے گا۔اصل بات وقت کی نہیں بلکہ مقام کی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی ڈائری پر وہ بات لکھی جو کچھ وقت سے اس کے دل میں ایک گرہ کی طرح بندھی تھی۔

"وہی مقام جو آپ کا ہے ہمارے لیے؟ فلسطینی شہزادے کا؟"نوفہ کے سوال پر وہ دھیما سا مسکرایا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں بادشاہ یا شہزادہ نہیں ہوں نوفہ! اور نہ ہی کبھی بننا چاہتا ہوں۔"

پچھلے سال بھی نوفہ نے سلال کے،میڈیکل کے تیسرے سال میں ٹاپ کرنے پر جوش میں آکر کہا تھا۔

"سلال بھائی! آپ تو ہمارے گھر کے اکیلے وارث اور ہمارے لیے کنگ ہیں!"تب سلال الجھ گیا تھا اور اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا مگر آج اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔

"آج میری الجھن دور ہو گئی ہے۔"اس نے اپنی بہنوں کے چہروں پر بکھری پیلی روشنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔"تم سب کو لگتا ہے کہ میں تم لوگوں کا لیڈر یا کنگ ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میرا راستہ مختلف ہے۔"

اس نے اپنی ڈائری پر بڑے حروف میں لکھا۔

"(Queens Maker)"ملکائیں بنانے والا

"میں وہ زمین بنوں گا جس پر کھڑے ہو کر تم چاروں اپنی سلطنتیں بناؤ گی۔تم سب کو عروج تک پہنچانا ہی میرا اصل منصب ہے۔ایک کوئینز میکر کبھی خود تخت پر نہیں بیٹھتا، وہ تخت سجاتا ہے اور تم سب کے لیے تخت میں سجاؤں گا۔"

سلال کے ان الفاظ نے کمرے میں موجود چاروں لڑکیوں کو ایک عجیب سے فخر اور تحفظ کے احساس سے بھر دیا۔اس کی فلسطینی رنگت پر زرد روشنی ایک عجیب سا جلال پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنی بہنوں کے لیے صرف ایک بھائی نہیں تھا، وہ ان کا محافظ، ان کا استاد اور ان کا وہ مضبوط حصار تھا جسے توڑنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

"مُجھے اموشنل ہونا نہیں پسند!" تارہ نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔کمرے کی جذباتی خاموشی عجیب سی لگنے لگی۔

"ہمیں تم پر فخر ہے۔" نیمل نے گہری سانس لیتے سلال کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔وہ اس سے ساڑھے تین سال چھوٹا تھا مگر کبھی چھوٹا نہیں لگا۔ قد میں وہ تو لمبا تھا ہی مگر اسکا ظرف، اسکا حوصلہ اور اس کی سمجھ بوجھ اسے بڑا بناتی تھی۔

سب کے بول چکنے کے بعد اب باری نیمل کی تھی۔ وہ جو اس پانچ رکنی گروہ کی ڈھال تھی۔ایک مضبوط اور ٹھوس گفتگو کرنے والی وکیل۔ نامرہ نے ڈائری نیمل کی جانب کھسکائی۔نیمل نے ایک گہری سانس لی اور اپنی مخصوص قلمی روانی کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔

"آج مُجھے اپنے پہلے ہائی پروفائل کیس میں وہ مسنگ لنک مل گیا ہے جس کی تلاش مہینوں سے تھی۔ یہ ایک اہم لیڈ ہے۔"

اس کے لہجے میں فتح کی چمک تھی مگر جب وہ دوسرے کالم کی طرف بڑھی تو اس کے ہاتھ کی گرفت قلم پر سخت ہو گئی۔اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی الجھن لکھی۔

"شادی میں صرف پندرہ دن باقی ہیں اور میں ابھی تک یہ قبول نہیں کر پا رہی۔"

کمرے میں موجود سارے ذہن جیسے ساکت ہو گئے۔نیمل کا رشتہ اس کے والد (سرمد شبگیر) کے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے سے طے پایا تھا مگر اس وقت اس کے لیے اپنا کیریئر، اپنا خاندان اہم تھا۔ابھی اس نے اپنے کیریئر کا باقاعدہ آغاز کیا تھا اور فوراً ہی شادی جیسا اہم موڑ اس کی زندگی میں آ گیا۔یہ ساڑھے چھبیس سالہ نیمل کے لیے مشکل ترین وقت تھا۔سلال نے اس کی الجھن سمجھتے ہوئے، اس بار اپنا ہاتھ

اس کے ہاتھ پر رکھا۔

"آپ اکیلی نہیں ہیں۔ اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو کوئی زبردستی آپ کو رخصت نہیں کر سکتا۔"

"اگر دل نہیں مانتا تو انکار کر دیں۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔" نامرہ کی نیند بھی اب اڑ چکی تھی۔ جبکہ تارہ اور نوفہ اداس ہو چکی تھیں۔ یوں تو وہ خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں مگر نیمل کو اداس دیکھ کر فی الوقت ان کی خوشی دور جا سوئی تھی۔ وہ یہ سوچنا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بہن رخصت ہو کر کسی دوسرے گھر چلی جائے گی۔

"ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔" نوفہ اور تارہ نے باری باری اپنا ہاتھ سلال کے ہاتھ پر رکھا۔

"معاملہ بگاڑنا ہے تو مُجھے بتائیں...کچھ جگاڑ کر لوں گی۔" آخر میں نامرہ نے اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کے انداز پر سلال نے بس بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ نامرہ سے بعید نہ تھا وہ بنا کچھ سوچے سمجھے قدم اٹھاتی تھی۔

"کتابوں کی ہیروئن کبھی بھی اپنی مرضی کے خلاف نہیں جھکتی اور آپ تو ہماری اصل زندگی کی ہیروئن ہیں۔"

نوفہ نے جھجھکتے ہوئے ایک بڑی بات کہنے کی کوشش کی۔ نیمل نے ہاتھ بڑھا کر اسے ساتھ لگایا۔ اس نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنے بھائی بہنوں کو دیکھا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ اس کے 'کوئینز میکر' بھائی اور بہنوں نے اس کے گرد کتنا مضبوط حصار بنا رکھا تھا۔ جب وہ مسکرائی تو باقی سب کے چہروں پر بھی اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"نیمل...سلال...."

امی کی غصے بھری آواز پر وہ پانچوں بدک کر اٹھے۔

"جلدی بھاگو..." سلال نے فوراً اپنی ڈائری بند کی۔ نیلے رنگ کی ڈائری، جس کی سپائن (Spine) پر چاندی کے رنگ میں ایک بڑا سا D کندہ تھا۔ ڈی فار ڈاکٹر!

اس نے وہ ڈائری پیچھے شیلف کے مخصوص کونے میں رکھی۔ پھر نیمل نے اپنی وہ بڑی، سرخ رنگ کی موٹی ڈائری اٹھائی جس کی سپائن پر سنہری حروف میں N4 لکھا تھا۔ چاروں بہنوں کی ایک ہی ڈائری تھی اور چاروں کا نام کا پہلا حرف N تھا۔

نیمل نے وہ سرخ ڈائری بالکل سلال کی نیلی ڈائری کے ساتھ جوڑ کر رکھ دی۔ اب شیلف میں وہ دونوں ترتیب سے رکھی تھیں۔

N4D

ایک کے بعد ایک وہ پانچوں بہن بھائی کمرے سے باہر نکل گئے۔ نیمل نے آخری بار مڑ کر دیکھا اور لائبریری کا سوئچ آف کر دیا۔ دروازہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ اندھیرے کمرے میں، کھڑکی سے آنے والی گلی کی مدھم روشنی شیلف پر پڑی تو وہ دونوں ڈائریاں ایک عجیب سے سحر کے ساتھ چمکیں۔ نیلے اور سرخ رنگ کے ملاپ اور ان پر لکھے حروف، مستقبل کا ایک نیا کوڈ بنانے والے تھے۔

لوگ کہتے ہیں جادو دو طرح کا ہوتا ہے، اچھا یا برا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ جادو کی کوئی رنگت نہیں ہوتی، اس کا رنگ وہ ارادہ طے کرتا ہے جو اسے استعمال کرتا ہے۔

عرب ٹاؤن کے اس پرسکون گھر میں رہنے والے یہ پانچوں بہن بھائی اپنی چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھے۔ ان کے قہقہے، ان کی لڑائی اور ان کا ایک ساتھ بیٹھ کر خواب دیکھنا ہی وہ اصل طاقت تھی جو انہیں عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ باہر کی دنیا میں ایک برے جادو کی بدصورتی ناچ رہی تھی، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی عام ہتھیار کی نہیں بلکہ ایک طاقتور Spell کی ضرورت تھی۔ اور ابھی... یہ سپیل ادھورا تھا۔ DN4 محض ایک نام نہیں تھا، یہ اس جادو کا آغاز تھا جسے ابھی مکمل ہونا تھا۔ جب تک یہ پانچوں ایک تھے ان کا جادو 'اچھا' تھا مگر ان کا یہ اتحاد جس دن ٹوٹتا، وہ برا طلسم اس گھر کے لیے بھی سب سے بڑا خطرہ بن سکتا تھا۔ سیڑھیوں سے ان کے قدموں کی دھمک جیسے جیسے مدھم ہوئی، شیلف پر موجود حروف کی چمک اور گہری ہو گئی۔ وہ پانچوں نیچے اپنی دادی اور ماں باپ کی آغوش میں محفوظ ہونے جا رہے تھے، اس حقیقت سے بے خبر کہ ان کا یہ 'خفیہ جادو' بہت جلد ایک ایسی جنگ کا ایندھن بننے والا تھا جہاں جیت صرف اس کی ہو گی جس کا DNA سب سے زیادہ مضبوط ہو گا۔

☆☆☆☆☆

بزدار ہسپتال کی اونچی کھڑکیوں سے رات راہداریوں میں اتر آئی تھی جہاں فینائل کی مخصوص بو رچی بسی تھی مگر سرجیکل یونٹ کے نرسنگ اسٹیشن پر آج کی ہوا کچھ زیادہ ہی بوجھل تھی۔ تین ہاؤس جاب ڈاکٹرز اور دو سینئر نرسیں ایک فائل کے پیچھے سر جوڑے کھڑی تھیں مگر ان کی

نظریں لفٹ کے دروازے پر جمی تھیں۔

"تم نے دیکھا آج؟ ڈاکٹر حق گہرے نیلے سوٹ میں آئے ہیں۔" ثنا نے جو ابھی نئی نئی ہاؤس جاب پر آئی تھی، کافی کا سپ لیتے ہوئے خوابناک لہجے میں کہا۔" کیا کمال شخصیت ہے ان کی۔ وہ جب راہداری سے گزرتے ہیں تو لگتا ہے ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔"

" کرش اپنی جگہ ثنا مگر وہ آدمی خطرناک ہے۔" ایک دوسری ڈاکٹر نے اسے ٹوکا۔

"خطرناک کیسے؟" ثناء الجھی۔

"میرا مطلب ہے، وہ غصہ نہیں کرتے، چیختے نہیں ہیں، وہ صرف ایک بار دیکھتے ہیں اور انسان کو اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے۔"

" آج ان کی کوئی سرجری ہے؟" ایک سینئر نرس کی آواز سنائی دی۔

"ایک ایسی سرجری جس میں مریض کی زندگی صرف چند ملی میٹر کے فاصلے پر ہوتی ہے۔ پورے ملک میں کوئی دوسرا سرجن اس کیس کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھا مگر انہوں نے صرف فائل دیکھی اور یس کہہ دیا۔" ڈاکٹر ثناء کو غالباً ساری معلومات تھیں۔

"اسی لیے جونیئر زانہیں ڈاکٹر beast کہتے ہیں۔انہیں لیڈ کرنا آتا ہے۔"

"لیکن وہ ویسے Beast نہیں ہیں جیسا تم سب انہیں سمجھتی ہو۔" ڈاکٹر ثناء نے گہری سانس لی۔

"مطلب؟" سب نے تجسس سے پوچھا۔

"تم لوگوں نے وہ کہانی تو سنی ہوگی، بیوٹی اینڈ دی بیسٹ! وہ شہزادہ جس پر کسی نے جادو کر دیا تھا اور وہ ایک بے رحم، سرد مہر درندہ بن گیا تھا۔ ڈاکٹر حق بھی بالکل ویسے ہی ہیں۔ خیر وہ بے رحم تو نہیں ہیں، وہ بس بات کم کرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی ایسا جادو یا کوئی ایسا صدمہ ہوگا جس نے ان کے جذبات پر برف جما دی ہے۔"

"تو کیا ان کی زندگی میں کوئی بیوٹی نہیں ہے جو اس جادو کو توڑ سکے؟" ایک دوسری ڈاکٹر نے برجستہ پوچھا اور اس سوال پر ڈاکٹر ثناء کا دل خراب ہوا۔

"ان کی 'بیوٹی' ان کے پاس ہے۔ ڈاکٹر حق شادی شدہ ہیں۔ ان کی زندگی کا وہ حصہ جس نے انہیں جکڑ رکھا ہے، وہ انکا تین سالہ بیٹا ہے۔ ڈاکٹر حق کے لیے ان کا خاندان، ان کا بیٹا اور ان کا کام ہی سب کچھ ہے۔ باقی کسی کی جگہ نہیں بچتی۔" ڈاکٹر صوفیہ کے جواب پر باقی سب نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ البتہ ڈاکٹر ثناء کو انکا شادی شدہ ہونا خاص پسند نہیں تھا۔ ابھی ان کی سرگوشیاں عروج پر تھیں کہ اچانک لفٹ کے اوپر لگی لائٹ سرخ سے سبز ہوئی اور ایک مخصوص 'ٹنگ' کی آواز آئی۔ پوری راہداری میں جیسے وقت تھم گیا۔ نرسنگ اسٹیشن پر موجود لڑکیاں چوکنا ہو گئیں۔ لفٹ کے دروازے کھلے۔ سب سے پہلے دو سینیئر اسسٹنٹس باہر نکلے، اور ان کے پیچھے وہ نمودار ہوا۔ ڈاکٹر حق بزدار! گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے اور ہاتھ میں ایک فائل تھامے وہ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک ٹھہراؤ اور وقار تھا۔ اس کے پیچھے چار پانچ ڈاکٹرز کی پوری ایک ٹیم تھی جو اس کی رفتار کے ساتھ قدم ملانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ حق نے چلتے ہوئے ایک بار بھی گردن موڑ کر دائیں بائیں نہیں دیکھا۔ جیسے ہی وہ نرسنگ اسٹیشن کے قریب سے گزرا، وہاں کھڑی ڈاکٹرز اور نرسیں ایسے غائب ہوئیں جیسے وہ کبھی وہاں تھیں ہی نہیں۔ صرف ڈیوٹی پر موجود نرس رہ گئی تھی۔ وہاں صرف ڈاکٹرز کے جوتوں کی فرش پر پڑنے والی ٹپ ٹپ گونج رہی تھی۔
حق کے گزرتے ہی ایک اسسٹنٹ نے کر وہاں کھڑی نرس کو حکم دیا۔

"ڈاکٹر حق کے لیے بلیک کافی اور مریض کی تازہ ترین ای سی جی رپورٹ پانچ منٹ میں ان کے آفس ہونی چاہیے۔ جلدی کرو!" نرس نے تائید میں سر ہلایا۔

اور پھر ایک گھنٹے بعد وی آئی پی بلاک کا آپریشن تھیٹر نمبر چار اس وقت ایک منجمد خاموشی کی لپیٹ میں تھا۔ فضا میں جراثیم کش ادویات کی مخصوص بو اور ایئر کنڈیشنر کی ہلکی سی سائیں سائیں گونج رہی تھی۔ مانیٹر پر چلتی دل کی دھڑکن کی بیپ بیپ کسی گھڑیال کی ٹک ٹک کی طرح اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ میز پر ایک ساٹھ سالہ مریض بے سدھ پڑا تھا جس کا سینہ چیرا جا چکا تھا۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ ٹرپل ویسل بائی پاس سرجری تھی۔ خون کی باریک نالیوں کو جوڑنے کا وہ نازک مرحلہ جس میں بال برابر غلطی بھی موت کا پروانہ بن سکتی تھی۔ ڈاکٹر حق سرجیکل گاؤن اور ماسک پہنے، میگنی فائنگ گلاسز (Loupes) لگائے مائیکرواسکوپ درستگی کے ساتھ ٹانکے لگا رہا تھا۔ اس کے لمبے، مضبوط ہاتھ ماہر کی طرح چل رہے تھے۔ اس کی پوری دنیا اس وقت اس پانچ انچ کے کٹ میں سمٹی ہوئی تھی۔ اچانک، اس کے کانوں میں مانیٹر کی آواز مدھم ہوئی اور ایک دوسری آواز گونجی۔ ایک ایسی آواز جو ماضی کے کسی بند کمرے سے نکل کر آئی تھی۔

"حق مجھے خلع چاہیے۔"

حق کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے رکیں۔اس نے پلکیں جھپکائیں جیسے کسی بھنبھناتی مکھی کو اڑانا چاہ رہا ہو۔

"مُجھے طلاق دے دو حق بزدار!"

یہ جملہ کسی دھماکے کی طرح اس کے دماغ کے بند خلیوں سے ٹکرایا۔وہ ہاتھ جو دل کی دھڑکتی رگوں کو سدھانے کے عادی تھے،اچانک لرزنے لگے۔اس کی گرفت سرجیکل فورسپس پر ڈھیلی پڑی۔ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھریں اور اس کے چشمے کے کناروں سے ہوتی ہوئی ماسک میں جذب ہونے لگیں۔

منظر بدلنے لگا۔آپریشن تھیٹر کی سفید دیواریں دھندلانے لگیں۔اسے ہسپتال کی لائٹس کے پیچھے ایک عالیشان کمرہ نظر آنے لگا۔

"مُجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا امام! مُجھے طلاق چاہیے۔"

ایک عورت کی چیخ،جو اس کے لاشعور میں پیوست تھی۔ایک بدحواس عورت جو اپنے شوہر کے سامنے کھڑی زندگی کی آزادی مانگ رہی تھی۔پھر منظر بدلہ وہی عورت مگر اب اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

حق نے زور سے آنکھیں بند کیں مگر اندھیرے میں اسے میز پر پڑا مریض کا خون،فرش پر پھیلے ہوئے اس ڈھیر سارے خون میں بدلتا محسوس ہوا جو اس نے سالوں پہلے دیکھا تھا۔وہی لیس دار،سرخ اور گرم خون...جس نے اس کا بہت کچھ نگل لیا تھا۔
اس کا سر گھومنے لگا۔سب کچھ دھندلا گیا۔سانس جیسے اکھڑنے لگا۔

"ڈاکٹر حق؟ آر یو او کے؟" ساتھ کھڑے اسسٹنٹ سرجن نے تشویش سے اس کا کندھا چھوا۔"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی،کیا میں ہینڈ اوور (Handover) لے لوں؟ آپ باہر جا کر تھوڑا ریسٹ کریں۔"

حق کا سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ بزدار ہسپتال میں اسے Dr Beast کہا جاتا تھا۔ یہ نام اسے نرسنگ اسٹاف نے دیا تھا۔ اور اس وقت اس کے اندر کا بیسٹ اور اس کے اندر کا وہ زخمی بچہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اسسٹنٹ کی آواز نے اسے حال کی زمین پر پٹخ دیا۔ اس نے ایک لمبی، گہری سانس لی۔ پھر جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔ اس نے اپنی بند مٹھیوں کو بھینچ کر کپکپاہٹ کو زبردستی روکا۔

"کلیمپ (Clamp) پکڑو..." اس کی آواز کھردری ہوئی۔

اس نے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ حق بزدار نے آج تک کوئی آپریشن ادھورا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا ریکارڈ ایک ایسی دستاویز تھی جس پر ناکامی کا کوئی داغ نہیں تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے وہ خون آلود ماضی جھٹکا اور دوبارہ مریض کے کھلے ہوئے سینے پر جھک گیا۔ زخم ابھی کھلا تھا اور حق جانتا تھا کہ جب تک وہ اس دل کو دوبارہ دھڑکنے کے قابل نہیں بنا لیتا، وہ خود بھی سکون کی سانس نہیں لے سکے گا۔ اس کی انگلیاں دوبارہ حرکت میں آئیں۔ وہی درستگی اور وہی مہارت جو اس کی پہچان تھی۔

☆☆☆☆☆

شبگیر ہاؤس کی ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت روایتی گھرانوں والی وہ مخصوص گہما گہمی تھی جہاں سالن کی خوشبو اور برتنوں کی کھٹ پٹ کے درمیان خاموش جنگیں بھی لڑی جاتی تھیں اور معاہدے بھی طے پاتے تھے۔ یوں تو 54 سالہ سرمد شبگیر صاحب، نرم دل اور خوش گفتار انسان تھے۔ مگر اس وقت نوالہ توڑتے ہوئے اچانک رک گئے۔ ان کی نظریں میز کے ایک کونے پر لگی خالی کرسی پر جم گئیں۔

"وہ نواب زادے کہاں ہیں؟" ان کے لہجے میں چھپا طنز اتنا واضح تھا کہ میز پر موجود ہر شخص نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ روک لیا۔ سقراط کی کرسی جو اکثر ہی خالی رہتی تھی اس وقت سرمد صاحب کے غصے کا ایندھن بن رہی تھی۔

"چاچو نے فون کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے رات کو لیٹ گھر آئیں گے۔" سلال نے لقمہ نگلتے ہی فوراً صفائی پیش کی۔ یوں تو وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا مگر اپنے چچا کا وکیل بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

"ہنہہ! یہ اس کا روز کا کام ہے۔" سرمد صاحب کے ماتھے پر تیوری چڑھی۔ دونوں بھائیوں کے درمیان برسوں کی ذہنی دوری اس ایک جملے میں عیاں تھی۔ دادی کا چہرہ سپاٹ ہو گیا، وہ اپنے دونوں بیٹوں کی اس سرد جنگ سے بخوبی واقف تھیں۔ ابھی سلال جواب دینے کے لیے

لب کھول ہی رہا تھا کہ اچانک ڈائننگ ہال کے کونے میں موجود بڑے سے لکڑی کے اسٹینڈ پر بیٹھے 'چغلی خان' نے اپنے گہرے سبز پر پھڑپھڑائے اور اپنی لمبی گردن ٹیڑھی کر کے زوردار آواز میں بولا۔

"جھوٹا! سلال... جھوٹا!"

طوطے کی اس اچانک آواز پر سلال کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ تارہ اور نوفہ نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی جبکہ سرمد صاحب کی نظریں مزید تیکھی ہو گئیں۔

"دیکھا؟ اب تو یہ پرندہ بھی تمہاری وکالت کی پول کھولنے لگا ہے۔" سرمد صاحب نے تمسخرانہ انداز میں سلال کو دیکھا۔

"پاپا! آپ اس چغلی خان کی باتوں میں نہ آئیں، اسے سکھایا ہی کسی نے غلط ہے۔"
سلال نے غصے سے چغلی خان کو گھورا جواب اپنے پنجے سے انگور کا دانہ پکڑ کر بڑے فخر سے سلال کو آنکھیں دکھا رہا تھا حالانکہ اسکا مالک سلال ہی تھا مگر دونوں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔ سلال نے جب اسے خریدا تھا تب وہ ایک بیمار سا پرندہ تھا مگر اب وہ پورے گھر کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا۔ وہ کوئی عام طوطا نہیں تھا بلکہ ایک خاصا توانا اور رعب دار نیپالی رِنگ نیک (Ringneck) طوطا تھا، جس کا سبز رنگ اتنا گہرا تھا جیسے جنگل کی ہریالی اس کے پروں میں اتر آئی ہو۔ اس کی سب سے خاص بات اس کی غیر معمولی لمبی اور نوکیلی دم تھی جو وہ بڑے فخر سے لہراتا پھرتا تھا۔ اس کی گردن کے گرد ایک واضح کالی اور گلابی لکیر تھی اس کی آنکھیں چھوٹی مگر نہایت ذہین تھیں، جن میں ہر وقت شرارت ناچتی رہتی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ چغلی خان کسی پنجرے کی قید میں نہیں رہتا تھا۔ اسے قید سے نفرت تھی۔ وہ پورے گھر میں ایک آزاد شہری کی طرح اڑتا پھرتا تھا۔ کبھی وہ کچن کی الماری کے اوپر بیٹھ کر زہرہ بیگم کی روٹیاں گنتا تو کبھی سرمد صاحب کے کندھے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کی اداکاری کرتا۔ وہ شبگیر خاندان کا فرد بن چکا تھا اس لیے سلال نے اسکا نام مٹھو سے چغلی خان رکھ دیا تھا.
زہرہ بیگم ابھی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ سلال پھر بول اٹھا، "نہیں پاپا! چاچو نے واقعی دن میں ہی بتا دیا تھا کہ انہیں ضروری کام ہے۔"

سرمد صاحب نے تیکھی نظروں سے اپنے تئیس سالہ بیٹے کو دیکھا۔ "تمہیں اس کا چمچہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔"
سلال کچھ کہنا چاہتا تھا مگر برابر بیٹھی نیمل نے میز کے نیچے سے اس کا پیر دبایا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"وہ فرنیچر کا کیا بنا؟ کب تک مکمل ہو جائے گا؟" زہرہ بیگم نے مہارت سے موضوع بدلا۔ وہ جانتی تھیں کہ نیمل کی شادی کا ذکر ہی سرمد

صاحب کے پارہ کو نیچے لا سکتا ہے۔

" کہہ رہے تھے ایک ہفتے تک تیار ہو جائے گا۔" سرمد صاحب کی آواز نرم پڑی، گویا گھر کا بڑا مرد اپنی ذمہ داریوں کے ذکر سے مطمئن ہو گیا ہو۔

کھانا دوبارہ خاموشی سے شروع ہوا مگر میز کے دوسری جانب ایک الگ ہی آپریشن چل رہا تھا۔ تارہ نے جو اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی تھی، نہایت چالاکی سے سرمد صاحب کے بازو پر انگلی سے دستک دی اور اپنا وہ چھوٹا سا جادوئی کیمرہ ان کی پلیٹ کے قریب کر دیا۔ سرمد صاحب نے چونک کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں ان کی اپنی ویڈیو چل رہی تھی جس میں وہ کہہ رہے تھے کہ گروسری اور دوسرا ضروری سامان فیکٹری میں رہ گیا تھا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اپنی پندرہ سالہ جاسوس بیٹی کو دیکھا جس نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی۔

"پاپا جی! یہ ویڈیو گواہی دے رہی ہے کہ آپ نے امی سے جھوٹا بولا ہے۔ آپ سامان لانا بھول گئے ہیں۔ اگر میں ابھی یہ امی کو بتا دوں تو؟" تارہ نے سرگوشی کی مگر اس کی آواز میں شرارت کا طوفان تھا۔

سرمد صاحب گڑبڑا گئے۔ انہوں نے فوراً پانی کا گلاس اٹھایا تاکہ اپنی بدحواسی چھپا سکیں۔

"اب تم ایسا کرو گی؟ اپنے باپ کو بلیک میل کرو گی؟" وہ اب ایک سخت گیر بڑے بھائی نہیں بلکہ ایک ایسے شوہر تھے جسے اپنی بیگم کی عدالت کا خوف ستا رہا تھا۔
تارہ نے صرف کندھے اچکائے۔ یعنی وہ کر رہی تھی۔ بیٹی، باپ کو بلیک میل نہ کرے ہو نہیں ہو سکتا۔

"بتاؤ کیا چاہیے؟" بالآخر سرمد صاحب نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کی آوازیں دھیمی تھیں۔

"بتا دوں گی اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے فاتحانہ انداز میں نوالہ منہ میں رکھا۔

"تم اپنی امی کو نہیں بتاؤ گی۔" سرمد صاحب نے رازداری سے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ چاچو کو کچھ نہیں کہیں گے۔"

"یہ جو تم چاچو کی طرف داری کر رہی ہو کیا وہ تمہیں باپ سے زیادہ عزیز ہے؟"

تارہ نے ایک بار پھر کندھے اچکائے۔"پاپا اپنی جگہ، چاچو اپنی جگہ...اور چاچو ہم سب کو بہت عزیز ہیں۔"اس نے میز کی دوسری جانب بیٹھے اپنے باقی چار بہن بھائیوں کی طرف اشارہ کیا جو بظاہر کھانا کھا رہے تھے مگر ان کے کان اسی کھسر پھسر پر لگے تھے۔

"بھئی چاہتے کیا ہو تم لوگ؟"اس بار سرمد صاحب نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔

"آج کے بعد آپ چاچو کو کچھ نہیں کہیں گے۔آپ کی ڈانٹ کی وجہ سے وہ گھر دیر سے آتے ہیں یا نہیں آتے۔"

"یہ ناممکن ہے..."ان کے چہرے کے تاثرات سخت ہوئے۔

"اوکے آپ کی مرضی !امی..."اس نے امی پر زور دے کر اونچی آواز میں کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے! خاموش رہو۔"سرمد صاحب فوراً مان گئے۔زہرہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔" کیا ہوا؟"

" کچھ نہیں، وہ... پانی چاہیے تھا۔"سرمد صاحب نے بوکھلاہٹ میں نوفہ کے سامنے سے گلاس اٹھایا اور تارہ کو پکڑایا۔تارہ نے پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے،سلال کی جانب اشارہ کیا۔

Mission Successful!

جیسے ہی سرمد صاحب نے مصلحت پسندی کے تحت ہامی بھری چغلی خان نے ایک بار پھر اپنی لمبی پونچھ لہرائی اور پورے ڈائننگ ہال میں اپنی آواز گونجائی۔

"پاپا ڈر گئے... پاپا ڈر گئے!"

چغلی خان بھی حد کر دیتا تھا۔اس کے بیان پر جہاں سرمد صاحب بوکھلائے تھے وہیں پانچوں بہن بھائی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔سلال نے ایک گہری اور سکون کی سانس لی۔اس نے میز کے نیچے چھپ کر اپنا فون نکالا اور واٹس ایپ پر ایک میسج ٹائپ کیا۔

"چاچو آپ کہاں ہیں؟زیادہ لیٹ مت آئیے گا ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔"

چند ہی لمحوں میں اسکرین روشن ہوئی۔"چولہے میں جائیں نتائج!"

سلال نے مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔

" کیسا عجیب وقت آ گیا ہے،اب تیئس سالہ بھتیجا اپنے تینتیس چونتیس سالہ چاچو کو گھر جلدی آنے کی نصیحتیں کر رہا ہے۔"اس نے دوبارہ میسج ٹائپ کر کے بھیجا مگر سقراط شبگیر آف لائن ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔قادری کالج کی ایڈمنسٹریشن بلاک میں سناٹا تھا بس کہیں کہیں ٹیوب لائٹس کی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔راہداری میں صفائی کرنے والا عملہ جا چکا تھا اور فضا میں فینائل کی ہلکی سی بو رچی ہوئی تھی۔تب اچانک مرکزی دروازے سے ایک وجود اندر داخل ہوا۔اونچا قد،مضبوط کندھے۔اس نے خاکی رنگ کی ایک جیکٹ پہن رکھی تھی اور پیروں میں بھاری بوٹ تھے جن کی دھمک خاموش فرش پر واضح سنائی دے رہی تھی۔اس کے بال گردن تک لمبے تھے جنہیں اس نے لاپرواہی سے سمیٹ کر سر کے اوپری حصے میں ایک 'ہاف بن' (Half-bun) کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔چہرہ سخت تھا،جیسے پتھر پر لکیریں کھدی ہوں۔آنکھیں بالکل سلال جیسی تھیں،وہی چمک وہی شکل مگر فرق یہ تھا کہ سلال شبگیر کی آنکھوں میں ذہانت تھی اور اس شخص کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی آگ۔یہ سقراط شبگیر تھا۔۔وہ سیدھا چلتا ہوا 'ڈائریکٹر اسپورٹس' کے آفس کی طرف بڑھا۔کاؤنٹر پر بیٹھی ریسپشنسٹ لڑکی اپنا بیگ کندھے پر ڈال چکی تھی اور جانے کے لیے تیار تھی۔اس نے ایک اجنبی کو اتنی بے باکی سے اندر جاتے دیکھا تو فوراً آگے بڑھی۔

"ایکسکیوز می سر!آفس ٹائم ختم ہو چکا ہے،آپ اندر نہیں جا سکتے..."

سقراط نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس کے قدموں کی رفتار میں ذرا سی بھی کمی نہیں آئی۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پھر سے پکارا۔

"ہیلو! میں آپ سے بات کر رہی ہوں..."

سقراط رکا نہیں۔ وہ سیدھا شیشے کے دروازے تک پہنچا جس پر "پروفیسر قادری" کی تختی لگی تھی اور بغیر دستک دیے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر پروفیسر قادری اپنی کرسی پر بیٹھے کوٹ پہن رہے تھے، شاید وہ بھی نکلنے ہی والے تھے۔ دروازہ کھلنے پر وہ چونکے۔

" کون ہے بھئی...؟" ان کی نظر سامنے کھڑے شخص پر پڑی تو زبان حلق میں اٹک گئی۔ وہ سقراط کو پہچانتے تھے۔ دس سال پہلے کا وہ واقعہ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔
سقراط نے سکون سے پیچھے مڑ کر دروازے کو لاک کیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے قریب آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پرانی ہاکی تھی جس کے ہینڈل پر کالی ٹیپ لپٹی ہوئی تھی۔

"تم...؟" قادری نے عینک درست کی، ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ سیکیورٹی..." انہوں نے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا۔

"ہاتھ وہیں رکھیں قادری صاحب!" سقراط کی آواز بھاری اور سپاٹ تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اپنی ہاکی میز پر رکھ دی۔ بہت آرام سے، جیسے کانچ کا گلاس رکھا جاتا ہے۔ ہاکی کا نچلا حصہ قادری کی فائلوں کو دبا رہا تھا۔

"میری سی وی پچھلے چار دن سے آپ کی میز پر دھکے کھا رہی ہے۔" سقراط نے میز کے کونے پر پڑے کاغذات کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔ "وجہ کیا ہے؟"

"دیکھو سقراط..." قادری نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ ہم کسی... کسی سابقہ مجرم کو کوچ نہیں رکھ سکتے۔ اور ویسے بھی تمہارا... تمہارا ریکارڈ..."

"میرے ریکارڈ کو تو رہنے ہی دیں۔" سقراط نے بات کاٹی۔ وہ میز پر جھکا، اس کی آنکھوں میں وحشت جاگ رہی تھی۔ "اگلے مہینے انٹر کالج

ٹورنامنٹ ہے۔ پہلا میچ کس سے ہے؟ بزدار کالج سے۔"

بزدار کالج کا نام سن کر قادری خاموش ہو گئے۔

"اقبال بزدار نے اپنی ٹیم پر کروڑوں لگائے ہیں۔ ان کے کھلاڑیوں کو ٹریننگ دینے کے لیے غیر ملکی کوچز ہیں۔ آپ کے یہ 'پپو' بچے ان کے سامنے پانچ منٹ نہیں ٹک پائیں گے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے قادری صاحب۔ بزدار کی ٹیم ایک وحشی جانور ہے اور اسے قابو کرنے کے لیے آپ کو مجھ جیسا شکاری چاہیے۔"

"لیکن بورڈ نہیں مانے گا،" قادری نے کمزور لہجے میں کہا۔ "ہم رسک نہیں لے سکتے۔ تم جاؤ یہاں سے۔"

سقراط سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے میز پر رکھی ہاکی اٹھائی اور اسے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہلکا سا پٹخا۔

"رسک تو آپ لے چکے ہیں مُجھے انکار کر کے۔"

وہ قادری کی کرسی کے بالکل قریب آ کر میز پر بیٹھ گیا۔ قادری سہم کر پیچھے کو ہوئے۔ سقراط نے ہاکی کا مڑا ہوا حصہ قادری کی گردن کے پاس کرسی کی پشت پر ٹکایا۔

"دو راستے ہیں آپ کے پاس۔ یا تو چپ چاپ مُجھے کل سے کوچ اپائنٹ کر لیں اور بزدار کالج کو ہرانے کی تیاری کریں۔" اس کا لہجہ اب سرگوشی جیسا دھیما مگر خوفناک تھا۔ "یا پھر... میں یہ ہاکی یہیں آپ کی پسلیوں پر توڑ کر جاؤں گا۔ ہسپتال کا خرچہ کالج والے اٹھا ہی لیں گے۔"

قادری کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جانتے تھے کہ سقراط صرف دھمکی نہیں دے رہا۔

"تم... تم زبردستی کر رہے ہو،" قادری کی آواز کانپ اٹھی۔

"ہاں، کر رہا ہوں۔" سقراط نے سیدھا اعتراف کیا۔" کیونکہ مُجھے یہ نوکری چاہیے۔ ہر حال میں۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر قادری کے سامنے پھینکا۔ یہ جوائننگ لیٹر تھا جو اس نے خود بنوایا تھا۔ قادری صاحب نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور اوپر ہونے میں لگے کیمرہ کو دیکھا۔

"میں اس پہ سائن ہرگز نہیں کروں گا اور...اور...کیمرہ کی آنکھ سب دیکھ ہی ہے۔ تم مُجھے ڈرا دھمکا نہیں سکتے۔" انہوں نے اپنے خوف پر قدرے قابو پاتے کہا اور اپنی میز پر رکھے پیپر ویٹ کو سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ان کے سامنے کھڑا شخص کوئی عام امیدوار نہیں تھا بلکہ ایک ایسا ماضی تھا جسے یہ ادارہ دفن کر چکا تھا۔ سقراط غور سے انہیں دیکھتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔

"تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں؟ یا یہ کالج بھول گیا ہے کہ تم کون ہو؟"

"میں کچھ نہیں بھولا قادری صاحب!" سقراط کی آواز بھاری اور کھردری تھی۔ "اور نہ ہی مُجھے بھولنے دیا گیا ہے۔ دس سال...تین ہزار چھ سو پچاس دن۔ ایک ایک دن مُجھے یاد ہے۔"

"تو پھر تم جانتے ہو کہ تم یہاں نہیں ہو سکتے۔" اس بار قادری نے حقارت سے منہ موڑا۔ وہ شاید سقراط کی نرمی کو کمزوری سمجھ رہا تھا۔

"ہم ایک تعلیمی ادارہ چلاتے ہیں، کوئی اصلاحی مرکز نہیں۔ جس شخص پر اپنی ہی ہونے والی سسٹر ان لاء کے ریپ (Rape) کا الزام ثابت ہو چکا ہو، جو جیل کی ہوا کھا کر آیا ہو...اسے میں تعلیمی ادارے میں کوچ بنا دوں؟"

سقراط کے چہرے کے پٹھے تن گئے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سایہ لہرایا۔
شاید درد کا، شاید نفرت کا۔

"الزام ثابت ہوا تھا، گناہ نہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔" لیکن خیر...اب اس بات کا کیا فائدہ؟ عدالت نے مہر لگا دی، معاشرے نے تھوک دیا اور آپ جیسے معزز لوگوں نے دروازے بند کر لیے۔ میں صفائی دینے نہیں آیا۔"

"تو پھر کیوں آئے ہو؟" قادری چیخے۔"دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس بلالوں گا!" شاید اسے لگ رہا تھا کہ سقراط اسے کچھ نہیں کرے گا۔وہ خالی دھمکانے آیا تھا جبکہ سقراط ہنسا۔ایک خشک، بے جان ہنسی۔

"پولیس بلائیں شوق سے بلائیں۔مگر جب تک وہ آئیں گے، تب تک ہم کچھ ضروری باتیں کر لیتے ہیں۔" سقراط نے مزید آگے کی طرف جھکتے ہوئے قادری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"مجھے یہ نوکری چاہیے۔مجھے کوچ بننا ہے۔اور آپ کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔"

"میرے پاس ہزار آپشنز ہیں۔مم...میں کالج بند کر دوں گا مگر ایک ریپسٹ کو گراؤنڈ میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔"

"ضمیر..." سقراط نے اس لفظ کو چبایا۔"بڑی مہنگی چیز ہے قادری صاحب۔سنبھال کر رکھیں۔کہیں ٹوٹ نہ جائے۔" اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی، قادری صاحب کے میز پر پڑا لائٹر اٹھا کر ایک سگریٹ سلگایا اور دھواں ان کے چہرے پر چھوڑا۔قادری بے ساختہ کھانسنے لگے۔

"ویسے آپ کی بیٹی...کیا نام ہے اس کا؟ ماہم؟" اس بار سقراط نے اطمینان سے پوچھا۔قادری کا کھانسنا رک گیا۔کمرے میں اچانک موت جیسا سناٹا چھا گیا۔ان کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

"تم...تم میری بیٹی کا نام کیسے جانتے ہو؟"

سقراط نے سگریٹ کی راکھ میز پر رکھی فائل پر جھاڑی۔

"بڑی پیاری بچی ہے۔یونیورسٹی جاتی ہے۔تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔صبح آٹھ بجے آتی ہے، دوپہر دو بجے چھٹی ہوتی ہے۔اکثر لائبریری کے پیچھے والے لان میں بیٹھتی ہے۔"

سقراط کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا مگر اس میں چھپی دھمکی کسی تیز دھار خنجر کی طرح قادری کے سینے میں اتر گئی۔

"خبردار اگر تم نے اس کا نام بھی لیا تو!" قادری نے اپنی سیٹ سے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر سقراط نے دھکا مار کر واپس گرا دیا۔

"قادری صاحب...آپ جانتے ہیں نا میں کون ہوں؟ ایک مجرم۔ایک درندہ۔ایک ریپسٹ۔جیل میں دو سال گزارے ہیں میں نے خطرناک قیدیوں کے درمیان۔مجھے عزت، آبرو، شرافت...ان الفاظ کے معنی بھول چکے ہیں۔"

اس نے اپنا ہاتھ قادری کے کاندھے پر رکھا اور دباؤ بڑھایا۔

"وہ فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ جلیل یاد ہے؟ جسے آپ نے حال ہی میں نکالا ہے؟ سنا ہے وہ آپ سے سخت ناراض ہے۔کچھ بھی کر سکتا ہے۔آپ کی بیٹی جوان ہے، خوبصورت ہے۔اور یونیورسٹی کے گراؤنڈز بہت بڑے ہیں، دیواریں بہت اونچی ہیں۔میں تو ویسے بھی بدنام ہوں، لیکن آپ...آپ کیا کریں گے؟ کیا آپ ہر وقت اس کا پہرہ دیں گے؟"

اور بس قادری کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ان کی آنکھوں میں خوف کے سائے ناچنے لگے۔ایک باپ کی تڑپ نے ڈائریکٹر کے اصولوں کو کچل دیا تھا۔

"تم...تم..." قادری کی آواز رندھ گئی تھی۔

"میں ضرورت مند ہوں۔" سقراط نے اپائنٹمنٹ لیٹر ان کے سامنے کیا۔آفس کے دروازے پر اب زوردار دستک ہو رہی تھی۔ریسپشنسٹ شاید سیکورٹی بلا لائی تھی۔وہ کسی بھی پل دروازہ توڑ سکتے تھے۔

"سائن کریں۔آپ کی بیٹی کی حفاظت کی قسم کھاتا ہوں، اسے کوئی میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا بشرطیکہ میں اس گراؤنڈ کا کوچ ہوں۔"

قادری کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔انہوں نے قلم اٹھایا۔ان کا ضمیر چیخ رہا تھا مگر سامنے بیٹھے شخص کی وحشت نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے اس اپائنٹمنٹ لیٹر پر دستخط کر دیے۔سقراط نے فوراً کاغذ اٹھایا، پھر اس پر اسٹیمپ لگائی اور اسے تہہ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔

"شکریہ۔"

وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دستک زور و شور سے جاری تھی۔ قادری نے اپنی بے بسی پر قابو پایا اور اس جاتے ہوئے شخص کی پشت کو دیکھا۔ ان کے دل میں شدید نفرت اور دکھ تھا۔

"سقراط!" قادری نے اسے پیچھے سے پکارا۔ سقراط کا دروازے کے ہینڈل پر رکھا ہاتھ رکھ کر رک گیا۔

"ایک وہ سقراط تھا، یونان کا..." قادری کی آواز میں شکستگی تھی۔ "جس نے سچ کے لیے زہر کا پیالہ پی لیا تھا مگر اپنے اصولوں سے نہیں ہٹا۔ اور ایک تم ہو... جس نے جھوٹ اور گندگی کے لیے اپنی انسانیت بیچ دی۔ تم سقراط نہیں ہو سکتے۔"

سقراط نے دروازے کا ہینڈل چھوڑا۔ لیکن وہ مڑا نہیں۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں پروفیسر صاحب!" اس کی آواز بس سنائی دی۔ دھڑ... دھڑ... دھڑ... دروازہ ٹوٹنے کے قریب تھا۔

"اس سقراط نے زہر پی لیا تھا تاکہ سچ زندہ رہے۔ وہ عظیم تھا۔ مگر میں... میں نے دیکھا کہ سچ بولنے سے صرف موت ملتی ہے، انصاف نہیں۔" وہ جیسے سانس لینے کو رکا۔

"وہ سقراط زہر پی کر مر گیا تھا مگر یہ سقراط خود زہر ہے!" اس نے اپنی جیکٹ کا کالر درست کیا۔

"کل صبح ملتے ہیں۔ آپ کے پیو بچے گراؤنڈ میں ہونے چاہئیں!" اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دو سیکورٹی گارڈ اسے دھکیل کر اندر داخل ہوئے۔ سقراط نے ہا کی سیدھی کر لی۔

"اگر کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو اپنی ٹوٹی پسلیوں کا ذمہ دار خود ہو گا۔"

"میں ٹھیک ہوں۔اسے جانے دو۔" قادری نے شرٹ کے اوپری دو بٹن کھولتے گارڈز کو حکم دیا۔سقراط باہر نکل گیا۔دروازہ بند ہوا تو قادری کو لگا جیسے کمرے میں آکسیجن کم ہوگئی ہو۔وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔گارڈز اب ان کی جانب بڑھ چکے تھے جبکہ باہر راہداری میں سقراط کے بھاری بوٹوں کی آواز دور تک گونجتی رہی۔

☆☆☆☆☆

شہر کے سب سے پوش علاقے کی خاموش سڑکوں پر چلتے ہوئے جہاں درختوں کی قطاریں آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتی تھیں، وہاں دور سے بزدار پیلس کا دیوہیکل گیٹ نظر آجاتا تھا۔یہ محض ایک گھر نہیں تھا بلکہ ایک ایسی عمارت تھی جسے دیکھ کر راہگیروں کی رفتار خود بخود سست پڑ جاتی تھی۔باہر سے اس کی بلند و بالا دیواریں سینڈ اسٹون کے مضبوط، گرم مٹیالے پتھر سے تراشی گئی تھیں۔سورج کی روشنی پڑتی تو وہ دیواریں ہلکی سنہری مٹی کی طرح دمکنے لگتی تھیں اور شام ڈھلتے ہی ان پر ایک گہری سنجیدگی اتر آتی تھی۔اس قدرتی پتھر کی شان کو مزید نمایاں کرتا تھا اس کا میٹ بلیک آہنی گیٹ! بھاری، بلند اور اتنا وسیع کہ بیک وقت کئی گاڑیاں اس کے اندر داخل ہوسکتی تھیں۔گیٹ کی سیاہی اور دیواروں کے سینڈ اسٹون رنگ کے درمیان ایسا تضاد تھا جو اس عمارت کو عام حویلیوں سے بالکل مختلف بناتا تھا۔گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی کشادہ راستہ دونوں اطراف لگے قدآور درختوں اور تراشیدہ سبزہ زار کے درمیان سے گزرتا ہوا دو مرکزی عمارتوں تک پہنچتا تھا۔عمارتوں کے بلند دروازے گہرے اخروٹی رنگ کی مضبوط لکڑی سے بنے تھے۔ایسے دروازے جو وقت کے ساتھ مزید سنجیدہ اور باوقار دکھائی دینے لگتے ہیں۔یہ پیلس اپنی ساخت میں پورے شہر سے الگ تھا۔اس کی انفرادیت اس کی وہ عجیب مگر منظّم تعمیر تھی جو امجد بزدار کی زندگی کی دو بڑی حقیقتوں کی عکاس تھی۔ایک وسیع و عریض احاطے میں دو بالکل ایک جیسی، فلک بوس عمارتیں ایک ساتھ کھڑی تھیں۔پہلی عمارت امجد بزدار کی پہلی بیوی کے لیے تعمیر کی گئی تھی اور جب دوسری شادی ہوئی تو اس کے بالکل برابر میں، اسی شان و شوکت کے ساتھ دوسری عمارت کھڑی کردی گئی۔بظاہر یہ دو الگ الگ محل تھے لیکن انہیں جوڑنے کے لیے درمیان میں، دوسری منزل پہ ایک شیشے کا پل (Glass Bridge) بنایا گیا تھا۔یہ پل دراصل ہوا میں معلق ایک وسیع راہداری تھی جو دونوں عمارتوں کی دوسری منزل کو آپس میں ملاتی تھی۔اس کی دیواریں اور چھت مکمل طور پر شفاف، مضبوط امپورٹڈ شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔دن کے وقت سورج کی روشنی اس میں سے گزر کر نیچے زمین پر عجیب و غریب روشن نقش بناتی تھی، جبکہ رات کے وقت اندر جلتی روشنی اسے فضا میں تیرتی ہوئی شفاف گیلری بنا دیتی تھی۔اس کے عین نیچے

گراؤنڈ فلور پر اسی طرز کا ایک وسیع ڈائننگ ہال تھا۔اوپری راہداری کی طرح یہ ہال بھی دونوں عمارتوں کو آپس میں ملاتا تھا۔اوپر کا شیشے کا پل آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا جبکہ نیچے وہ چکور ڈائننگ ایریا خاندان کے مشترکہ کھانوں اور رسمی محفلوں کے لیے مخصوص تھا۔یوں بزدار پیلس صرف ایک رہائش گاہ نہیں تھا بلکہ دو الگ زندگیاں، دو الگ کہانیاں اور ایک ہی خاندان کے اندر بٹے ہوئے رشتوں کی خاموش علامت بن کر کھڑا تھا۔شہر بھر میں بزدار پیلس وہ واحد عمارت تھی جس نے آرکیٹیکچر کا انعام جیتا تھا کیونکہ اسے بنایا ہی اس پیچیدگی سے گیا تھا کہ اسے تکتے رہنے کو دل کرتا تھا۔

یہ ایک عجیب تضاد تھا۔ایک ہی گھرانے کے کئی افراد ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے،الگ الگ عمارتوں میں اپنی اپنی انا کے حصار میں رہتے تھے مگر انہیں قدرت اور امجد بزدار کے اصولوں نے ایک ہی دستر خوان پر باندھ رکھا تھا۔رات کے وقت جب شیشے کی چھت سے چاند اور تارے نظر آتے اور پیلس کی سنہری روشنیاں جلتی تھیں تو ڈائننگ ہال کسی خلائی جہاز کا منظر پیش کرتا تھا۔خوبصورت مگر انتہائی سرد۔ دونوں عمارتوں کے دامن میں ایک مشترکہ گیراج تھا۔یہاں امجد بزدار اور ان کے بیٹوں اور پوتوں اور سبھی عورتوں کی گاڑیاں نظم وضبط کے ساتھ کھڑی ہوتیں تھیں۔ وسیع لان کے بائیں جانب ایک وسیع سوئمنگ پول تھا جس کا نیلا پانی رات کی روشنی میں چمکتا تھا جبکہ ساتھ ہی شیشے کا سن روم تھا، جہاں سردیوں میں اکثر کافی پی جاتی تھی۔پچھلے حصے میں سرونٹ کوارٹرز بنے تھے۔پیلس کے اندر لاتعداد کمرے، لمبی پیچیدہ راہداریاں اور مخملی قالین بچھے تھے۔ملازمین کے علاوہ، بزدار خاندان کے افراد کی تعداد تقریباً بیس تھی مگر اکثر فضا میں اکثر ایک ایسی خاموشی رچی رہتی تھی جسے دولت بھی نہیں خرید سکتی۔

اس وقت رات کے سات بج رہے تھے۔پیلس کی بائیں جانب والی پرشکوہ عمارت میں،اوپری منزل پر واقع ایک کمرہ اس وقت ملگجے اندھیرے اور پرسکون خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔یہ کمرہ دیکھنے میں اعلی ذوق اور نفاست کا آئینہ دار تھا۔دیواروں پر ہلکے رنگ کا پینٹ،فرش پر دبیز قالین اور درمیان میں رکھے مہنگے ترین جدید فرنیچر کا کمال مہارت سے انتخاب کیا گیا تھا۔یوں ہر چیز مکمل ترتیب میں تھی۔کمرے کے ایک کونے میں،نرم بیڈ پر سفید ریشمی لحاف منہ تک اوڑھے ایک وجود بے سدھ سا سویا ہوا تھا۔لیمپ کی مدھم روشنی میں، تکیے پر بکھرے اس کے گھنے بالوں کو واضح کررہی تھی۔ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر چند دوائیاں اور ایک پانی کا گلاس رکھا تھا جو بتاتا تھا کہ یہ سکون محض ظاہری ہے۔ دوسرے کونے میں ایک اسٹڈی ٹیبل پر چند میڈیکل میگزینز کے ساتھ ایک چمکدار اسٹیتھو سکوپ رکھا تھا، گویا ایک ڈاکٹر نے دن بھر کی تھکن کے بعد اسے وہیں چھوڑ دیا ہو۔پہلی نظر میں لگتا تھا جیسے کوئی گہری، پرسکون نیند سویا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔نیند کے اس پردے کے پیچھے ایک اندرونی جنگ جاری تھی۔

”اور جھوٹی شہادتوں سے دل پھٹ جایا جاتے ہیں!“

ایک عجیب سی، گونجتی ہوئی آواز تھی۔جیسے کمرے کی دیواروں میں کہیں سے نکل رہی ہو۔

"جو... جو تمہارے پاس ہے وہ میرا ہے!"

آوازوں کا سلسلہ بڑھنے لگا۔

پھر ایک کھردری تیز آواز گونجی، نہ زنانہ، نہ مردانہ۔

"اے ملکانی... کیسا لگتا ہے میری جگہ لے کر ہاں؟ مالکن بن کر؟ بڑی عیش میں ہے۔"

اب آوازوں کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب وغریب سرگوشی جیسے کوئی سایہ دار وجود کمرے کے ہر کونے میں اپنا غصہ نکال رہا ہو۔ آوازیں اتنی بڑھ گئیں، شور اتنا پھیل گیا کہ لگا جیسے سماعت کے پردے پھٹ جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ یہ ذہنی اذیت مزید بڑھتی، سائیڈ ٹیبل پر رکھا الارم اپنی پوری شدت سے چنگھاڑ اٹھا۔ بیڈ پر سویا وجود ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ریشمی لحاف اس کے چہرے سے پھسل کر گود میں ڈھیر ہو گیا۔ کھلے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے، پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ آنکھیں ہنوز نیم وا تھیں، خوف اور الجھن کا شکار۔ اسے حقیقی دنیا میں لوٹنے میں چند لمحے لگے۔ پھر اس نے بے جان ہوئے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کر دیا۔ چنگھاڑ خاموش ہو گئی مگر ذہنی شوراب بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ پھر ایک گہرا سانس لیا جیسے ڈوبتا ہوا شخص سطح پر آ کر سانس لیتا ہے۔ خواب کے سائے ابھی پوری طرح چھٹے نہیں تھے مگر اس نے خود کو بستر سے گھسیٹ کر کھڑا کیا۔ قدم لڑکھڑائے تو نہیں مگر ان میں وہ جان بھی نہیں تھی جو ایک بلند حوصلہ لڑکی میں ہونی چاہیے۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ شاور کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ وہاں دیر تک کھڑی رہی، پانی اس کے بند پپوٹوں پر گرتا رہا پہلے پہل جلن کا احساس ہوا پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈک اترنے لگی اور وہ خاموشی سے اسے محسوس کرتی رہی۔ بیس منٹ کے بعد جب وہ باتھ روم سے باہر نکلی تو اس نے ایک سفید رنگ کا نرم و ملائم باتھ روب پہن رکھا تھا۔ گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ کمرے کی تمام بتیاں اب روشن ہو چکی تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ پر نفاست سے چمکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ رنگت صاف تھی مگر اس میں خون کی سرخی کم اور تھکن کی زردی زیادہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ خود کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک گہری، تھکی ہوئی سانس لی اور پھر میز سے چند اسکن کیئر پروڈکٹس اٹھا کر اپنے چہرے پر لگانا شروع کیں۔ انگلیوں کے پوروں سے آنکھوں کے گرد مساج کیا تا کہ سوجن کچھ کم ہو سکے۔ کریم لگا چکنے کے بعد اس نے میز پر رکھی ایک نفیس، باریک سی چین اٹھائی۔ وہ اسے گلے میں پہننے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن تک لے گئی مگر اچانک اس کے ہاتھ فضا میں ہی معلق ہو گئے۔ اس کی نظر آئینے میں اپنی گردن سے ذرا نیچے، گریبان کی ہڈی کے پاس پھسل گئی۔ وہاں ایک لمبا، بھدا اور گہرا سرجیکل نشان موجود تھا جو سینے کے وسط کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں کپکپائیں اور بے اختیار اس نشان کو چھوا۔ یہ صرف نشان نہیں تھا، یہ ایک پوری تاریخ تھی۔ ایک اذیت تھی۔ اسے ہمیشہ اسے دیکھ کر اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی جتنی پہلی بار ہوئی تھی۔ اس وقت بھی دل بھر آیا۔ اس نے جھٹکے سے وہ چین میز پر واپس پھینکی اور اٹھ کر تیزی سے

واک اِن کلازٹ کی طرف بڑھ گئی۔اسے اپنا وہ نشان چھپانا تھا، دنیا سے بھی اور اپنی نظروں سے بھی۔

کلازٹ سے ایک سادہ سا، گرم سوٹ نکالا جو اس کے جسم کو پوری طرح ڈھانپ لے۔ اگلے پانچ منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے واپس آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ اب اس کا سراپا واضح تھا۔صاف رنگت اور کندھوں سے نیچے تک آتے ہوئے بال۔اس لڑکی کے نقوش عام سے تھے مگر... بال؟ ہاں بال بہت خوبصورت تھے پر اس وقت بے جان اور روکھے لگ رہے تھے۔ ان میں وہ قدرتی چمک نہیں تھی جو صحت مند بالوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ بالکل اس کی آنکھوں کی طرح۔ آئینے کے سامنے بیٹھی لڑکی میں دو چیزیں سب سے نمایاں تھیں۔اس کے بال اور اس کی آنکھوں کا رنگ جو خالص شہد جیسا تھا۔لیکن دکھ کی بات یہ تھی کہ دونوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ جیسے کسی نے چراغ کے شیشے پر گرد ڈال دی ہو۔اس نے اپنی وہ چمک، وہ زندگی کی رمق شاید کہیں کھو دی تھی۔ وہ کئی لمحے خود کو خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ بالوں میں کنگھی کرنے کا دل نہیں چاہا تو ڈرائیر کے بعد انہیں انگلیوں سے ہی سلجھا کر پیچھے کر لیا۔ بے دھیانی میں اس نے ڈریسنگ ٹیبل کا دراز کھولا تاکہ وہ چین واپس رکھ سکے مگر تبھی اس کی نظر دراز میں رکھے ایک چھوٹے سے، پرانے مخملی باکس پر پڑی۔ایک بار پھر اس کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ کچھ لمحے وہ اس مخملی ڈبیا کو دیکھتی رہی، ایک اذیت سی ابھری، پھر ایک انجانی کشش کے تحت اسے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اس نے ڈھکن کھولا، اندر دو ننھے ننھے سنہری ٹاپس (Studs) چمک رہے تھے۔ بزدار پیلس میں اس وقت سب سے سستی چیز یہ سونے کے ٹاپس تھے مگر اس کے پاس یہ پچھلے دس سال سے تھے۔ عجیب یہ تھا کہ آج تک پہنے بھی نہیں تھے اور پھینکے بھی نہیں دے۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی، ٹاپس نکالے اور باری باری اپنے کانوں میں پہننے لگی۔ سونے کی وہ معمولی سی چمک اس کے چہرے کی اداسی میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ لے آئی۔ ابھی وہ دوسرے کان کا پیچ کس ہی رہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔گھڑی پر ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ ہاسپٹل سے کال تھی۔اس نے اسکرین دیکھتے ہوئے فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔

"ہیلو ڈاکٹر نجف؟" دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز آئی۔

"جی حلیمہ، بولیں۔" اس نے گلا صاف کرتے ہوئے اپنی آواز کو نارمل کیا۔

"آج آپ کی نائٹ شفٹ ہے۔سوچا آپ کو یاد دلا دوں کہیں آپ بھول نہ جائیں۔" وہ سینئر نرس حلیمہ تھی، جس کے لہجے میں احترام اور اپنائیت تھی۔ نجف کے سپاٹ چہرے پر ایک بہت دھیمی، نہ ہونے کے برابر مسکراہٹ ابھری۔

"جی مُجھے یاد ہے۔بس پہنچ رہی ہوں آدھے پونے گھنٹے تک۔"

"ٹھیک ہے۔اللہ حافظ۔"

"تھینک یو حلیمہ!"

نجف نے فون بند کر کے میز پر رکھا۔ایک آخری تنقیدی نظر آئینے میں اپنے سراپے پر ڈالی۔وہ اچھی لگ رہی تھی، باوجود اس اداسی کے۔ بالوں کو پھر ڈرائر سے ہلکا سا خشک کیا، اسے ایسے ہی ہلکے گیلے اور قدرے الجھے بال پسند تھے۔وہ تقریبا تیار تھی۔

پھر اس نے بیڈ پر رکھا اپنا بڑا دوپٹہ اٹھایا اور اسے سر پر بہت سلیقے سے جما لیا، اس طرح کہ اس کے ماتھے سے لے کر پیچھے تک سارے بال چھپ گئے۔کمرہ کافی بڑا تھا۔وہ چلتی ہوئی دوسرے کونے میں آئی جہاں ایک مخصوص شیلف میں جائے نماز رکھا تھا۔اس نے جائے نماز نکالا اور قبلہ رخ بچھا کر نیت باندھ لی۔پورے بزدار پیلس میں، کوئی بھی عبادت گزار نہیں تھا۔نہ نجف کا باپ، نہ ماں، نہ سوتیلے بھائی اور نہ آگے ان کی اولاد۔خود وہ بھی پہلے ایسی نہیں تھی۔مگر پانچ سال پہلے، سب کچھ اچانک بدل گیا تھا۔کم از کم نجف بزدار کے لیے سب کچھ بدل گیا تھا۔ایک نہ ختم ہونے والے درد نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ہارٹ ٹرانسپلانٹ! اس کے سینے میں جو دل دھڑک رہا تھا، وہ اس کا اپنا نہیں تھا۔وہ ادھار کی سانسیں لے رہی تھی۔اس کی اپنی زندگی ختم ہو چکی تھی اور کسی انجان انسان کی موت نے اسے یہ نئی زندگی بخشی تھی۔ یہ احساس اتنا بھاری، اتنا وزنی تھا کہ اس نے نجف کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔اسے لگتا تھا کہ وہ ایک قرض تلے دبی ہے جسے وہ کبھی نہیں چکا سکتی۔یہ جو اس کی آنکھوں اور بالوں کی چمک کھو گئی تھی، یہ اسی تکلیف کا تاوان تھا۔کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے چہرے کی رونق کھا جاتے ہیں اور نجف کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اس سرجری نے اسے بچا تو لیا تھا مگر اسے یکسر بدل دیا تھا۔اب وہ اس 'پرائے دل' کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑی ہوتی تھی، شاید شکرانے کے لیے یا شاید معافی کے لیے۔نماز سے فارغ ہو کر بیس منٹ بعد وہ اپنا بیگ، اسٹیتھوسکوپ اور ایک اہم فائل اٹھائے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔بھورے گلاب رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور ایک گرم اسکارف گردن کے گرد سے گزار کر آگے ڈال رکھا تھا۔لاؤنج میں ملازم خاموشی سے صفائی ستھرائی میں مصروف تھے، اسے دیکھ کر مودبانہ سائیڈ پر ہو گئے۔اس کا رخ اب اس شیشے والے ہال یعنی ڈائننگ ایریا کی طرف تھا۔اس کے پاس صرف آدھا گھنٹہ تھا۔اسے کچھ کھا کر، کچھ توانائی بحال کر کے ہسپتال پہنچنا تھا جہاں رات بھر اسے جاگنا تھا۔دوسروں کی زندگیاں بچانے کے لیے شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کا قرض اتار سکے۔ابھی وہ لاؤنج میں پہنچی ہی تھی کہ سامنے ہی دروازے میں کھڑی نشاط کو دیکھ کر رک گئی۔ملازمہ کو کچھ ہدایات کرتی اپنی بہن کو دیکھ کر نجف کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن ابھری تھی۔وہ جانتی تھی نشاط وہاں کیوں آئی تھی اور اسے یہ سننا ہرگز پسند نہیں تھا۔ایک گہری سانس لیتے وہ آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆

گراؤنڈ فلور پر بزدار پیلس کے اس وسیع و عریض باورچی خانے میں اس وقت کسی تقریب کی تیاری جیسی صورتحال تھی۔کچن اتنا بڑا تھا کہ یہاں کئی گھرانے پل سکتے تھے مگر یہاں کی ترتیب اور صفائی ہیڈ ملازمہ شیبا کے سخت مزاج کی گواہی دے رہی تھی۔ملازمین کی ایک فوج تھی جو سفید ایپرن پہنے خاموشی اور تیزی سے برتنوں اور چولہوں کے درمیان مصروف تھی۔اسی کچن کے ایک کونے میں، ہیڈ ملازمہ شیبا ایک نئی

آنے والی دبلی پتلی لڑکی کو ہدایات دے رہی تھی۔ گو کہ شیبا نئی ملازمہ سے بات کر رہی تھی مگر اس کی آنکھیں عقاب کی طرح پورے کچن پر گھوم رہی تھیں، وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتی تھی۔

"دیکھو لڑکی! یہاں غلطیوں کی گنجائش صفر ہے۔" شیبا نے سخت لہجے میں کہا۔" کم و بیش بیس افراد اس گھر میں رہتے ہیں۔ اکثر تو دوروں پر ہوتے ہیں مگر کھانا اور سروس ہمیشہ ٹاپ کلاس ہونی چاہیے۔ تمہیں خاص طور پر حق صاحب کے بیٹے کے لیے لایا گیا ہے۔"

شیبا نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر ایک دوسری ملازمہ کی طرف رخ کر کے حکم دیا۔" نجف بی بی آتی ہوں گی، ان کا کھانا جلدی لگاؤ!"

پھر نئی لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئی۔" باقی لوگوں کی پہچان تمہیں دھیرے دھیرے ہو جائے گی لیکن فی الحال یہ جان لو کہ حق صاحب کے ساتھ کام کرنا لوہے کے چنے چبانے جیسا ہے۔ انہیں ہر چیز نیٹ اینڈ کلین چاہیے ہوتی ہے۔ وہ گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتے، بہت کم بولتے ہیں مگر اپنے بیٹے کے معاملے میں بہت پوزیسیو ہیں۔"

نئی ملازمہ کے چہرے پر الجھن اور گھبراہٹ صاف تھی۔ اتنے بڑے گھر کے اتنے زیادہ افراد اور ان کے پیچیدہ مزاج سمجھنا اس کے لیے فی الحال ناممکن تھا، وہ بس روبوٹ کی طرح سر ہلا رہی تھی۔

"میں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ تمہارا واسطہ سب سے زیادہ حق صاحب سے پڑے گا۔ تم ان کے بیٹے کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہو، اور یاد رکھنا... اپنے بیٹے کے معاملے میں حق صاحب کسی کو نہیں بخشتے۔" شیبا کی آواز میں ایک انتباہ تھی جس نے اس نئی ملازمہ کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔

"اور سلویٰ بی بی..." شیبا نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا،" وہ حق صاحب کی وائف ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرتا ہے مگر اپنے بیٹے سے وہ بھی بہت پیار کرتی ہیں۔ انہیں اپنے بچے کے لیے ایک قابلِ اعتبار اور بھروسہ مند آیا چاہیے، اسی لیے تمہیں رکھا گیا ہے۔ سمجھ رہی ہو نا؟ باقی سب تمھیں کامل بابا کی پرانی آیا سمجھا دے گی۔ میرا کام تمہیں گھر کا ماحول سمجھانا تھا۔"

لڑکی نے ایک بار پھر خاموشی سے سر ہلا دیا مگر وہ گھبرائی ہوئی تھی اور یہ صاف دکھ رہا تھا۔ جانے وہ حق اور سلویٰ کو کیسے جھیل پاتی۔

" گڈ!"شبیا نے مختصر کہا۔اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سبق دیتی، ڈائننگ ہال کی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں اور کچن میں موجود ملازمین ایک دم چوکنے ہو گئے۔
شیشے کے وسیع وعریض ہال میں (بائیں جانب سے) نجف داخل ہوئی تو اس کے پیچھے نشاط چلی آ رہی تھی۔ ہمیشہ سے کی نک سک سی تیار نشاط کی خوشبو پورے ڈائننگ ایریا میں پھیل گئی۔شیشے کی چھت سے اوپر کا آسمان صاف نظر آ رہا تھا مگر ایک حد تک کیونکہ اس کے اوپر وہ پل (اندرونی راستہ) تھا جو دونوں عمارتوں کو آپس میں جوڑتا تھا۔

"تمہاری آج نائٹ ڈیوٹی ہے؟" نشاط نے نجف کی کمر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔نجف نے قدم روکے بغیر ایک سرد آہ بھری۔وہ چلتی ہوئی اس میز تک پہنچی جو گلاس وال (شیشے کی دیوار) کے ساتھ لگی ہوئی تھی جہاں سے باہر لان کا منظر صاف نظر آتا تھا۔اس نے اپنا بیگ، فائل اور اسٹیتھو سکوپ میز پر رکھ دیئے۔

"تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟" نجف نے پلٹ کر نشاط کو دیکھا،اس کی آواز میں بے زاری سی تھی جو اس کی زندگی کا خاصہ بن چکی تھی۔"میں یہ اسٹیتھوسکوپ پہن کر کسی پارٹی میں جانے سے تو رہی۔"

اس نے فون کی اسکرین پر نظریں دوڑاتے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔نشاط نے تیکھی اور ناگوار نظروں سے اسے دیکھا۔نجف کا یہ دوٹوک اور سرد لہجہ اکثر اسے آگ بگولا کر دیتا تھا، یوں تو وہ دونوں بہنیں تھیں۔جڑواں بہنیں مگر دونوں کی بہت کم بنتی تھی۔دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا۔صرف مزاج ہی نہیں وہ دونوں ظاہری شخصیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف دکھتی تھیں اسی لیے کسی نے کبھی انہیں جڑواں سمجھا ہی نہیں۔
نجف جانتی تھی اس وقت نشاط اس سے کیوں ملنے آئی تھی۔اس کے بیٹھنے پر نشاط کو بھی چند کرسیوں کے فاصلے پر بیٹھنا پڑا۔وہ غور سے نجف کو دیکھ رہی تھی۔وہ ایک جانب کی مانگ نکالتی تھی۔اس وقت بھی اس کے بال چہرے کے ایک جانب پڑے تھے اور ایک جانب سے کان کے پیچھے تھے۔اسکرین کی ہلکی نیلی روشنی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔وہ ایسے برتاؤ کر رہی تھی جیسے نشاط کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہو۔جبکہ نشاط جو غور سے اسے دیکھ رہی تھی اس کی نظریں اچانک نجف کے کان میں چمکتے اس ٹاپس پر جا پڑیں۔اس کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔پیشانی پر لکیریں ابھریں۔کئی لمحے وہ اسے دیکھتی رہی۔بے یقینی سے، جیسے یقین نہ آیا ہو کہ نجف نے سالوں بعد وہ ٹاپس پہن لیے تھے؟ مگر کیوں؟
ملازمہ ایک ٹرے میں نجف کا مخصوص ہلکا پھلکا کھانا (گرلڈ چکن اور ابلی ہوئی سبزیاں) لے کر آئی۔اس نے نہایت مہارت سے پلیٹ نجف کے سامنے رکھی اور پیچھے ہٹ گئی۔نجف نے کانٹا ہاتھ میں لیا اور ایک بار پھر نشاط کے وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔جبکہ نشاط کو اس کے معمولی سے ایئر رنگز نے بے چین سا کر دیا تھا۔اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔دماغ اور نظر ان ایئر رنگز سے ہٹانا چاہی۔

"مُجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" بے تحاشا امڈ آنے والی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے وہ مدعے پر آئی۔

"ہاں ہاں بولو..." نجف نے انجان بنتے، چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ سامنے بیٹھی نشاط ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ سیاہ سلک کا لباس جس کے گلے پر سنہری کام ہوا تھا۔ اس کے مصنوعی سنہری بال اور نفاست سے کیا گیا میک اپ اس پر جب رہے تھے۔ وہ ہر رنگ میں خوبصورت لگتی تھی۔

"تمہارے ہسپتال کی انتظامیہ بہت ضدی ہے۔ وہ لڑکی ...صبا...وہ ایک گولڈن کیس ہے۔ اسے میرے شو پر آنا چاہیے۔ پورا ملک اسے دیکھنا چاہتا ہے۔"

نشاط صبح، ملک کا مشہور مارننگ شو تھا جسکی میزبان نشاط تھی۔ نجف نے سبزی کا ایک ٹکڑا نہایت سکون سے چبایا، پھر نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"پورا ملک اسے دیکھنا چاہتا ہے یا تمہارا شو ریٹنگ کے ریکارڈ توڑنا چاہتا ہے؟ دونوں باتوں میں بہت فرق ہے نشاط!"

نشاط کے ماتھے پر بل پڑے۔

"اسے انصاف دلانا میری ذمہ داری ہے۔ جب وہ میرے شو پر آ کر اپنی داستان سنائے گی تو مجرموں کو پھانسی ہوگی۔"

"انصاف عدالتیں دیتی ہیں، مارننگ شو کے اسٹوڈیوز نہیں۔" نجف نے اب کی بار براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ شہد رنگ آنکھوں میں اس وقت برف جیسی ٹھنڈک تھی۔ "وہ لڑکی ابھی ایک شدید جسمانی اور ذہنی صدمے سے گزر رہی ہے۔ اس کے لیے کیمروں کی لائٹس اور تمہارے وہ سنسنی خیز سوالات زہر قاتل ثابت ہوں گے۔ بطور اس کی ڈاکٹر، میں اس کی ذہنی صحت پر سودے بازی نہیں کر سکتی۔"

"صرف ایک پیپر پہ سائن کرنے ہیں تمہیں!" نشاط نے آواز تھوڑی اونچی کی۔ "باقی سب میں سنبھال لوں گی۔ اسے وی آئی پی پروٹوکول ملے گا۔"

نجف نے نوالہ روکا۔"اسے اس وقت پروٹوکول کی نہیں، پرائیویسی کی ضرورت ہے۔ وہ ایک انسان ہے نشاط! تمہارے شو کا کوئی Prop نہیں اور میرا جواب وہی ہے جو ہسپتال کا تھا۔نہیں۔"

نجف کے انکار پر نشاط کے چہرے کا رنگ غصے سے متغیر ہونے لگا۔اس نے میز پر جھک کر دبی دبی آواز میں کہا۔

"شاید تم بھول رہی ہو کہ میں اس ملک کا سب سے بڑا مارننگ شو ہوسٹ کرتی ہوں۔ یہ نہ ہو، تمہیں ڈیڈ کو جواب دینا مشکل ہو جائے۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح باپ کی دھمکی دینا چاہی۔نجف کے لبوں پر ایک بے جان سپاٹ سی مسکراہٹ آئی۔اس نے گلاس اٹھایا اور پانی کا ایک گھونٹ پیتے نہایت آرام سے جواب دیا۔

"ڈیڈ کو میں خود جواب دے دوں گی۔تم اپنے پروڈیوسر کو جواب دینے کی فکر کرو۔"

اس بار نشاط تلملا کر اپنی جگہ سے اٹھی۔اس کے سینڈل کی نوک فرش پر لگی تو ایک تیز آواز پیدا ہوئی۔

"تم بہت مغرور ہو گئی ہو نجف! تمہیں لگتا ہے یہ سفید کوٹ پہن کر تم ہٹ دھرمی کر سکتی ہو؟ وہ لڑکی میرے شو پر آئے گی، لکھ لو میری بات۔"

نجف نے دوبارہ کانٹا اٹھا لیا۔"جب تک وہ میرے وارڈ میں ہے، وہ کہیں نہیں جائے گی۔اب تم جا سکتی ہو۔"

نشاط نے اپنا ہینڈ بیگ جھٹکے سے اٹھایا۔اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اس ضدی طبیعت کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔تم اس گھر میں سب سے کٹ کر رہتی ہو، یاد رکھنا ایک دن تم اکیلی رہ جاؤ گی۔"

وہ پیر پٹختی ہوئی ڈائننگ ایریا سے باہر نکل گئی۔نجف نے اس کے آخری جملے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔اس نے ایک لمبا سانس لیا اور باقی بچا ہوا کھانا چھوڑ کر اپنی چیزیں اٹھانا شروع کیں۔اسے ہسپتال پہنچنا تھا۔اسے ان لوگوں کے درمیان جانا تھا جن کے دکھ حقیقی تھے،نشاط کے مارننگ شو کے مصنوعی آنسوؤں کی طرح نہیں۔نشاط سے اسے کسی قسم کی امید نہیں تھی وہ اپنے شو کی ریٹنگ کے لیے کسی حد تک جا سکتی تھی۔

ایک ریپ کیس کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی مگر نجف؟ ایک سائن ہی تو کرنا تھا اور نجف بزدار سائن کر ہی نہ دے۔

☆☆☆☆☆

نجف ابھی ڈائننگ ایریا سے نکل ہی رہی تھی کہ دائیں جانب والی عمارت سے (یعنی امجد بزدار کی پہلی بیگم کے حصے سے) ایک بپھری ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ یہ کافی ہے؟ تم لوگوں کو ابھی تک میرے taste کا پتا نہیں چلا؟"

اس کے ساتھ ہی ایک تیز چھناکے کی آواز آئی۔ قیمتی سیرامک کا کپ سنگِ مرمر کے فرش سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ بائیں جانب واپس جاتی نجف کے نہ قدم رکے اور نہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے پتا تھا کہ یہ طوفان کس کا اٹھایا ہوا ہے۔ دائیں جانب کے لاؤنج میں کھڑی تئیس سالہ عالیہ کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ سفید رنگت اب کسی پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ ہو چکی تھی اور اس کی نیلی رگیں ماتھے پر ابھر آئی تھیں۔ ایک ملازمہ فرش پر بکھری کافی اور کانچ کے ٹکڑوں کو دیکھ کر خوف سے کانپ رہی تھی۔

"مام... شیبا..." اس کی دوسری پکار سنائی دی۔ اس نے اپنی ماں اور شیبا کو بیک وقت پکارہ۔ اسی دوران ہیڈ ملازمہ شیبا وہاں پہنچ چکی تھی۔

" کیا ہوا عالیہ بی بی؟" اس نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دبی آواز میں پوچھا۔

"تم اچھے سے جانتی ہو شیبا کہ مُجھے پوری پوری رات جاگنا پڑتا ہے۔ یہ اتنی میٹھی کافی؟ یہ کس نے بنائی ہے؟" عالیہ نے فرش پر پھیلی ہوئی سیاہ کافی کی طرف لرزتی انگلی سے اشارہ کیا۔ اس کا پورا وجود ضبط سے لرز رہا تھا۔ اس کے لیے یہ صرف کافی نہیں تھی یہ اس کی پڑھائی میں پڑنے والا خلل تھا۔ نجف اب اپنے لاونج سے باہر نکل کر گیراج کی جانب جا رہی تھی۔

" آپ پریشان مت ہوں، میں خود بنا دیتی ہوں۔" شیبا نے فوراً معاملے کو سنبھالا۔ اس نے ملازمہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا تو وہ لڑکی جیسے قید سے رہا ہوئی ہو، تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے بھاگ نکلی۔ عالیہ نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے چہرے کو رگڑا جیسے وہ اپنے دماغ کی تپش کو کم کرنا چاہ رہی ہو۔ شیبا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ عالیہ کو بچپن سے جانتی تھی۔ وہ اتنی بدمزاج نہیں تھی مگر میڈیکل کی پڑھائی نے اس

کی شخصیت کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور دبلا ہوتا ہوا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ ایک ایسے مقابلے میں جتی ہوئی ہے جہاں جیتنا ہی اس کی بقاء کا واحد راستہ تھا۔

"مُجھے میری کافی چاہیے...ابھی!" وہ خشک حکم دے کر سیڑھیوں کی طرف لپکی۔

شیبا نے ایک لمبی، تاسف بھری سانس لی اور زمین پر گری کافی کو دیکھا۔تبھی دوسری ملازمہ صفائی کے لیے پہنچی، شیبا اسے اچھے سے صاف کرنے کا کہہ کر واپس پلٹ گئی۔اس کی بڑبڑاہٹ صرف وہی سن پائی تھی۔

"توبہ ہے!انسان جانور بن جائے پر ڈاکٹر نہ بنے۔یہ ڈاکٹر لوگ پورے پاگل ہوتے ہیں۔"

باہر گیراج میں نجف اب اپنی گاڑی ریورس کر رہی تھی جبکہ اوپر اپنے بیڈروم کی بالکونی کے پردے کی اوٹ سے عالیہ اسے دیکھ رہی تھی۔نجف کی گاڑی کی ہیڈلائٹس گیٹ سے باہر نکلیں تو عالیہ کے اندر ایک کسک سی ابھری۔اس خاندان میں ہر دوسرا شخص ڈاکٹر تھا اور یہاں پہچان صرف اسے ملتی تھی جو سب سے آگے ہو۔مقابلہ صرف باہر والوں سے نہیں، اپنوں سے بھی تھا۔ بیڈ پر پڑے اس کے موبائل نے زوردار وائبریٹ کیا تو اس کا سکتہ ٹوٹا۔کھڑکی سے ہٹتے ہوئے اس جھپٹ کر فون اٹھایا۔اسکرین پر کلاس کے واٹس ایپ گروپ کی چیٹ ایک نئی پریشانی بن کر ناچ رہی تھی۔

" کل رزلٹ آرہا ہے!"

" کیا لگتا ہے، اس بار کون فرسٹ ہوگا؟ عالیہ بزدار یا سلال شبگیر؟"

نیچے کسی نے کمنٹ کیا تھا۔"ففٹی ففٹی ہے بھئی۔"

"فرسٹ تو عالیہ ہی ہوگی۔"

"سلال کبھی دوسرے نمبر پر نہیں آیا۔"

سلال شبگیر کا نام پڑھتے ہی عالیہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ جیسے کسی نے طمانچہ دے مارا ہو۔ وہ چاہے خود فیل ہو جاتی، اسے دکھ نہ ہوتا مگر ٹاپر کی کرسی پر سلال شبگیر کا بیٹھنا اس کے لیے موت سے بدتر تھا۔

"سلال شبگیر..." اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے موبائل کو واپس بیڈ پر پھینکا۔ وہ لڑکا اس کے لیے محض ایک ہم جماعت نہیں تھا وہ عالیہ کے لیے ایک نائٹ میئر بن چکا تھا۔ ایک ایسی رکاوٹ جو اسے بزدار خاندان کی بہترین پروڈکٹ بننے سے روک رہی تھی۔ وہ اب اپنے کمرے میں جلے پیر کی بلی کی طرح چکر کاٹ رہی تھی۔ کبھی کتابیں اٹھاتی، کبھی پھینک دیتی۔ اس کا خون سلال کے تذکرے پر ہی جوش مارنے لگتا تھا۔ اسے کافی کی اشد ضرورت تھی ورنہ شاید اس کا دماغ پھٹ جاتا۔

☆☆☆☆☆

پیلس کی پر تعیش خاموشی سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر بہتا ہوا ٹریفک نجف کے لیے ہمیشہ ایک بوجھل تجربہ ہوتا تھا۔ وہ اسٹیرنگ پر گرفت مضبوط کیے گاڑی چلا رہی تھی مگر اس کا ذہن بیک وقت کئی آوازوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گاڑی جیسے ہی مین روڈ کے بڑے سگنل پر پہنچی، بتی سرخ ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور گاڑی روک دی۔ یہ سگنل شہر کا وہ سنگم تھا جہاں زندگی کے دو متضاد رخ آپس میں ٹکراتے تھے۔ ایک طرف مہنگی گاڑیاں تھیں اور دوسری طرف مانگنے والوں کا ایک ہجوم جو ہر رکتی گاڑی کو اپنی بقا کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ کئی سائے گاڑی کے گرد منڈلانے لگے۔ شیشے پر ہونے والی مسلسل دستک نجف کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس نے بیزاری سے ڈیش بورڈ کے دراز سے چند سرخ نوٹ نکالے۔ وہ ہمیشہ ایسے مواقع کے لیے کچھ نقدی پاس رکھتی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا اور ہاتھ باہر نکال کر وہ نوٹ آگے بڑھائے۔

"یہ لو، اور اب جانے دو..." اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر نوٹ لینے کے لیے کوئی ہاتھ آگے نہیں بڑھا۔ اس کے بجائے ایک عجیب سی کرخت ہنسی سنائی دی۔

" کیا ملکانی صاحبہ! یہ کیا ہے؟ یہ کاغذ کے چند ٹکڑے؟"

نجف نے چونک کر باہر دیکھا۔شیشے کے بالکل پار ایک خواجہ سراء کھڑا تھا۔بے تحاشہ میک اپ جو گرد و غبار کی وجہ سے چہرے پر لیپا پوتا لگ رہا تھا، کھلے بکھرے بال اور گہرے رنگ کا لباس۔اس کا حلیہ جتنا عجیب تھا،اس کی آنکھوں میں موجود چمک اتنی ہی زہریلی تھی۔

"مُجھے یہ نہیں چاہیے...مُجھے میری جگہ واپس چاہیے۔"اس نے نجف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

نجف کا سانس جیسے سینے میں ہی منجمد ہو گیا۔وہ حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔"کیسا لگتا ہے میری جگہ لے کر؟ مالکن بن کر، ہاں؟"

وہی الفاظ...وہی لہجہ...جو اسے ہر روز سنائی دیتے تھے۔وہ آواز جو نہ پوری طرح زنانہ تھی نہ مردانہ۔

"چل نہ،اب بس کر...بہت ہو گیا ناٹک!بہت کر لی عیش،اب میری جگہ چھوڑ دے۔"خواجہ سراء کا لہجہ اچانک تمسخر سے بدل کر دھمکی آمیز ہو گیا۔اس کے چہرے کے تاثرات اب ہولناک حد تک کرخت تھے یوں جیسے وہ ابھی جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لے گا۔نجف جیسے کسی خواب سے جاگی۔ہمیشہ کی طرح اس نے آج بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔پچھلے چھ ماہ میں یہ تیسری بار تھا جب وہ خواجہ سراء پھر سے اس کے سامنے آیا تھا۔جانے وہ کس جگہ کی بات کر رہا تھا۔نجف نے خود پر قابو پاتے ہوئے جبڑے بھینچے اور بنا کچھ کہے وہ نوٹ باہر پھینکے اور جھٹکے سے ہاتھ اندر کھینچ کر شیشہ اوپر کر دیا۔اس کا ہاتھ ہلکا سا کپکپایا تھا۔

"اے ملکانی!اے بات سن نا!اے ملکانی.."

وہ اب اپنے بھاری ہاتھوں سے گاڑی کے شیشے پر زور زور سے دستک دے رہا تھا۔اس کی لمبی انگلیاں اور بھدا میک اپ شیشے کے دوسری طرف سے کسی ڈراؤنے خواب کا منظر پیش کرنے لگا۔نجف نے دونوں ہاتھ سٹیرنگ پر جما لیے اور سامنے لگی بتی کو دیکھنے لگی جو اسے صدیوں تک سرخ ہی لگی۔دستک کی آواز اس کے دماغ کے اندر گونج رہی تھی جیسے کوئی اس کے وجود کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہ رہا ہو۔
آخر کار بتی سبز ہوئی۔اس نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا۔گاڑی کسی تیر کی طرح وہاں سے نکلی اور چند ہی لمحوں میں ٹریفک کے سمندر میں گم ہو گئی۔پیچھے سگنل پر کھڑا وہ خواجہ سراء اب شور نہیں مچا رہا تھا۔اس نے زمین پر گرے وہ سرخ نوٹ بھی نہیں اٹھائے۔اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ اور تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔اس نے اپنی گردن کو ایک عجیب زاویے سے جھٹکا دیا اور جیسے ہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی،وہ واپس پلٹ گیا۔اس کی چال میں اب وہ مانگنے والوں والی عاجزی نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

آپریشن تھیٹر کی اس برفانی سردی اور زندگی وموت کی کشمکش سے نکل کر جب حق اپنے آفس میں داخل ہوا، تو کمرے کی فضا میں پھیلی لوبان کی ہلکی سی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ (لوبان کی مہک دماغ کو پرسکون کرنے اور بے چینی وذہنی دباؤ کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی) اس کا آفس ویسا ہی تھا جیسا وہ خود تھا۔ بے حد منظّم، مہنگا مگر بے جان۔ دیواروں پر لگی میڈیکل ڈگریوں کے فریم بالکل سیدھے تھے اور میز پر پڑی ہر چیز اپنی جگہ پر ساکت تھی۔ جراح کا لباس تبدیل کر کے وہ اب واپس گہری نیلی شرٹ میں تھا جس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی کامیاب سرجری کی خبر اس سے پہلے اس کے آفس پہنچ چکی تھی، اسی لیے میز پر بھاپ اڑتی چائے کا کپ پہلے سے موجود تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنا موبائل اٹھایا اور ایک مخصوص نمبر ڈائل کیا۔ یہ اس کے گھر کا نمبر تھا یا یوں کہیے کہ اس کی کائنات کے اس واحد مرکز کا پتہ، جس کے لیے وہ یہ ساری تگ ودو کر رہا تھا۔ وہ فون کان سے لگائے بے چینی سے ٹہل رہا تھا کہ دوسری جانب سے ایک لڑکھڑاتی ہوئی ادھوری مگر جادوئی آواز آئی۔

"پا... پا..."

حق کی آنکھیں بے ساختہ بند ہوگئیں۔ وہ وجود جو گھنٹہ بھر پہلے ایک انسانی دل کی رگیں جوڑ رہا تھا، اس ایک لفظ کی پکار سے پگھلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے پٹھے ڈھیلے پڑ گئے اور پھر اس نے ایک طویل پرسکون سانس لی۔ جیسے کسی تپتے صحرا میں چلتے چلتے اچانک بادل چھا گئے ہوں۔

"ہیلو ہنی... ہاؤ آر یو؟" اس کے لہجے میں وہ سرد مہری کہیں نہیں تھی جو اسے بھیڑیا بناتی تھی۔ دوسری جانب سے جواب میں پھر وہی ٹوٹا ہوا لفظ دہرایا گیا۔

"پا... پا..."

شاید تین سالہ کامل کو ابھی یہی کہنا آتا تھا یا شاید اسے معلوم تھا کہ اس کے باپ کی کل کائنات بس اسی ایک لفظ میں سمٹی ہوئی تھی۔ وہ بار بار پاپا دہراتا تھا۔ حق کے ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مگر خالص مسکراہٹ آئی۔

"روزی، سب ٹھیک ہے؟" اگلے ہی لمحے اسکا کا لہجہ یکسر بدل گیا۔

"یس سر!" پرانی آیا روزی کی مودبانہ آواز آئی۔

"کامل نے کھانا کھایا؟" اس نے میز پر رکھا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"یس سر، ابھی کھایا ہے۔"

"گڈ! میڈم آ گئی ہیں؟" اس نے چائے کا کپ اٹھا ایک گھونٹ بھرا، آواز میں سلویٰ کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاص قسم کی بے نیازی تھی۔

"نہیں سر... لیکن ان کا فون آیا تھا۔ وہ راستے میں ہیں۔"

"او کے۔" اس نے مختصر کہا اور فون بند کر دیا۔

ابھی کپ میز پر رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اس کی اسسٹنٹ جویریہ اندر داخل ہوئی۔ جویریہ ان چند افراد میں سے تھی جو حق کے کام کرنے کے جنونی انداز اور اس کی خفیہ ذہنی کیفیت سے واقف تھے۔ وہ حق کی تمام اپائنٹمنٹس، سرجریز اور میٹنگز کی انچارج تھی۔

"سر! وہ، مُجھے پتہ چلا ہے کہ آج آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" اس کے لہجے میں حقیقی تشویش تھی۔ "کیا میں آپ کے سیشن کی اپائنٹمنٹ لے لوں؟ ڈاکٹر سارہ آج بھی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

اس دوران حق کی نظریں اپنی میز پر جمی تھیں۔ "نہیں۔" اس نے ایک لفظ میں جیسے بحث کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا تھا۔

"لیکن سر... یہ آپ کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔" جویریہ نے جھجکتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا۔ حق نے چائے کا گھونٹ بھرا اور سرد نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھا۔

"اسسٹنٹ ہو وہی رہو، ماں مت بنو۔"

جویریہ کا چہرہ پل بھر کو شرمندگی سے سرخ پڑ گیا۔اس نے فوراً اپنی فائل کھولی اور پیشہ ورانہ انداز اختیار کر لیا۔"او کے سر!مُجھے بتانا تھا کہ کل آپ کو کالج جانا ہوگا۔رزلٹ اناؤنس ہو رہا ہے اور آپ کا وہاں ہونا شیڈول کا حصہ ہے اور میں نے اسپیچ تیار کر لی ہے۔"

حق نے خاموشی سے سر ہلایا۔اسے یاد تھا۔وہ کچھ نہیں بھولتا تھا۔

"قدیر سے کہو گاڑی اسٹارٹ کرے۔"اس نے چائے کا ایک گھونٹ اور بھرا۔ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔اس کی پیشانی کی لکیریں واضح تھیں۔وہ جویریہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔وہ الجھا الجھا سا تھا۔

جویریہ "او کے سر" کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔وہ کرسی سے اٹھ کر ایک لمحے کے لیے اپنی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا جہاں سے شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔اس نے ایک بار پھر اپنے فون کی اسکرین روشن کی، جہاں وال پیپر پر کامل کی تصویر مسکرا رہی تھی۔کل کا دن ہنگامہ خیز ہونے والا تھا مگر اس وقت اسے صرف اپنے اس محل نما گھروندے میں واپس جانا تھا جہاں اس کا بیٹا اس کا انتظار کر رہا تھا مگر اس سے پہلے حق کو ضروری کام نبٹانا تھا۔اس نے جھکتے ہوئے اپنے میز دوسری نمبر والی دراز کھولی اور چند فائلوں کو اٹھاتے ان کے نیچے سے ایک دوسرا فون نکالا۔ایک ایسا فون جو اس کے سرکاری ریکارڈ میں کہیں موجود نہیں تھا۔پھر اس نے تیزی سے ایک پرائیویٹ نمبر ڈائل کیا۔چند سیکنڈز کی بیل کے بعد دوسری جانب سے رابطہ بحال ہوا،حق خاموش رہا۔

" کہیے بزدار صاحب؟"

اس کی خاموشی پر دوسری جانب سے ایک آواز ابھری، جو صوتی طور پر تبدیل (Voice-changed) کی گئی تھی۔وہ آواز کسی مشین کی طرح سپاٹ اور کرخت تھی۔

" کیا اپڈیٹ ہے؟" حق کی آواز میں ایک عجیب سی کاٹ تھی۔وہ اپنی بے چینی کو سرد مہری کے لبادے میں چھپانے کا فن جانتا تھا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے؟" دوسری جانب سے تمسخرانہ پوچھا گیا۔ " آپ سے کہا تھا کہ آج کام ہو جائے گا۔ ثبوت آپ تک پہنچ جائیں گے بس تھوڑا صبر کیجیے۔"

حق کے جبڑے بھینچ گئے۔ "لیکن کیسے؟ ثبوتوں کی تصدیق کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ آخر وہ مجھ تک آئیں گے کیسے؟" وہ دبا دبا سا چلا رہا تھا۔

"یہ ہمارا سر درد ہے بزدار صاحب! آپ کا نہیں۔ ہم اپنا کام کرنا جانتے ہیں۔"

حق کی آنکھوں میں وحشت سی دوڑی۔ اس نے فون پر اپنی گرفت مضبوط کی اور دبی آواز میں تنبیہ کی۔

" تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میں حق بزدار ہوں۔ اگر ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی یا تمہاری ایجنسی نے اس کام میں کوئی کمی کوتاہی کی یا کچھ غلط ہوا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ میں اپنی جڑیں کھودنے والوں کو زندہ دفن کرنے کا عادی ہوں۔"

اس کے لہجے کی برفانی آنچ نے جیسے کمرے کی ٹھنڈک میں مزید اضافہ کر دیا۔ دوسری جانب چند لمحوں کا سکوت رہا پھر وہی مشینی آواز دوبارہ آئی۔

"ڈونٹ وری بزدار صاحب! رپورٹس آپ تک ایسے پہنچیں گی کہ آپ خود بھی حیران رہ جائیں گے۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ حق نے فون کان سے ہٹایا اور بھنویں سکیڑ کر کالی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے اندر کی بے چینی اب ایک طوفان کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا، جیسے کمرے کی ہوا کم پڑ گئی ہو۔ اس نے بے ساختہ اپنی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول دیے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی باریک بوندیں نمودار ہوئیں۔ اسے ایک انجانا ڈر ستا رہا تھا۔ وہ جو حقیقت ڈھونڈنے نکلا تھا، اب اسی حقیقت کے سامنے آنے سے خائف تھا۔ وہ جیسا سوچ رہا تھا، دل کی کسی گہرائی میں ویسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ انسانی خواہشات حقیقت کا راستہ نہیں بدل سکتیں۔ فون کو واپس بند کرتے ہوئے وہ خاموشی سے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا، جہاں باہر شہر کی روشنیاں اسے چڑاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ کل کی صبح بزدار خاندان کے لیے وہ سچ لائے گی جسے ہضم کرنا شاید خود ڈاکٹر بیسٹ کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

ہسپتال کی عمارت رات کے وقت کسی روشن قلعے کی مانند کھڑی تھی۔حق کی گاڑی جب مرکزی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی، ٹھیک اسی لمحے نجف کی گاڑی سفید ہیولے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ بالکل خاموشی سے حق کی گاڑی باہر نکل گئی تو نجف کے اندر داخل ہوگئی۔نجف نے گاڑی سے اترتے ہوئے، پارکنگ کے لیے گارڈ کو چابی تھمائی اور تیز قدموں سے ہسپتال کی مرکزی عمارت کی جانب بڑھی۔ ریسیپشن اور ویٹنگ ایریا سے گزرتی وہ ایک راہداری میں داخل ہوگئی۔ بال ڈھیلے سے فولڈ کیے گئے تھے اور اسکا اسٹھیتو سکوپ گلے میں لٹک رہا تھا۔ باقی ڈاکٹرز اور نرسیں گزرتے ہوئے اسے گڈ ایوننگ کہہ رہے تھے۔ وہ سر ہلاتی راہداری عبور کرتی اپنے کمرے میں پہنچی۔ابھی اس نے بیگ میز پر رکھا ہی تھا کہ نرسنگ سپرنٹنڈنٹ حلیمہ ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"ڈاکٹر نجف! ایڈمن بلاک سے بلاوا آیا ہے۔ڈاکٹر شمس صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔موڈ ٹھیک نہیں لگتا ان کا۔" حلیمہ دراصل نجف کی خیرخواہ تھی۔اس لیے وہ بے تکلفی سے بات کرلیتی تھی۔نجف نے ایک گہرا سانس لیا۔اسے معلوم تھا کہ نشاط کے بعد اب اسے شمس سے بھی ایک زیادہ بڑی جنگ لڑنی تھی۔اس نے آنے کا کہہ کر اپنا وقت مکمل کیا۔ چند ایک فائلز دیکھیں۔نرسنگ اسٹاف سے چند رپورٹس لیں اور پھر آدھے گھنٹے بعد وہ ایڈمن بلاک کی طرف بڑھ گئی۔ دس منٹ بعد وہ ایک پرشکوہ دفتر کے سامنے کھڑی تھی جس کے دروازے پر لگی تختی پر 'ڈاکٹر شمس بزدار رہیڈ آف ایڈمنسٹریشن' کندہ تھا۔نجف نے دستک دیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔اندر شمس بزدار بے چینی سے ٹہلتے ہوئے ایک فائل دیکھ رہے تھے۔نجف کو دیکھتے ہی انہوں نے فائل میز پر پٹخی۔

"نجف! یہ کیا تماشہ ہے؟ تم نے اس انکوائری رپورٹ پر دستخط کرنے سے کیوں انکار کیا؟" شمس کا لہجہ حاکمانہ تھا البتہ آواز دھیمی تھی۔نجف ان کے لہجے کو نظر انداز کرتے، سکون سے ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور فائل اپنی طرف کھسکائی

" کیونکہ یہ رپورٹ جھوٹ کا پلندہ ہے۔گردے فیل ہونا نرس کی غلطی نہیں، ڈاکٹر یاور کی نااہلی تھی۔انہوں نے غلط ڈوز تجویز کی تھی، نرس نے صرف وہی کیا جو فائل پر لکھا تھا۔"

"نجف، تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟" ڈاکٹر شمس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر جھکتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر یاور سینئر سرجن ہیں۔ان کا نام خراب ہوا تو ہسپتال کی ریپوٹیشن خاک میں مل جائے گی۔ایک نرس کو قربان کرنے سے کسی کو فرق نہیں

پڑتا، ہم اسے معاوضہ دے کر خاموش کرا دیں گے۔"

یہ سنتے ہی نجف کی آنکھوں میں ایک تیز لہر ابھری مگر یہ لہر غصے کی تھی۔

"فرق پڑتا ہے ڈاکٹر شمس! اس نرس کی عزتِ نفس اور اس کے کیریئر کو فرق ہے۔ آپ ایک بے گناہ کو سولی پر چڑھا کر اپنے برانڈ کو بچانا چاہتے ہیں؟"

"یہ ہسپتال ہے نجف! یہاں جذبات نہیں چلتے..." شمس غرائے۔ "اگر یہ خبر باہر نکلی کہ بزدار ہسپتال کے سینئر ڈاکٹر نے مریض کے گردے فیل کر دیے ہیں تو جانتی ہو کیا ہوگا؟"

نجف نے پرسکون انداز میں ان کی بات سنی اور پھر میز پر دونوں کہنیاں میز دھرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی پشت ملا کر ان پر ٹھوڑی جمائی۔ اس نے ڈاکٹر شمس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی سکون سے کہا۔

"ریپوٹیشن بچانے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ ڈاکٹر یاور سرِ عام معافی مانگیں، اپنی غلطی تسلیم کریں اور اس مریض کے ٹرانسپلانٹ کا پورا خرچہ وہ خود اٹھائیں۔ سچائی سے بھی ساکھ بنتی ہے، صرف پردہ پوشی سے نہیں۔"

یہ سنتے شمس بزدار زور سے ہنسے لیکن یہ تمسخرانہ اور چبھنے والی ہنسی تھی۔

"ناممکن! یاور معافی نہیں مانگے گا۔ وہ میرا عزیز دوست ہے۔ تمہیں بس ایک سائن ہی تو کرنا ہے۔"

نجف نے فائل بند کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ "ایسا نہیں ہوگا۔"

" کیوں نہیں ہوگا؟" ان کے تاثرات بگڑے۔

"یہ میرے اصولوں اور ہسپتال کے وقار کے خلاف ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے نجف؟ تم ان حالات میں اصول لیے بیٹھی ہو؟ تم جانتی ہو میڈیا کسی پاگل کتے کی طرح یہاں کے چکر کاٹتا ہے۔ انہیں بزداروں کے خلاف کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ تم کیوں ساکھ داؤ پر لگا رہی ہو۔"

"مُجھے فرق نہیں پڑتا۔" وہ ابھی بھی پرسکون تھی۔ کانوں میں چمکتے سونے کے ٹاپس چھت سے لٹکتے برقی قمقموں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ ڈاکٹر شمس نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔

"تم بھول رہی ہو اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں..." اس بار انکا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"شاید آپ بھول رہے ہیں۔ اس وقت چار سو کے قریب نرسنگ اور پیرا میڈیکل اسٹاف میرے ڈیپارٹمنٹ کے تحت کام کرتا ہے۔ یہ لوگ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔"
نجف کا لہجہ بالکل سپاٹ مگر خطرناک ہوا۔

"اگر اس بے گناہ نرس کو نکالا گیا تو میرا ایک اشارہ کافی ہوگا۔ چار سو کا اسٹاف ابھی اسی وقت ہڑتال پر چلا جائے گا۔ کل صبح جب بزدار ہسپتال میں ایک وارڈ بوائے بھی کام پر نہیں ہوگا تب آپ کی ریپوٹیشن کا جنازہ پورے شہر کے سامنے نکلے گا۔"

ڈاکٹر شمس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "تم... تم مُجھے بلیک میل کر رہی ہو؟" انہیں شاید اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"نہیں، میں صرف انصاف کی بات کر رہی ہوں۔" نجف اٹھی اور اپنا سٹیتھوسکوپ درست کیا۔ "اور ہاں ڈاکٹر یاور کا معافی نامہ کل صبح میرے ڈیسک پر ہونا چاہیے ورنہ کل ہسپتال نہیں کھلے گا۔"

وہ اسی سکون سے مٹی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز شمس کے اعصاب پر ایک ہتھوڑے کی طرح لگی۔ ڈاکٹر شمس بزدار نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس وقت انہوں نے شدت سے خواہش کی تھی۔

"اللہ کسی عورت کو مرد کے برابر کا عہدہ نہ دے اور وہ عورت سوتیلی بہن تو ہرگز نہ ہو!"

نجف کے جانے کے بعد ڈاکٹر شمس بزدار کے دفتر میں جو سناٹا چھایا تھا، اسے میز پر پڑے موبائل فون کی تیز وائبریٹ نے توڑ دیا۔ اسکرین پر نشاط کا نام چمک رہا تھا۔ شمس نے ایک گہری سانس لے کر کال ریسیو کی۔

"اس نے سائن کر دیے؟" سلام دعا کی تکلفات سے بے نیاز، نشاط کی آواز میں ایک بے چین تڑپ تھی۔

شمس نے دانت بھینچتے ہوئے سامنے بند دروازے کو دیکھا جہاں سے نجف ابھی ابھی نکلی تھی۔ "نہیں۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہے بلکہ مُجھے الٹا بلیک میل کر کے گئی ہے۔"

" کیا مطلب شمس بھائی؟ آپ ایڈمن کے ہیڈ ہیں۔ کیا ایک لڑکی آپ پر بھاری پڑ رہی ہے؟" نشاط کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"وہ صرف ایک لڑکی نہیں ہے نشاط، وہ چیف میڈیکل آفیسر ہے۔" شمس نے بیزاری سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ "اس ہسپتال کا پورا کلینیکل آپریشن، چار سو سے زائد کا نرسنگ اسٹاف اور ہر جونیئر ڈاکٹر کی وفاداری اس کی مٹھی میں ہے۔ اگر میں اسے مجبور کرتا ہوں تو وہ ایک منٹ میں پورا ہسپتال جام کر دے گی۔"

ان کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی اور سر درد الگ ہو گیا۔

"اب ہم نجف کے ایک سائن کے لیے یوں ذلیل ہوں گے؟" فون کی دوسری جانب نشاط نے دانت کچکچائے۔

"بالکل! ہم صرف ایک سائن کے لیے اس کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں کیونکہ ہسپتال کے قانون کے مطابق، سی ایم او (چیف میڈیکل آفیسر) کے سائن کے بغیر نہ تو کسی ڈاکٹر کے خلاف رپورٹ فائل ہو سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے شو کے لیے کسی مریض کا ڈسچارج لیٹر جاری ہو سکتا ہے۔"

"تو آپ لوگوں سے کس نے کہا تھا کہ ایک پچاس سالہ تجربہ کار سینئر CMO کے جانے پر ایک اکتیس سالہ عورت کو چیف میڈیکل آفیسر بنا دیں؟ وہ بھی ایک ایسی عورت کو جو جذبات اور اصولوں کی مالا جپتی پھرتی ہے۔"

نشاط کی بات سنتے ہی، شمس کے چہرے پر پچھتاوے کی لہر واضح تھی۔انہوں نے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کو صاف کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا، "میں نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ وہ ہماری 'اپنی' ہے۔سوتیلی ہی سہی لیکن چھوٹی بہن ہے۔مُجھے لگا تھا کہ اسے اس کرسی پر بٹھا کر میں جب چاہوں اسے اپنے فیور میں استعمال کرسکوں گا...وہ میرے اشاروں پر چلے گی۔پر مُجھے نہیں پتا تھا کہ وہ اس قدر بدل چکی ہے۔"

نجف کو پاکستان واپس آئے ایک سال ہو چکا تھا مگر ان بارہ مہینوں میں اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بزدار ہوتے ہوئے کسی دوسرے بزدار کی کٹھ پتلی نہیں بنے گی۔

"خیر اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" نشاط کی پرسوچ سی آواز گونجی۔

"تو اب میں کیا کروں؟ وہ نرسنگ اسٹاف کی ہڑتال کی دھمکی دے کر گئی ہے۔" شمس کی آواز میں بےبسی جھلک رہی تھی۔انہوں نے شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول دیئے۔پریشر بڑھ گیا تھا۔

نشاط نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا، "ایک ہی راستہ ہے۔حق سے بات کریں۔"

"پاگل ہوگئی ہو؟ یعنی ہم اس کے بنا کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا سوچے گا وہ..."

"یہ تو سچ ہے اور گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" لوگوں کو کب، کہاں اور کیسے استعمال کرنا تھا یہ نشاط بزدار سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ڈاکٹر شمس سوچ میں پڑ گئے۔

"وہ بزدار ہسپتال کا چہرہ ہے، اس کی پہچان ہے۔اپنی ریپوٹیشن کے لیے وہ جان بھی دے سکتا ہے..." وہ ایک ثانیے کے لیے خاموش ہوئی۔ "اور ضرورت پڑے تو جان لے بھی سکتا ہے۔"

"نجف اپنے اصولوں پر کھڑی ہے تو حق اصول بدلنا جانتا ہے بس اسے بتائیں کہ کیا معاملات چل رہے ہیں باقی اس پر چھوڑ دیں۔"

بات تو ٹھیک تھی۔شمس نے کنپٹی کی پھڑ پھڑاتی رگ پہ انگلی رکھی۔

" کرتا ہوں کچھ..."

بنا نشاط کا جواب سنے انہوں نے فون بند کر دیا مگر اس کا دل اب بھی ہول رہا تھا۔انہیں معلوم تھا کہ حق کو اس معاملے میں لانے کا مطلب، ایک بار پھر اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارنا تھا۔امجد بزدار کے بیٹے کو اپنے معمولات سدھارنے کے اپنے بھتیجے کی مدد لینی پڑتی تھی۔اس سے بڑی ذلت کیا ہو سکتی تھی؟

"لعنت ہے..." یہ سوچتے ہوئے انہوں نے جانے کس کس چیز پہ لعنت بھیجی اور ایک بار پھر فائل کھولی جس کے اندر لگے کاغذات پر دستخط کا خالی خانہ انکا منہ چڑا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کی سیاہی جب گہری ہو کر شبگیر ہاؤس کے در و دیوار پر جم سی گئی تب باہر گیٹ کھلنے کی بھاری آواز آئی۔سقراط کے کندھے پر ہاکی اسٹک لٹک رہی تھی اور قدموں میں ایک عجیب سی بے نیازی تھی۔وہ خاموشی سے پورچ عبور کر کے صحن سے گزرتے ہوئے داخل ہوا۔اس کا ارادہ خاموشی سے اپنے اوپر جانے کا تھا مگر جیسے ہی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، عین اس کے پیچھے ڈائننگ ہال کی زرد بتی روشن ہوئی اور ایک جانی پہچانی آواز نے اسے وہیں منجمد کر دیا۔

" آ گئے غنڈہ گردی کر کے؟"

سقراط کے قدم رک گئے مگر وہ مڑا نہیں۔اس نے ایک گہری سانس لی اور کندھے سے ہاکی اتار کر سیڑھیوں کے ساتھ ہی ٹیک لگا کر چھوڑ دی۔وہ سرمد صاحب کا احترام دل سے کرتا تھا مگر ان کے رعب سے تھر تھر کانپنا اس کی جبلت میں نہیں تھا۔
وہ آہستہ سے مڑا۔سامنے سرمد صاحب کھڑے تھے، سادہ سوٹ میں، آنکھوں میں غصہ اور چہرے پر بیزاری۔

"مُجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم نہ کوئی کام دھندا کرتے ہو، نہ کسی ذمہ داری کا احساس ہے... پھر آخر رات گئے تک آوارہ گردی کیوں کرتے ہو؟" سرمد صاحب چند قدم آگے بڑھے۔" کوئی نئی سزا کاٹنی ہے کیا؟ یا پچھلی بار کی ذلت کافی نہیں؟"

سقراط کے لبوں پر ایک زہریلی، سرد سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے گہری سانس لیتے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اپنے بالوں کے ڈھیلے پڑ چکے اس half bun کو کسا۔

"میں اپنی سزائیں کاٹ چکا ہوں، اب تو بانٹنے آیا ہوں۔"

اس کے لہجے پر سرمد صاحب پل بھر کو ساکت ہو گئے۔ وہ اپنے سامنے کھڑے اس قد آور، چوڑے بدن والے چھوٹے بھائی کو دیکھ رہے تھے جس کی پیشانی پر بغاوت جلی حروف میں لکھی تھی۔ وہ سقراط جو کبھی ان کی انگلی تھام کر چلتا تھا، اب ایک ایسا معمہ بن چکا تھا جسے سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی الجھن چھپانے کے لیے لہجہ بدلا۔

" بکواس بند کرو۔ کل صبح ٹھیک نو بجے فیکٹری پہنچ جانا، مُجھے کچھ نئے کنٹریکٹس پر تمہاری ضرورت ہے۔"

وہ بنا اسکا جواب سنے مڑ گئے۔ آج کل فیکٹری میں کچھ ورکرز بہت تنگ کر رہے تھے۔ سرمد صاحب نرم دل آدمی تھے۔ ایسے ورکرز کو سدھارنے کے لیے انہیں سقراط جیسے شخص کی ضرورت تھی بلکہ اس کے ڈنڈے (ہاکی) کی۔

"میں صبح صبح نہیں آ سکتا۔ مُجھے جاب مل گئی ہے۔ کل سے قادری کالج جوائن کر رہا ہوں۔"

سرمد صاحب بجلی کی تیزی سے مڑے، ان کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کا سمندر تھا۔" جاب؟ قادری کالج میں؟ تمہیں وہاں جاب کس نے دی؟"

یہ سوال اتنا برجستہ اور کاٹ دار تھا کہ سقراط کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے شدید درد کا سایہ لہرایا۔ وہ تکلیف جو برسوں سے اس کے اندر دبی ہوئی تھی، ایک پل کو اس کی آنکھوں میں ابھری مگر اس نے فوراً ہی اسے ایک تمسخرانہ مسکراہٹ کے نقاب کے پیچھے چھپا لیا۔

سرمد صاحب کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔"میرا مطلب ہے کہ اتنی آسانی سے..."

"ہاں، میں نے یہ جاب ڈنڈے کے زور پر لی ہے۔" سقراط نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔اس کی آنکھیں اب جل رہی تھیں۔"اور کچھ پوچھنا ہے؟"

سرمد صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔وہ اپنے سقراط کی آنکھوں میں سلگتی اس آگ کو دیکھ رہے تھے اور ان کے پیچھے چھپا درد؟ کیا وہ محسوس کر سکتے تھے؟ اس سے پہلے وہ مزید کچھ سخت سست کہتے اچانک عقب سے ابھرنے والی آواز نے ان کے الفاظ روک لیے۔

"ابو؟ چاچو؟ اتنی رات گئے کیا ہو رہا ہے؟" سرمد صاحب کے عین پیچھے نیمل مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔گھر کی بڑی بیٹی! اور گھر کے مردوں پر فرض تھا کہ بحث ترک کر دی جائے۔

" کچھ نہیں وہ بس..." نیمل کا مان کچھ ایسا ہی تھا کہ سرمد صاحب کا لہجہ یکسر بدل گیا۔اپنی بڑی بیٹی کے سامنے بحث کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

" آپ لوگ جانتے ہیں دادی کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔مشکل سے ان کی آنکھ لگی ہے اور آپ لوگ اس پہر گھر سمیت پورے محلے کو سنا رہے ہیں؟ آپ لوگوں کی وجہ سے کسی دن ان کا بی پی شوٹ کر جائے گا۔" کھلے ٹراؤزر پر لمبی قمیص پہنے اور شال کو کندھوں کے گرد لپیٹے وہ اب سرمد صاحب کے قریب کھڑی تھی۔لمبے بال ڈھیلے جوڑے میں قید تھے۔

" نہیں میں جا ہی رہا ہوں تم اپنے چہیتے چاچو کو سمجھا لو۔" وہ نظریں چراتے ہوئے پلٹ گئے۔نیمل نے ان کے جانے پر تنبیہ نظروں سے سقراط کو دیکھا۔ان آنکھوں میں صاف صاف لکھا تھا۔

" آخر کب تک؟" مگر سقراط کا جواب دینے کا ارادہ نہیں تھا۔اس نے بس کندھے اچکا دیے۔

" کل بات کرتے ہیں۔" وہ آنکھوں سے تنبیہہ کرتی پلٹ گئی اور اندھیرے لاؤنج میں گم ہوگئی۔سقراط وہیں ساکت کھڑا رہا۔ہال کی وہ زرد

روشنی اب اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ اس کا وجود ایک ایسی ان دیکھی تپش میں جل رہا تھا جس کا علاج کسی دوا کے پاس نہیں تھا۔ اس نے ہاکی وہیں پڑی رہنے دی اور اپنے سسکتے ہوئے دل پر قدم رکھتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جیسے ہی اس نے سیڑھیوں کا آخری پائیدان طے کیا، لاؤنج کی مدھم روشنی میں اسے ایک سایہ تیزی سے ٹہلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سلال تھا، جس کی بے چینی اس کے قدموں کی رفتار سے عیاں تھی۔

" کیا چاچو یار! ٹائم دیکھا ہے آپ نے؟" سلال اس کے قریب آتے ہی گویا پھٹ پڑا، "میں نے میسج بھی کیا تھا کہ پاپا نیچے غصے میں بیٹھے ہیں، آپ نے ریپلائی تک نہیں کیا۔"

سقراط کے چہرے پر تھکن تو تھی مگر تیور اب بھی وہی لاپروائی والے تھے۔ اس نے جیب سے اپنا ڈیڈ فون نکالا اور خاموشی سے لاؤنج کے اسی کونے میں جا کر چارجر پر لگا دیا جہاں سلال کا فون پہلے سے چارج پہ موجود تھا۔ اسکا اتارتے ہوئے اس نے بے نیازی سے اپنا فون لگا دیا۔ سلال کا فون جائے چولہے میں۔

"بیٹری ختم ہوگئی تھی۔" مختصراً جواب دیا۔ سلال نے ایک گہری سانس لیتے خود پر ضبط کیا۔

"واللہ! چاچو ایک فون چارج نہیں ہوتا آپ سے؟ سقراط صاحب کے فون کی بیٹری کبھی دو تین پرسنٹ سے اوپر جائے گی بھی یا نہیں؟"

سقراط نے اس کی خفگی کا برا نہیں مانا۔ پچھلے چھ ماہ سے (جب سے وہ واپس آیا تھا) اس کا ٹھکانہ اوپر والا یہی حصہ تھا جہاں سلال سالوں سے اکیلا رہ رہا تھا۔ اسے اپنی میڈیکل کی پڑھائی کے لیے خاموشی اور تنہائی چاہیے تھی، اس لیے سرمد صاحب نے اسے اوپر (سقراط کے پورشن میں) شفٹ کر دیا تھا۔ سقراط کی واپسی پر سلال کی روٹین تو نہیں بدلی مگر اسے ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا جو اس کے باپ سے زیادہ اس کا دوست تھا۔ اگرچہ سقراط زیادہ تر وقت غائب رہتا اور واپسی پر اپنے کمرے میں مقید ہو جاتا مگر سلال اس کی موجودگی کو کسی ڈھال کی طرح محسوس کرتا تھا۔ سقراط نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ! لاؤنج تو بڑا صاف ستھرا نظر آ رہا ہے۔"

"آج ہی صفائی کروائی ہے لیکن آپ میری باتیں مت ٹالیں چاچو! ابھی نیچے آپ نے پاپا سے کیا کہا؟ آپ نے قادری کالج جوائن کر لیا ہے؟ ایز اے سپورٹس کوچ؟ کیوں؟" سفید پورے بازوؤں والی سویٹ شرٹ پہنے صوفے کے پاس کھڑا سلال ذرا سختی سے بولا۔ سقراط نے

اپنی پشت سیدھی کی اور پہلی بار سنجیدگی سے سلال کو دیکھا۔ تیئس سالہ سلال جو اس وقت فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا، اپنے باپ سے زیادہ سقراط کے نقش و نگار پر گیا تھا۔ وہی چوڑی پیشانی، وہی ذہین آنکھیں اور دوسروں کی فکر کرنے والی عادت...وہ سامنے کھڑے سقراط کی آج سے دس سال پہلے والی کاپی تھا۔ سقراط کے اندر کہیں ایک نرم لہر دوڑی، اسے اس لڑکے پر بے اختیار پیار آ گیا۔

اس نے آگے بڑھ کر سلال کا گال تھپتھپایا، "تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو، یہ بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔"

سلال نے فوراً اپنی گال پر رکھا سقراط کا ہاتھ تھام لیا، جیسے اسے جانے سے روکنا چاہتا ہو۔

"میں تو ہمیشہ ہی دھیان دیتا ہوں چاچو، مگر آپ...آپ کی فکر ہوتی ہے۔"

سقراط نے اپنا ہاتھ نرمی سے چھڑایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ "مُجھے کچھ نہیں ہوگا، بےفکر رہو۔"

"پر چاچو..." سلال کی آواز میں بےبسی تھی۔

سقراط کے قدم رک گئے۔ وہ مڑا اور اس بار اس کا لہجہ ذرا کرخت تھا۔

"تمہیں یہاں رہنا ہے یا سامان نیچے پھینکوں؟" وہ اسکا باپ کیوں بن رہا تھا؟ حد ہوگئی بھئی۔ سقراط ایک بات بار بار دہرانے کا عادی نہیں تھا اور سلال یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا مگر جیسے ہی سقراط نے اپنے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا، سلال کی ایک دبی سی آواز آئی۔

"آپ ان سے دور رہیں...پلیز!"

دروازے کی ناب پر رکھا سقراط کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"کن سے؟"

"بزداروں سے..." سلال بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

سقراط کے لبوں پر تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔اس نے پورا مڑ کر اپنے بھتیجے کو دیکھا جو اس کے لیے ڈھال بننا چاہ رہا تھا۔

"فی الوقت تم ان کے سب سے زیادہ قریب ہو، سلال سرمد شبگیر صاحب! تو احتیاط تمہیں کرنی چاہیے اور میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"میرا ان کی کسی لڑکی کے ساتھ ایسا ویسا کوئی سین نہیں ہے، میں کافی محتاط ہوں۔" سلال نے فوراً دفاعی انداز اپنایا۔

"اچھا..."

سقراط نے کمرے میں داخل ہوتے 'اچھا' کو طویل کھینچا۔ دروازے میں کھڑے ہوتے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"وہ لوگ سین بنانے میں زیادہ وقت نہیں لیتے۔ ان کے علاقے میں سانس بھی ماسک لگا کر لینا چاہیے۔" وہ سلال کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"دھیان سے سلال شبگیر... بہت دھیان سے!"

اس نے ایک آخری نرم مگر پُر معنی نظر اپنے بھتیجے پر ڈالی اور دروازہ بند کر لیا۔ باہر لاؤنج میں اب صرف خاموشی تھی اور صوفے پر بکھری ہوئی سلال کی میڈیکل کی کتابیں۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی مگر لفظ دھندلا رہے تھے۔ اسے کل کے رزلٹ کی فکر ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ سقراط کی۔ کلاس گروپ کی چیٹ میں جو زہر اگلنا شروع ہو چکا تھا، وہ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ پھر سے فرسٹ آ گیا (جو کہ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا) تو عالیہ بزدار کی نفرت کی آگ مزید بڑھ جائے گی اور بزداروں کی نفرت سہنا جگر والے کا کام تھا۔

☆☆☆☆☆

کمرے کی میں داخل ہوتے ہی سقراط نے گویا خود پر چڑھا ہوا وہ لاپروائی کا خول اتار پھینکا۔ اس نے سر کے پیچھے آدھے جوڑے میں

جکڑے اپنے بال کھول دیے۔اس کے بال اس کے کان سے ذرا نیچے گردن کو چھونے لگے۔جن کا رنگ سلال کے بالوں جیسا جیسا تھا۔ اس نے اپنے جوگرز اتار کر پھینکے۔وہ شدید تھکا ہوا لگ رہا تھا مگر یہ تھکن جسمانی نہیں تھی کچھ سوچتے ہوئے وہ الماری کی جانب بڑھا۔اسکا پٹ کھولتے وہاں رکھے اپنے پرانے شولڈر بیگ کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی چیز نکالی۔ایک لاکٹ! بیڈ پر بیٹھتے جیسے اس کی انگلیوں کی پوروں نے لاکٹ کا کلپ کھولا۔وہ دو حصوں میں بٹ گیا،اندر سے ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کا چہرہ برآمد ہوا۔شہد رنگ بال، روشن آنکھیں اور ایک ایسی مسکراہٹ جو کسی کی بھی دنیا روشن کر دے۔سقراط اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔یادوں کا وہ بند دروازہ جو اس نے بڑی مشکل سے بند کیا تھا، آج پھر ٹوٹ گیا۔

”سقراط شبگیر ایک Rapist ہے!“ ایک کرخت آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”سقراط شبگیر،تم مر جاؤ! تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں!“

دس سال پہلے کی وہ منحوس دوپہر، جب بادلوں نے سورج کو نگل لیا تھا اور آسمان سے برستی موسلا دھار بارش سقراط کے گناہوں کو نہیں بلکہ اس کی بے گناہی کے ثبوتوں کو دھو رہی تھی۔عدالت نے فیصلہ سنا دیا تھا۔دو سال قیدِ بامشقت! پولیس والے اسے ہتھکڑیوں میں جکڑے جب کوریڈور سے باہر لائے تو باہر میڈیا کا ایک ہجوم اور تماشائیوں کا سمندر تھا جو ایک ’درندے‘ کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔موسلا دھار بارش میں پولیس کی گاڑی تک کا وہ چند قدم کا راستہ سقراط کے لیے پل صراط بن گیا تھا۔تبھی ہجوم کو چیرتی ہوئی وہ سامنے آئی...وہ روشنیوں سے بھری ہوئی لڑکی۔بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔سرخ آنکھیں اور چہرے پر کرب سے زیادہ نفرت کا وہ طوفان جسے دیکھ کر سقراط کے قدم جم گئے۔اس نے ایک پل کو سوچا تھا وہ اسے بچانے آئے گی، وہ کہے گی کہ یہ سب جھوٹ ہے، وہ اسکا یقین کرے گی مگر اس نے قدم آگے بڑھایا اور میڈیا کے کیمروں کی فلیش لائٹس کے سامنے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر جڑ گیا۔

”تم مر کیوں نہیں گئے سقراط شبگیر؟“ اس کی آواز بارش کے شور کو چیرتی ہوئی سقراط کے دل میں پیوست ہوئی۔

سقراط نے لرزتے لبوں سے اسے دیکھنا چاہا، ”میں نے کچھ نہیں کیا، میں بے گناہ ہوں...یہ...یہ سب جھوٹ ہے۔“

” بکواس بند کرو،تم جھوٹے ہو،تمہارا وجود ہی جھوٹا ہے۔“ وہ ہیجانی انداز میں چلائی۔گردن کی نسیں ابھر آئیں اور اس کے لفظوں فضا میں زہر گھول دیا۔اس نے سقراط کی ہتھکڑیوں میں جکڑی کلائیوں کو اپنی نفرت بھری نظروں سے جلا کر راکھ کر دیا۔

"تم ایک ریپسٹ ہو، ایک درندے ہو! کاش میں تم سے کبھی نہ ملی ہوتی۔"

میڈیا کے نمائندے پاگلوں کی طرح اس منظر کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ مائیک لڑکی کے منہ کے قریب تھے اور کیمرے اس کی ذلت کے ایک ایک پل کو محفوظ کر رہے تھے۔

"تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے سقراط! کاش کہ آج تم اس جیل جانے کے بجائے قبر میں جا رہے ہوتے۔ تم میرے لیے مر چکے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم تڑپ تڑپ کر مرو!"

بارش میں اس تڑپتی سلگتی لڑکی کے یہ الفاظ کسی نوکیلے خنجر کی طرح سقراط کے سینے کے آر پار ہوئے تھے۔ اس دن سقراط جیل جانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ اسی بارش میں، انہی کیمروں کے سامنے، اس کا ضمیر، اس کی محبت اور اس کی ہستی خاک میں مل گئی۔ سقراط کے گلے میں کچھ سخت سا آ کر اٹک گیا۔ سانس لینا محال ہونے لگا۔ آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

"ایسے درندوں کو... ایسے زانیوں کو سرِ عام پھانسی ہونی چاہیے!"

اسے ہتھکڑیوں میں جکڑ کر لے جایا جا رہا تھا۔ لوگ اس کے چہرے پر تھوکنا چاہتے تھے۔ گالیاں، غلاظت اور پھر وہ ایک پتھر... جو پوری رفتار سے آ کر اس کی پیشانی پر لگا۔ خون ابل پڑا۔ تکلیف کا احساس اتنا شدید ہوا کہ سقراط کا ہاتھ بے اختیار اپنی پیشانی کے اس حصے پر گیا جہاں اب خون تو نہیں تھا مگر ایک مدھم سا نشان آج بھی اس کی بے گناہی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"آج اس نے ایک پر اٹیک کیا ہے، کل کسی اور کا فائدہ اٹھائے گا..."

آوازیں اب اس کے دماغ کے اندر چیخیں بن گئیں۔ اس کا پورا وجود جل اٹھا۔ وہ اوندھے منہ بیڈ پر گرا اور اپنا چہرہ تکیے میں دھنسا لیا تا کہ آوازوں سے پیچھا چھڑا سکے۔ اس کے ہاتھ سے وہ لاکٹ چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔

"تمہیں اپنے کہے، ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہو گا نجف بزدار صاحبہ!"

سزائیں کاٹنے والا اب سزائیں باٹنے آیا تھا اور سزا کے مستحقوں میں سرفہرست نجف بزدار تھی۔

☆☆☆☆☆

بزدار پیلس کے سنہری سنگِ مرمر سے تراشے گئے درود...

بزدار پیلس کے سنہری سنگِ مرمر سے تراشے گئے درودیوار رات کی خاموشی میں دودھیا روشنی سے نہائے ہوئے تھے مگر یہ محل کی خوبصورتی نہیں بلکہ اس کی وسعت تھی جو انسان کو تنہائی کا احساس دلاتی تھی۔اس گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ جیسے دو الگ بستیاں ہوں، سوائے اوپر کی منزل کے اس خاص حصے کے جہاں حق کا کمرہ اور اس کے بیٹے کامل کی خواب گاہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔کامل کی خواب گاہ میں مدھم نیلی لائٹ روشن تھی۔حق اس وقت بستر کے کنارے بیٹھے کامل کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو نہایت کوملیت سے پیچھے کر رہا تھا۔اس کی نظروں میں وہ تمام مہر و محبت سمٹ آئی تھی جو اس نے شاید پوری دنیا سے چھپا رکھی تھی۔پاس ہی کھڑی ادھیڑ عمر آیا (نینی) جو برسوں سے اس خاندان کی خدمت کر رہی تھیں، حق کے اس روپ کو دیکھ کر اکثر حیران رہ جاتی۔حق بزدار کی تمام تر محبتیں اپنے بیٹے کے لیے تھیں۔

"آج اس نے دودھ پورا پیا تھا؟" حق نے آواز کو انتہائی دھیما رکھتے ہوئے پوچھا، جیسے اونچی آواز سے اس معصوم کی نیند میں خلل پڑ جائے گا۔

"جی سر، کامل بابا نے دودھ پی لیا تھا اور دوائی بھی لے لی تھی۔" آیا نے مؤدبانہ جواب دیا۔حق نے توجہ سے سنتے ہوئے کامل کے چھوٹے سے ہاتھ کی پشت کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لیا اور اسے لبوں سے لگایا۔کتنی ہی دیر لگائے رکھا۔

"رات کو اگر یہ ذرا سا بھی بے چین ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینی ہے۔کمرے کا درجہ حرارت 24 ڈگری سے نیچے نہیں جانا چاہیے۔"

حق کی ہدایات میں ایک ڈاکٹر کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ ایک باپ کی فکر بھی شامل تھی۔اس نے ایک آخری بار کامل کے پرسکون چہرے کو دیکھا، جیسے وہ اپنی تمام تر دن بھر کی تھکن اس معصوم کو دیکھ کر اتار رہا ہو۔

"جی سر، سب ٹھیک ہے۔آپ بے فکر ہو کر آرام کریں۔" آیا نے یقین دہانی کرائی۔

حق نے سر ہلایا، بیڈ کی چادر کو ایک بار پھر درست کیا اور دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا۔جیسے ہی بھاری لکڑی کا دروازہ اس کے پیچھے بند ہوا، اس کے چہرے پر سنجیدگی واپس آ گئی۔راہداری لمبی تھی البتہ اس کے کمرے تک کا یہ فاصلہ صرف چند قدموں کا تھا۔وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا، کمرے میں ہر چیز نفاست سے رکھی تھی۔اس نے آئینے کی طرف قدم بڑھائے، ابھی اس نے اپنے بالوں کو ہاتھ لگایا ہی تھا

کہ ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا اور سلویٰ باہر نکلی۔ وہ نہایت خوبصورت، سلم سمارٹ اور سحر انگیز لگ رہی تھی۔ اس کا ہیئر اسٹائل تازہ تھا اور سیاہ ریشمی بال اس کے گورے چہرے کے گرد ایک ہالہ بنا رہے تھے مگر جیسے ہی اس کی نظر آئینے کے سامنے کھڑے حق پر پڑی، اس کے چہرے کی تمام تر شگفتگی یکسر غائب ہوگئی۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی حق کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ آئینے میں ان دونوں کا سراپا ایک مکمل تصویر پیش کر رہا تھا۔ سلویٰ اس کے چوڑے کندھے تک آتی تھی۔ ایک تیکھے نقش ونگار والا باوقار مرد اور ایک نزاکت بھری عورت۔ دونوں ساتھ کھڑے بے حد جچ رہے تھے مگر آئینے کی اس حقیقت کے پیچھے برسوں کا وہ فاصلہ تھا جسے کوئی پل پار نہیں کر سکا تھا۔ حق نے اپنے نائٹ سوٹ کے گلے کا بٹن بند کرتے ہوئے آئینے میں ہی اس کے عکس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اس کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

"پھر کیا سوچا تم نے؟" سلویٰ کی آواز میں عجیب سی بیزاری تھی۔

" کس بارے میں؟" اس نے بغیر مڑے، لاپروائی سے پوچھا۔ اس کے انجان بننے پر سلویٰ کی تیوری چڑھ گئی۔

"میں تمہارے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی، حق!"

حق نے آئینے سے نظریں ہٹا کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی حیرت نہیں بلکہ ایک سرد مہری تھی۔ " کیوں؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟"

وہ ایک قدم بڑھا کر اس کے اتنے قریب ہوا کہ سلویٰ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس قربت پہ پگھل جاتی مگر اب اس شخص کا وجود فضا سے ساری آکسیجن کھینچ لیتا تھا۔ سلویٰ نے شکوہ کناں نظروں سے حق کے پتھریلے چہرے کو دیکھا۔

"تم میں کوئی کمی نہیں ہے حق!" وہ لفظوں کو چباتے ہوئے بولی۔ "تم میں تو ہر چیز کی زیادتی ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ کامیاب ہو، ضرورت سے زیادہ ذہین ہو اور ضرورت سے زیادہ... بے حس ہو۔"

حق نے اس کا طنزیہ وار سہتے ہوئے ایک طویل سانس لی جیسے اپنا ضبط برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "تم میری زندگی مشکل کیوں کر رہی ہو سلویٰ؟" اس بار اس کے لہجے میں بھی سنجیدہ تھکن تھی۔

"میں مشکل کر رہی ہوں؟" سلویٰ کی آواز تیز ہوئی۔ "میں تو ہم دونوں کی زندگی آسان کرنا چاہتی ہوں۔ مُجھے خلع چاہیے حق! مُجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا، بس!"

کمرے میں بھیانک خاموشی چھا گئی۔ حق اس پر نظریں جمائے کھڑا رہا، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"اس گھر میں، اس زندگی میں کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟"

"محبت کی! جینے کے احساس کی!" وہ برجستہ بولی۔ آواز اونچی تھی مگر کمرے کی ساؤنڈ پروف دیواروں سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

"تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ تم نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔"

یہ سنتے ہی حق کے تاثرات مزید تن گئے۔ اس نے جھپٹ کر سلویٰ کی کہنی پکڑی اور اسے اپنی طرف کھینچا۔

We have a baby, you idiot!

"اور کیسی محبت چاہیے تمہیں؟"

سلویٰ کا چہرہ پہلے خفت اور پھر دکھ سے سرخ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، مگر وہ پیچھے نہیں ہٹی۔

"تمہیں کیا پتا محبت کیا ہوتی ہے؟" اس نے خود کو چھڑانا چاہا۔ اس کی آواز اب لرز رہی تھی۔ "تمہیں کیا پتا کہ جب کوئی کسی کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ تمہیں کیا پتا کہ محبوب کی بے رخی کیا

ہوتی ہے اور اس کا لمس نہ ملنے پر روح کیسے سسکتی ہے؟ تم نے تو اپنے گرد پتھر کی دیواریں چن لی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تم نے مُجھے جائیداد سمجھ کر اپنایا تھا، شریکِ حیات سمجھ کر نہیں۔"

اس کی بھرپور کوشش کے باوجود حق نے اس کی کہنی نہیں چھوڑی بلکہ اس کی گرفت سلویٰ کی کہنی پر مزید سخت ہو گئی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا مگر اس کی نظروں میں موجود خلا بتا رہا تھا کہ سلویٰ کے یہ الفاظ اس کے دل تک نہیں پہنچ رہے تھے یا شاید وہاں پہنچنے کا راستہ برسوں پہلے بند ہو چکا تھا۔

"تم جانتی ہو اس سب کا کامل پر کیا اثر ہو گا؟" اس کی آواز میں اب ایک باپ کی تنبیہ تھی۔ فکر تھی۔ وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے معصوم بچے کو تڑپانا نہیں چاہتا تھا۔

"تمہیں صرف کامل کی نہیں بلکہ اپنی انا اور اپنی حرمت کی پرواہ ہے۔" اس بار سلویٰ مچلتے ہوئے اس کی گرفت سے اپنی کہانی چھڑانے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔

"تم ایک اچھے باپ ہو سکتے ہو مگر تم ایک اچھے شوہر ہرگز نہیں ہو۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ مُجھے کیا پسند ہے، میرا پسندیدہ رنگ کون سا ہے۔ تمہاری ان آنکھوں میں کبھی میرا عکس نہیں ابھرا، تم نے کبھی مُجھے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں..."

وہ سالوں سے دل میں چھپے شکوے باہر نکال رہی تھی جبکہ حق اسے حیرانی سے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری۔

"یہ شادی تمہاری مرضی سے ہوئی تھی سلویٰ۔ تمہیں تو مجھ سے محبت تھی نا؟ اب کیا ہوا؟"

یہ ایسا وار تھا جو سیدھا سلویٰ کے دل پر لگا۔ پانچ سال پہلے کی وہ شام اسے یاد آئی جب اس نے پہلی بار حق بزدار کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اپنی محبت اس کے نام کر دی تھی۔ مسٹر خان (سلویٰ کے والد) اور امجد بزدار کی دوستی اس رشتے کی بنیاد بنی۔ سلویٰ حسن اور ذہانت کا شاہکار تھی اور وہ خود حق سے شادی کے لیے بضد تھی جبکہ حق نے امجد بزدار کا مان رکھتے ہوئے سر جھکا دیا تھا۔ یوں بھی اسے اس شادی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سلویٰ ایک ایلیٹ کلاس لڑکی تھی، وہ محفلوں کی جان بننا جانتی تھی، وہ سلیقہ مند تھی اور سب سے بڑھ کر وہ حق پر جاں چھڑکتی تھی۔ مگر ایلیٹ کلاس نک چڑی، نخریلی سلویٰ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے صرف حق بزدار کو حاصل کیا ہے۔ وہ اس کی محبت سے محروم رہنے والی تھی۔ وہ جتنی بھی کوشش کر لیتی، حق کے لیے وہ صرف بیوی رہی۔ سلویٰ خان 'محبوب بیوی' کے عہدے تک نہ پہنچ پائی۔ جس باغ کا سلویٰ نے خواب دیکھا تھا وہ تو صحرا نکلا اور وقت کے بے رحم پہیے نے ثابت کر دیا کہ کامل کی پیدائش نے بھی ان کے درمیان کے صحرا کو گلزار میں تبدیل نہیں

کیا۔آج وہ رشتہ اس نہج پر تھا جہاں سلویٰ صرف فرار چاہتی تھی۔

"ہاں کرتی تھی میں محبت!"اس کی آنکھوں سے ایک گرم آنسو گال پر پھسل گیا۔" مگر تمہاری بے حسی کے سامنے میری محبت دم توڑ گئی۔ تمہارے اس عالیشان محل میں میرا دم گھٹتا ہے،حق! اب مُجھے آزاد کردو۔"

حق خاموشی سے اس کا سرخ چہرہ دیکھتا رہا۔اس کی نگاہیں کھوجتی ہوئی تھیں۔ایسی جو اندر تک اتر جائیں۔وہ جو جبڑے بھینچے کھڑا تھا، چند لمحوں بعد گویا ہوا۔

"تم نے مجھ سے محبت کی ہے سلویٰ...لیکن وفا؟ کیا تم نے مجھ سے وفا کی ہے؟"

یہ غیر متوقع تھا۔اس سوال پر سلویٰ کے چہرے کا رنگ یکسر فق ہوگیا۔وہ حیرت اور دہشت کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھنے لگی۔حق اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ سلویٰ اس کے سانسوں کی تپش محسوس کرسکتی تھی۔وہ شخص جس نے آج تک اس کے فون کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔جس نے کبھی پابندی نہیں لگائی تھی۔اس نے کبھی اس کے کسی کام پر اعتراض نہیں کیا تھا۔جس نے کبھی اس پر شک نہیں کیا تھا وہ ایسا سوال کررہا تھا؟ اور سلویٰ جانتی تھی جب حق بزدار سوال پر اتر آئے تو سچ بولنا فرض ہوجاتا تھا۔

"میں نے تم سے شادی کی۔کبھی کسی دوسری عورت کو نہیں دیکھا، کسی کو نہیں سوچا، کسی کی خواہش نہیں کی۔" حق کا لہجہ سرد تھا مگر اس سرد پن میں کہیں کہیں ایک تکلیف دہ آنچ تھی۔"میں جیسا بھی ہوں، میں نے تمہاری محبت کے بدلے اپنی پوری وفا تمہارے نام کردی۔کیا زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کی وفا کافی نہیں ہوتی سلویٰ؟"

اس کے سوال میں ایسی چبھن تھی جس نے سلویٰ کے لب سی دیے۔اس نے کبھی سوچا نہیں تھا حق اپنی وفا کو یوں بیچ میں لے آئے گا۔

"بولو سلویٰ..."اس کی تپتی نگاہیں سے سلوی کو اپنا آپ جھلستا محسوس ہورہا تھا۔وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔وہ آنکھیں جن پر وہ مرمٹی تھی جو سمندر جیسی نیلی اور گہری تھیں، ان میں اس وقت سلویٰ کو اپنا آپ بہت چھوٹا نظر آرہا تھا۔اس نے خود پر ضبط کیا، ہمت اکٹھی کی اور حق کو خود سے دور دھکیلا۔

"مُجھے باتوں میں نہ الجھاؤ۔مُجھے اب تمہاری وفا سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔کامل کو ہماری وجہ سے کبھی پریشانی نہیں ہوگی۔میں اس کا ہمیشہ خیال رکھوں گی مگر اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔مُجھے کل تک جواب چاہیے۔میں کورٹ نہیں جانا چاہتی اور یقیناً تم بھی ایسا نہیں چاہو گے..."

وہ ایک جتاتی نظر حق پر ڈال کر پلٹی اور تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔وہ اب آیا کو سرونٹ کوارٹر بھیج کر کامل کے ساتھ سونے والی تھی۔حق وہیں کھڑا رہ گیا۔اس کا وجود تپ رہا تھا۔اس نے جھنجھلا کر اپنی شرٹ کا وہ بٹن واپس کھول دیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بند کیا تھا۔پھر ایک لمبی اور گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنا چاہا۔اس نے واپس پلٹ کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔اس کی اپنی آنکھیں اس سے ایک ایسا سوال کررہی تھیں جس کا جواب تاریخ کے پاس بھی نہیں تھا۔

"آخر ایک عورت کو...ایک مرد کی وفا کافی کیوں نہیں ہوتی ؟"

آئینے میں نظر آنے والا حق بزدار اس وقت ٹوٹا ہوا نہیں بلکہ سنگین اور زخمی لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ہسپتال کے وی آئی پی وارڈ میں اس وقت رات کے پچھلے پہر کا سکوت طاری تھا مگر نجف کی آنکھوں میں نیند کا نام ونشان نہیں تھا۔سفید کوٹ پہنے، گلے میں اسٹیتھوسکوپ ڈالے وہ اس وقت نائٹ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز کے پینل کے ساتھ راؤنڈ پر تھی۔وہ کمرہ نمبر 204 کے سامنے رکی۔اندر وہ لڑکی زیرِ علاج تھی جو ایک ہولناک جنسی درندگی کا نشانہ بنی تھی۔جب جب وہ اسے دیکھتی تھی اسکا وجود ان دیکھی آگ میں جلنے لگتا تھا۔وہ لڑکی اسے کھینچ کر وقت کے بے رحم اور سنگین نتائج دکھانے لے جاتی تھی۔مگر اسے خود پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔اس وقت بھی اس نے فائل کھولی اور نرس سے اس کی تازہ ترین رپورٹس لیں۔

"بلڈ پریشر نارمل ہے ڈاکٹر! فزیکل زخم بھر رہے ہیں، مگر..."نرس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نجف نے بیڈ پر لیٹی صبا نامی اس لڑکی کو دیکھا جو کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔اس کی آنکھیں خالی تھیں، جیسے روح جسم چھوڑ کر کہیں دور جا چکی ہو۔کچھ سوچتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر لڑکی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ لڑکی ایک دم لرز اٹھی۔اس کا پورا وجود خوف سے کانپنے لگا۔وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔اسے یوں مچلتا دیکھ کر نجف مزید آگے ہوئی۔

"شش...میں ہوں، ڈاکٹر نجف۔کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔"اس کا نرم لہجہ اور اسکا لمس مریضہ کو پرسکون کرنے لگا۔

مگر دیکھتے ہی دیکھتے اچانک ایک پرانی، دل خراش آواز سنائی دی...ایک ایسا فلیش بیک جو دس سال گزرنے کے بعد بھی نجف کے خون میں زہر گھول دیتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے نجف! کیسا لگتا ہے جب کوئی تمہیں برے طریقے سے چھوئے؟"

وہ آواز نجف کی سماعت میں ہتھوڑے کی طرح لگی۔اس نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا اور لمبی سانس لی۔مریضہ پر ایک آخری نظر ڈالی۔ماضی کی آوازیں آج بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔پھر اس نے ذہن کو جھٹکا اور نرس کی طرف مڑی۔

"اسے سائیکاٹرک کونسلنگ کی ضرورت ہے۔اس کا ٹراما جسمانی سے زیادہ ذہنی ہے۔اسے اکیلا مت چھوڑنا۔"

ہدایات دیتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔اس کی دل کی دھڑکن معمول سے تیز تھی۔وہ تیز تیز قدم اٹھاتی تازہ ہوا کے لیے راہداری کے آخر میں نصب کھڑکی کی جانب جا رہی تھی جب اس کی نظر دوسری جانب لابی میں لگی بڑی ایل ای ڈی پر پڑی جس کی اسکرین پر ہسپتال کی تشہیری مہم چل رہی تھی، اور پھر اچانک ایک اشتہار کے جملے نے اسے ساکت کر دیا۔اسکرین پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"اور جھوٹی شہادتوں سے دل پھٹ جایا کرتے ہیں۔"

نجف کے قدم وہیں ساکت ہوئے۔ پھر سے؟ یہ جملہ اسے آج کل ہر جگہ دکھائی دیتا تھا۔سنائی دیتا تھا۔کبھی کسی کتاب کے ورق پر، کبھی سوشل میڈیا پر اور آج یہاں ہسپتال کی دیوار پہ لگی اسکرین پر۔اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غیب سے اسکا ضمیر جھنجھوڑ رہا ہو۔اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ذہنی دباؤ بڑھ گیا۔اس سے پہلے کہ نجف کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا،ایک نسوانی آواز نے اسے جیسے کھینچ کر واپس حال میں پٹخا۔

"ڈاکٹر نجف؟"

یہ وہی نرس نفیسہ تھی جس پر شمس بزدار نے غفلت کا الزام لگا کر ہسپتال سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس کی آنکھیں رو رو کر سوجھ چکی تھیں۔ ہلکے گلابی رنگ کے یونیفارم میں ۔ یہاں کا سارا نرسنگ عملہ ہلکے گلابی رنگ کے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھا۔ایک سفید دوپٹہ اس کے شانوں اور سر پہ ٹکا ہوا تھا۔وہ چالیس سالہ ایک تجربہ کار نرس تھی۔ عام سے نقوش اور گھنگھریالے بال جو پیچھے کی جانب چٹیا میں کسے ہوئے تھے۔

نجف خود پر قابو پاتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔فی الوقت اس کی آمد نے نجف بزدار کو مزید بے چین ہونے سے بچا لیا تھا۔

"نفیسہ؟تم ابھی تک یہاں ہو؟"

"ڈاکٹر میں کہاں جاؤں؟"نرس نے تڑپ کر کہا۔"ڈاکٹر شمس نے کہہ دیا ہے کہ کل صبح میرا ٹرمینیشن لیٹر تیار ہو گا اگر میں نے وہ نہیں کیا جو وہ چاہتے ہیں۔انہوں نے مجھ پر وہ الزام لگایا ہے جو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ڈاکٹر میں نے اس مریضہ کو غلط ڈوز نہیں دی۔ یہ سب مُجھے پھنسانے کے لیے کیا جا رہا ہے تاکہ وہ ڈاکٹر یاور کی غلطی میرے سر ڈال سکیں۔"

نجف نے تسلی سے اس کی بات سنی پھر گہری سانس لی اور اس زہریلی ہوا کو باہر نکالا جو کچھ دیر پہلے اس کے پھیپھڑوں میں جمع ہو گئی تھی۔خود پر قابو پانے اور خود کو پرسکون کرنے کے معاملے میں نجف بزدار کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ ڈاکٹر شمس کے کہنے سے سب کچھ ہو جائے گا؟"اس کا لہجہ اب چیف میڈیکل آفیسر والا تھا۔"اس ہسپتال کی ایڈمنسٹریشن کے سربراہ وہ ضرور ہیں مگر میڈیکل اسٹاف کی چیف میں ہوں۔میری اجازت کے بغیر یہاں ایک پرندہ بھی غائب نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن ڈاکٹر...وہ...وہ بزدار ہیں..."نرس لرزتی آواز میں بولی۔وہ کافی خوفزدہ لگتی تھی۔

"مت بھولو کہ میں بھی بزدار ہوں نفیسہ!" نجف نے اسے ٹوکا بلکہ تصحیح کی۔"اور میں یہاں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔تم کل اپنی ڈیوٹی پر آؤ گی۔اگر کسی نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تو اسے کہنا کہ ڈاکٹر نجف سے آ کر بات کرے۔جب تک میں اس کرسی پر ہوں، تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

نجف کا لہجہ اٹل اور پر اعتماد تھا۔ نرس کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن چمکی۔اتنا تو وہ جانتی تھی کہ نجف کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دے سکتی تھی پھر اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

"شکریہ ڈاکٹر...آپ کا بہت شکریہ۔"

نجف نے سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں کھڑی رہی۔ نرس نفیسہ اپنے وارڈ کی جانب بڑھ گئی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی جسکے، دو بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی زمہ داری اسی پر تھی۔ ایسے میں اگر اسے یہاں نکالا جاتا تو نہ صرف اس کی زندگی مشکل ہو جاتی بلکہ کہیں اور نوکری بھی نہ ملتی۔ نجف چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر اس نے، ایک بار پھر اس ایل ای ڈی اسکرین کی طرف دیکھا جہاں اب وہ جملہ غائب ہو چکا تھا، مگر اس کی بازگشت ابھی بھی ہوا میں تھی۔ وہ واقعی اپنی دباؤ کا شکار تھی۔ ایک جانب وہ اپنے ہی سوتیلے بھائی (ڈاکٹر شمس) سے لڑ رہی تھی تو دوسری طرف نشاط کی بے جا ضد تھی، اور تیسری طرف اسے... اپنے اس ماضی سے لڑنا تھا جہاں سچ اور جھوٹ کی سرحدیں دھندلا گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

بزدار انٹرنیشنل اسپورٹس کالج کا وسیع وعریض گراؤنڈ رات کی خاموشی میں فلڈ لائٹس کی دودھیا روشنی سے نہا رہا تھا۔ سرد موسم کی خنکی فضا میں رچی ہوئی تھی مگر گراؤنڈ کے وسط میں موجود اس بائیس سالہ نوجوان کے لیے جیسے موسم کے کوئی معنی نہیں تھے۔ ثالث بزدار، ہاتھ میں ہاکی اسٹک لیے گیند کے پیچھے کسی جنونی کی طرح بھاگ رہا تھا۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا، سفید اسپورٹس شرٹ جسم کے ساتھ چپک گئی تھی اور ماتھے پر بندھا سیاہ رومال پسینے کو آنکھوں میں جانے سے روکنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ گیند کو جس جنون سے ہٹ کر رہا تھا اس کی آواز پورے خالی اسٹیڈیم میں گونج رہی تھی۔

"بس کر جاؤ ثالث! مارو گے کیا خود کو؟" گراؤنڈ کے آخری کنارے پر بیٹھے اس کے تین دوست تھک ہار کر چور ہو چکے تھے۔ ثالث نے ان کی آواز سنی ان سنی کر دی۔ اسے اس وقت اپنے دوستوں کی آواز نہیں بلکہ وہ ایک نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی جو صبح سے اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

"تم مجھ سے دور رہا کرو، مُجھے تمہیں دیکھ کر متلی ہوتی ہے۔"

چھوٹی، تیکھی آنکھوں اور سیاہ بالوں والی وہ لڑکی... نامرہ شبگیر۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتی وہ شدید نفرت ثالث کے جنون کو ہوا دے رہی تھی۔ اس نے ہاکی کو گھمایا اور پوری طاقت سے گیند پر ہٹ لگائی۔ گیند ہوا کو چیرتی ہوئی سیدھی گول پوسٹ میں جا گری۔

"اتنی رات کو کھیل تو ایسے رہا ہے جیسے کالج اسکے باپ کا ہو۔" ایک لڑکے نے لمبی تان کر طنز کیا۔

"اس کے باپ کا ہی ہے بلکہ دادا کا۔" دوسرے نے فوراً یاددہانی کروائی۔

"اسے اولمپکس میں کھیلنا ہے تو ظاہری بات ہے اسے دن رات کی تمیز بھلا کر ہی محنت کرنی ہوگی۔" تیسرے نے لقمہ دیا، جو ثالث کے

جارحانہ انداز کو دیکھ کر تھوڑا مرعوب تھا۔ ثالث ان سب سے بے نیاز تھا۔ اس کی دنیا اس وقت صرف اس گیند اور نامرہ کی ان آنکھوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ بار بار خود سے سوال کر رہا تھا کہ کوئی اسے اس قدر ناپسند کیسے کر سکتا ہے؟ کوئی ثالث بزدار کو ناپسند کیسے کر سکتا ہے؟ وہ بھی وہ لڑکی جو خود اسے زہر لگتی تھی۔ خیر زہر تو وہ شروع سے ہی لگتی تھی مگر آج کل اس کی باتیں زیادہ بری کیوں لگ رہی تھیں؟ زیادہ ہٹ کیوں کر جاتی تھیں؟

"ویسے وہ آج کافی اپ سیٹ ہے۔ کیا یہ صبح اس لڑکی سے ہونے والی بحث کا نتیجہ ہے؟" پہلے لڑکے نے پھر سے سرگوشی کی۔

"وہ صرف لڑکی نہیں، نامرہ شبگیر ہے۔" دوسرے نے اصلاح کی۔

"تو؟" پہلے کے منہ کے زاویے بگڑے، "شبگیر ہونا اسے کوئی خاص بنا دیتا ہے؟"

تیسرا لڑکا جو تھوڑی دیر سے خاموش تھا، ہچکچاتے ہوئے بولا، "مُجھے لگتا ہے کہ..."

لیکن اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ جانے یہ بات کرنا محفوظ تھا بھی یا نہیں۔

"یہی کہ ثالث اس زومبی جیسی لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے؟" پہلے لڑکے کے بات مکمل کرنے پر باقی دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت ان کے چہروں پر عیاں تھی۔ تیسرا پہلے تو سٹپٹایا پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"جیسے وہ اسے آج دیکھ رہا تھا، کوئی اندھا بھی بتا دے گا۔"

باقی دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ ثالث کے دوست ضرور تھے مگر اس سے گھبراتے تھے۔ بزدار خاندان کا سپوت، جنونی کھلاڑی اور غصے کا تیز... ثالث بزدار وہ لڑکا تھا جو کسی کی بھی زندگی عذاب بنانے میں ہچکچاتا نہیں تھا اور اسے روکنے والا اس کالج میں کوئی نہیں تھا لیکن وہ ایسا کم کم ہی کرتا تھا۔ بہت کم... اس نے ایک بار پھر گیند کو ڈربل کیا، اس کی سانسیں تیز تھیں۔ کئی گھنٹے لگاتار کھیلنے کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے پھیپھڑوں میں اب مزید دوڑنے کی سکت نہیں رہی تو اس نے پوری قوت سے ہاکی دور پھینکی۔ تھوڑا دور لکڑی کے فرش سے ہاکی ٹکرانے کی آواز خاموش اسٹیڈیم میں کسی دھماکے کی طرح گونجی۔ وہ وہیں جھک کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہانپنے لگا۔ اسے رکتے دیکھ کر اس کے دوستوں میں سے پہلا لڑکا، تولیہ لیے فوراً اس کی جانب بھاگا۔ آدھے راستے میں ہی اس نے تولیہ ثالث کی طرف اچھالا۔ ثالث نے ہوا میں ہی اسے کیچ کیا اور اپنا پسینے سے شرابور منہ پونچھتے ہوئے ان کے قریب آ کر بنچ پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا تنفس بری طرح پھولا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور وہ تولیے سے اپنے گلے اور سینے کو رگڑ رہا تھا۔ تینوں دوستوں نے پہلے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر ثالث کو، جس کا دل اس وقت اس کے سینے کی ہڈیوں کو توڑنے کے لیے بے تاب لگ رہا تھا۔

"تم آج کل کچھ زیادہ جنونی ہو رہے ہو؟ آخر تم اس لڑکی کی باتوں کو اتنا سر پر سوار کیوں کر رہے ہو؟" صبح سبق سکھاتے ہیں اس کو..."

ثالث نے فوراً آنکھیں کھول دیں، جن کی پلکوں سے کچھ دیر پہلے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔

"آئندہ مُجھے تم تینوں میں سے کوئی بھی، اس کے آس پاس بھی نظر نہ آئے۔"

اس نے پانی کی بوتل اٹھائی اور اسے غٹاغٹ پینے لگا۔ تینوں کے چہرے حیرت سے لٹک گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک تو وہ خود اسے ذلیل

کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا، اس کے نوٹس چھپانا، فیلڈ میں اسے ذلیل کرنا، اسے جونیئرز کے سامنے ٹوکنا... پچھلے چار سالوں سے یہی تو ان کا مشغلہ تھا۔ اب اچانک یہ تبدیلی؟

"لیکن ثالث..." پہلے نے کچھ کہنا چاہا مگر ثالث کا رخ بدل چکا تھا۔

"مُجھے باتیں دہرانے کی عادت نہیں ہے، جانتے ہو نا؟" اس نے قدرے سکون سے کہتے خالی بوتل زمین پر پٹخی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تولیہ وہیں بنچ پر پھینک دیا اور اب اس کا رخ اسٹیڈیم کے خارجی راستے کی جانب تھا۔ باقی تینوں اسے جاتے دیکھا کر اٹھ کر اس کے پیچھے لپکے۔

"تو صاف کہہ دو نا کہ تم اسے پسند کرنے لگے ہو!" پیچھے سے ایک نے ذرا دبی آواز میں چھیڑا۔ ثالث نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ اسٹیڈیم سے باہر نکل کر وہ سب ثالث کی گاڑی میں بیٹھے۔ انجن کی دھاڑ نے رات کے سناٹے کو چیرا اور گاڑی تیزی سے کالج کے مرکزی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ گارڈ نے بنا کچھ کہے گیٹ کھول دیا۔ وہ اس سب کا عادی تھا۔

"یار ثالث، کچھ تو بولو..." دوسرے لڑکے نے خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔

"مُجھے اپنے کیریئر پر فوکس کرنا ہے۔ ہم اب بچے نہیں رہے۔ میں مزید اس سے نہیں لڑسکتا تو میرے خیال سے ہمیں اس جنگ کو یہیں ختم کرنا ہوگا۔" ثالث نے کہتے ہوئے اسٹیئرنگ پر اپنی گرفت مضبوط کی، اس کی نظریں سامنے سڑک پر جمی تھیں۔

"صرف یہی وجہ نہیں ہوسکتی، تم اتنی آسانی سے کسی کو جانے نہیں دیتے..." پہلے کو بھی ابھی یقین نہیں آ رہا۔

"بزدار اور شبگیر خاندان کے درمیان کھڑی دیوار کا سب کو معلوم ہے۔ تم ٹھیک کر رہے ہو ثالث... تمہیں اپنے کھیل پر توجہ دینی چاہیے۔" تیسرا شاید اس کی ذہنی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

"دیواریں تو گرانے کے لیے ہوتی ہیں۔" دوسرے نے ہنس کر کہا۔

"کچھ دیواریں گرانے کے لیے نہیں بلکہ ان پر اپنا نام لکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔"

گاڑی بھگاتے ثالث بزدار نے سوچا ضرور مگر کہا نہیں۔ فی الوقت اسے کھیل پر فوکس کرنا تھا۔ اسکا کریئر اس کے لیے سب کچھ تھا۔ بزدار خاندان کا سپوت ہونے کا ٹیگ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اگر وہ کچھ نہ کر پایا تو...؟ اس سے آگے وہ سوچ نہیں پایا۔ سر جھٹک کر توجہ سڑک پر مرکوز کر دی۔ اسٹریٹ پولز تیزی سے پیچھے چھوٹ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

رات کے دو بج رہے تھے۔ پیلس کے اس پرتعیش کمرے میں صرف گھڑی کی سوئیاں چلنے کی آواز تھی مگر حق کے لیے یہ خاموشی بھی شور جیسی تھی۔ وہ نیند کا کچا تھا یا شاید سکون اس کی تقدیر میں ہی نہیں تھا۔ سالہا سال سے ہسپتال کی ایمرجنسی کالز اور انسانی دلوں کی دھڑکنوں کو سنتے

سنتے ،اس کی سماعت کسی بھی غیر معمولی آہٹ کو پہچاننے کی عادی ہو چکی تھی۔ابھی مشکل سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی اس کی آنکھ لگی تھی کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون نے تھرتھرانا شروع کر دیا۔وائبریشن کی وہ مخصوص آواز خاموش کمرے میں کسی ڈرل مشین کی طرح گونجی۔حق نے تکیے سے سر اٹھایا۔اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے سرخ تھیں مگر اس نے ہاتھ بڑھا کر فوراً فون اٹھالیا۔اسکرین پر ثالث کا نام چمک رہا تھا۔اس کے ماتھے پر لکیریں ابھریں۔رات کے اس پہر ثالث کی کال کا مطلب صرف ایک تھا۔پھر کوئی نئی مصیبت!

اس نے فون ریسیو کر کے کان سے لگایا۔"ہیلو؟"اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی، بوجھل مگر ایک سحر لیے ہوئے تھی۔

"ہیلو...ہیلو...الفا..ہیلو..بھ...بھائی؟"دوسری جانب سے ثالث کی آواز ابھری جو بے طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا ثالث؟ سب ٹھیک ہے؟"وہ بیڈ سے سیدھا ہوا،اس کی چھٹی حس نے خطرے کا سائرن بجا دیا تھا۔

"بھائی...وہ... یہاں ایکسیڈنٹ....خون بہت ہے...پلیز! پلیز آپ آجائیں، مجھ سے نہیں ہو رہا!"ثالث کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے،وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔حق کی ساری حسیں جھٹکے سے بیدا ہو گئیں۔اس کے اندر کا ڈاکٹر جاگ اٹھا۔اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ثالث کو ڈانٹا نہیں بلکہ اس کا لہجہ اچانک اتنا ہموار اور پرسکون ہو گیا جیسے وہ ہسپتال کا کوئی ایمرجنسی کیس ہینڈل کر رہا ہو۔

"ثالث! میری بات سنو۔لمبی سانس لو۔مُجھے صرف یہ بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو؟ کون سی جگہ ہے؟"

ثالث نے لڑکھڑاتی زبان سے ایڈریس بتایا اور لوکیشن بھیج دی۔حق نے فون اسپیکر پر ڈالا اور وہیں سے اسے ہدایات دینے لگا۔"ٹھیک ہے، میں نکل رہا ہوں۔تم بس وہاں سے ہلنا مت۔اگر خون زیادہ بہہ رہا ہے تو زخم پر کوئی صاف کپڑا رکھ کر زور سے دباؤ۔میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

وہ بیڈ سے پہلے ہی اٹھ چکا تھا اس نے کپڑے بدلنے کا وقت بھی ضائع نہیں کیا، بیڈ بینچ پہ پڑا گاؤن اٹھایا اور شب خوابی کے لباس کے اوپر پہنتے ہوئے پیروں میں چپل اڑسیں،موبائل اٹھایا اور کمرے سے باہر بھاگا۔وہ سیڑھیاں دو دو کر کے اتر رہا تھا۔راہداریوں کی زرد روشنیاں اس کے پیچھے چھوٹ رہی تھیں۔اسے یاد نہیں تھا کہ آخری بار وہ کب سکون سے سویا تھا۔کبھی ہسپتال سے کسی وی آئی پی مریض کا بلاوہ،کبھی کوئی ہنگامی سرجری اور آج یہ خاندانی آفت۔حق بزدار زندگی ایک ایسی دوڑ تھی جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔وہ لاؤنج عبور کرتا ہوا پورچ کی طرف نکلا۔باہر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے چہرے کو چھوا تو اس کے حواس مزید بیدار ہو گئے۔پورچ میں ڈیوٹی پر موجود گارڈ اسے اس حالت میں بدحواس نکلتے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

"صاحب! کیا ہوا؟ میں گاڑی نکالوں؟"گارڈ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"چابی دو! جلدی!"وہ خود پر قابو پاتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔

گارڈ نے کانپتے ہاتھوں سے اس کی گاڑی کی چابی پیش کی۔حق نے جھپٹ کر چابی لی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کیا۔گاڑی کے ٹائر فرش پر رگڑ کھاتے ہوئے گیٹ سے باہر نکلے اور اگلے چند لمحوں میں وہ سنگِ مرمر کا محل پیچھے رہ گیا۔افراتفری کے اس عالم میں حق کی

نظریں سامنے سڑک پر جمی تھیں مگر اس کا دماغ اس ایکسیڈنٹ کی ہولناکیوں کا نقشہ بنا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ رات اسے کس نئے امتحان کی طرف لے جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

فلائی اوور کی بلندی سے اترتی کالی اسپورٹس کار کی رفتار اس وقت سو کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی تجاوز کر رہی تھی۔ ثالث جو اپنے دوستوں کو ڈراپ کرنے کے بعد اب اکیلا تھا، اسٹیئرنگ پر گرفت جمائے سڑک کے سناٹے کو چیر رہا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے اس جانب کی سڑکیں قبرستان کی طرح خاموش تھیں اور اسٹریٹ پولز کی روشنی گاڑی کے شیشوں پر ایک لکیر کی صورت گزر رہی تھی۔ ابھی وہ فلائی اوور کی ڈھلوان سے نیچے اترنے ہی والا تھا کہ سامنے سے ایک گاڑی لہراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی چمک اتنی تیز تھی کہ ثالث کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ گاڑی شاید کسی نشئی کے قبضے میں تھی یا پھر موت کے نشے میں۔ اس سے ٹکراؤ یقینی تھا مگر ثالث نے آخری سیکنڈ میں جان بچانے کی جبلت کے تحت اسٹیئرنگ کو پوری قوت سے دائیں جانب موڑ دیا۔ ٹائروں کے سڑک پر رگڑ کھانے کی ایک کربناک آواز گونجی۔ جہاں فلائی اوور کی ڈھلوان زمین سے مل رہی تھی، وہاں ایک موٹر سائیکل سوار سڑک کے کنارے، اپنی خراب موٹر سائیکل کے پاس جھکا کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے خبر تھا کہ اس کی پشت سے موت، لوہے اور فولاد کی شکل میں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ثالث نے بریک لگانے کی جی توڑ کوشش کی مگر اسپورٹس کار کی رفتار اور سڑک کی ڈھلوان نے اس کی کوششیں ناکام کر دیں۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ گاڑی کے ٹکرانے اور لوہے کے مڑنے کی وہ گھناؤنی آواز فضا میں گونج گئی۔ وہ شخص فٹ بال کی طرح کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور دور جا کر سڑک کے بیچوں بیچ اوندھے منہ گرا۔ دوسری لہراتی ہوئی گاڑی کہیں غائب ہو چکی تھی، پیچھے صرف موت کا رقص باقی تھا۔ گاڑی کچھ فاصلے پر جا کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ثالث کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرانے سے بچ گیا۔ ایئر بیگز نے اسے بچا لیا تھا۔ کچھ لمحوں تک اسے صرف اپنے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ اس کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھریں۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے بیلٹ کھولی اور کار کا دروازہ دھکیلا۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا نے اس کے پسینے سے شرابور چہرے کو چھوا۔ سڑک پر دور وہ شخص تڑپ رہا تھا۔ اس کی بائیک کا ملبہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا۔ ثالث کے قدموں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھے مگر وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس کے پسلیوں میں عجیب پھڑ پھڑاہٹ ہونے لگی اور حلق میں کڑواہٹ بھر گئی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس شخص کے قریب پہنچا جو اب ساکت ہو چکا تھا۔ سڑک کے سیاہ ڈامر پر ایک گہرا سرخ دریا بہنا شروع ہو چکا تھا جو فلڈ لائٹس کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

”نو...نو...نو...پلیز...نو...“ اس بے جان شخص کو دیکھ کر ثالث کی آواز حلق میں دم توڑ گئی۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ ہاں وہ انا پرست تھا۔ مخالف

لوگوں کی زندگی جہنم بنانا اس کے لیے مشکل کام نہیں تھا مگر یہ... یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ثالث بزدار قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا، وہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا جہاں کوئی اسے پہچان نہ سکے، جہاں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ موت اس کے ہاتھوں لکھی تھی۔ مگر اس کی نظریں اس شخص کے ساکن ہاتھ پر جم گئی تھیں جواب بھی شاید زندگی کی آخری ڈور تھامے ہوئے تھا۔ اسی عالمِ وحشت میں اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون نکالا اور وہ نمبر ڈائل کیا جو اسے اس جہنم سے نکال سکتا تھا۔ اسکرین پر بڑے حروف میں ALPHA لکھا چمک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گاڑی کے ٹائروں کی چنگھاڑ دور تک سنائی دی۔ حق نے گاڑی کو ایک خطرناک موڑ دیتے ہوئے وہیں روکا جہاں ثالث کی اسپورٹس کار سڑک کے بیچوں بیچ کسی لاوارث کی طرح کھڑی تھی۔ جبکہ ثالث کے ہونٹ خشک ہو کر سفید پڑ چکے تھے، دیوانہ وار گاڑی کے قریب چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کے حواس اس قدر معطل تھے کہ اسے حق کی گاڑی کی آمد کا احساس بھی اس وقت ہوا جب حق نے دروازہ پٹخ کر باہر قدم رکھا۔ اس کی دھڑکن تیز اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ ثالث تڑپ کر اس کی جانب بڑھا جبکہ حق کو لگا تھا کہ ثالث لہو لہان ملے گا، مگر ثالث کو صحیح سلامت دیکھ کر اس کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ تاہم یہ اطمینان لمحاتی تھا۔ اس کی نظر سڑک پر اوندھے منہ گرے اس شخص پر پڑی جس کے گرد پھیلتا ہوا خون کا تالاب زرد اسٹریٹ لائٹ میں کالے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ حق نے ایک طائرانہ نظر چاروں طرف دوڑائی۔ اس کی تیکھی نظروں نے دور لگے ایک سی سی۔ ٹی وی کیمرے کو تاڑا مگر اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ سڑک سنسان تھی۔

"بھائی... مم... میں... نے... جان.. بوجھ..." ثالث اب حق کے سامنے کھڑا کپکپا رہا تھا۔

"ثالث! ہوش میں آؤ!" حق نے اسے کندھوں سے تھامتے جھنجھوڑا اور پھر تیزی سے اس زخمی شخص کی طرف بڑھا۔ جھکتے ہوئے اس نے اپنی انگلیاں اس کی شہ رگ پر رکھیں۔ "نبض بہت دھیمی ہے..." اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں۔ صد شکر وہ زندہ تھا۔

"مجھے اپنا رومال دو..." وہ خود پر قابو پا چکا تھا اور اب ثالث کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ ثالث نے کلائی (اسٹیڈیم میں جو پیشانی پہ بندھا تھا) پر بندھا رومال اتار کر حق کو پکڑایا۔ وہ اب اس شخص کے زخم پر رومال باندھ رہا تھا۔ وہ ایک ماہر سرجن تھا۔ اس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے مگر عین اسی لمحے جب وہ زخم پر دباؤ ڈال رہا تھا اس کی نظر قریب ہی سڑک پر پڑے ایک چھوٹے سے سفید لفافے پر پڑی۔ خون کے چند سرخ چھینٹے اس لفافے کی سفیدی کو داغدار کر چکے تھے۔ حق کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ لفافے کے کونے پر ایک اسٹھیٹو سکوپ کا چھوٹا سا مونوگرام بنا تھا۔ یہ معمولی نہیں تھا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا سائرن بجایا۔ طائرانہ نظروں سے چاروں جانب

دیکھا۔ آس پاس کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے بجلی کی تیزی سے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ اٹھایا اور اپنے گاؤن کی جیب میں ڈال لیا۔ ہونٹ ایک پل کو خشک پڑے۔

"ٹھیک ہے، اسے اٹھانے میں میری مدد کرو!" ہموار آواز میں اس نے ثالث سے کہا چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے۔ "ہم اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتے۔"

ثالث ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھا مگر حق کی بات سنتے ہی لرزتے قدموں سے آگے بڑھا۔ دونوں نے مل کر اس نیم مردہ شخص کو اٹھایا اور حق کی گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا۔ حق کا دماغ فی الوقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایمبولنس کو بلانے کا مطلب تھا بزدار نام کو تھانے کچہری میں گھسیٹنا، اور وہ یہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

"لیکن... بھائی... ہم... اسے..." ثالث نے بولنے کی کوشش کی۔ اس نیم مردہ شخص کو دیکھ کر اسکی جان بے جان ہو رہی تھی۔ اسے اپنی پوری زندگی اندھیر ہوتی محسوس ہوئی۔

"میری بات سنو ثالث!" حق نے اسے گدی سے پکڑ اپنی جانب کھینچا۔ ثالث کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ یوں جیسے خون اس انجان شخص کا نہیں بلکہ خود ثالث بزدار کا نچڑ گیا ہو۔

"ہوش میں آؤ۔ اپنی گاڑی نکالو اور میرے پیچھے آؤ۔ سمجھ رہے ہو نا؟ ہم مزید ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کر سکتے..." اسکا انداز جھنجھوڑنے والا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے تو ثالث کا ہوش میں آنا ضروری تھا۔

اپنے الفا کو یوں قریب دیکھ کر ثالث کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ "وہ... دا جی... اگر انہیں پتا چلا تو؟" اسے اپنے باپ سے زیادہ دادا کی ہیبت کا خوف ستا رہا تھا۔

"میں دیکھ لوں گا!" حق کا لہجہ دوٹوک تھا۔ "تم کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ اب جلدی کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس!"

اس نے ثالث کو اس کی گاڑی کی طرف دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے اپنی پسلیوں میں درد محسوس ہوا۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کھول کر وہ خون آلود لفافہ اندر ڈالا اور ایک آخری نظر پیچھے پڑے ساکت وجود پر ڈالی۔ اسپورٹ کار کے انجن کی گڑگڑاہٹ کے بعد دونوں گاڑیاں اس تاریک شاہراہ سے غائب ہو گئیں۔ حق کو اس تاریک رات میں دو اہم کام نبٹانے تھے۔ ایک اس شخص کی زندگی بچانا، اور دوسرا... اس لفافے کے اندر چھپے اس سچ تک پہنچنا جس نے اس کی بے چینی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کے پچھلے پہر جب شہر خاموش تھا، بزدار ہسپتال کے پچھلے راستے پر ایک مرسڈیز اور ایک اسپورٹس کار انتہائی تیز رفتاری سے آ کر رکیں۔حق گاڑی کا انجن بند کیے بغیر تیزی سے باہر نکلا۔اس کے ماتھے پر پسینہ تھا اور آنکھوں میں وہ مخصوص بیٹل موڈ (Battle Mode) جو وہ صرف انتہائی پیچیدہ سرجریز کے وقت اپنایا کرتا تھا۔اس نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنے سب سے معتبر ڈاکٹر، ڈاکٹر زید کو کال کر دی تھی۔

"زید! پرائیویٹ ونگ کا سوئٹ نمبر 7 ابھی کے ابھی خالی کرواؤ۔لفٹ ایریا کلیئر ہونا چاہیے۔کوئی لاگ بک، کوئی انٹری نہیں ہونی چاہیے۔ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں، مُجھے وہاں بیسٹ نرسنگ اسٹاف اور ایمرجنسی ٹرے تیار چاہیے!"

جب وہ زخمی شخص کو اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے جا رہے تھے، ثالث گاڑی کے پاس منجمد کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔حق نے مڑ کر اسے دیکھا اور تیز قدموں سے اسکے قریب آیا۔

"اندر جا کر باتھ روم میں اپنا منہ ہاتھ دھوؤ اور وہیں بیٹھو۔جب تک میں نہ کہوں، کسی کو فون نہیں کرنا، کوئی میسج نہیں کرنا۔سمجھ رہے ہو؟" حق کی آواز میں ایسی تنبیہہ تھی کہ ثالث نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔وہ ابھی تک پوری طرح حواسوں میں نہیں لوٹا تھا۔ اگلے تین گھنٹے بزدار ہسپتال کے اس گمنام کمرے میں زندگی اور موت کی جنگ کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے جرم پر پردہ ڈالنے کی تگ و دو میں گزرے۔

کمرے کے اندر ڈاکٹر زید کے ساتھ حق مکمل طور پر ایک سرجن میں تبدیل ہو چکا تھا۔اس نے اپنے نائٹ گاؤن کو اتار کر وہیں پھینکا اور جراحی کا لباس پہنا۔مانیٹر کی بیپ بیپ خاموش کمرے میں تناؤ پیدا کر رہی تھی۔وہ نیورو سرجن نہیں بلکہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھا اس لیے سرجری ڈاکٹر زید کر رہا تھا اور حق وہاں مریض کو اسٹیبلائز کرنے کے لیے موجود تھا۔

"میمبرین رپچر (Membrane Rupture) ہے، انٹراکرینئیل ہیمرج (Intracranial Hemorrhage) شروع ہو چکا ہے۔ہمیں اسے فوراً اسٹیبلائز کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر نے حق کو ہدایات دیں جبکہ اس کے اپنے ہاتھ خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔وہ شخص اب ایک گہرے کوما میں جا چکا تھا۔سر پر آنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ بچنے کے امکانات بہت کم تھے مگر حق اسے مرنے نہیں دے سکتا تھا۔اگر وہ مر جاتا، تو یہ کیس قتلِ خطا سے قتلِ عمد بن سکتا تھا اور خاندان کی ساکھ خاک میں مل جاتی اور ایک الفا اپنے خاندان کو دوسرے شکاریوں کے ہتے چڑھنے نہیں دے سکتا تھا۔اسی سرجری کے دوران حق اپنا فون لیے سرجری روم سے باہر نکل آیا تھا۔وہ اب ایک نمبر ملا رہا تھا۔یہ کال اقبال بزدار کو تھی۔وہ شخص جو خاندان کے 'گندے کام' صاف کرنے کا ماہر تھا۔چند گھنٹیوں کے بعد فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو الفا؟ خیریت ہے؟" دوسری جانب اقبال کی سنجیدہ سی آواز ابھری۔

"میری بات غور سے سنو اقبال!" لہجہ رازدانہ تھا۔وہ اب اسے احکامات دے رہا تھا۔

"اگلے بیس منٹ میں فلائی اوور کے نیچے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔سی سی-ٹی-وی فوٹیج، گارڈز کے بیانات (اگر کسی نے دیکھا ہے) سب کچھ ڈیلیٹ ہو جانا چاہیے۔اور ہاں اس شخص کی بائیک کا نمبر پلیٹ غائب کر دینا۔وہ یہاں میرے پاس ہے۔" اس نے کمرے کی جانب رخ کیا۔"وہ آج سے یہیں رہے گا۔گمنام مریض بن کر..."

دوسری جانب موجود اقبال بزدار کے لیے اتنا کافی تھا۔ باقی کیا، کب اور کیسے کرنا تھا وہ یہ جانتا تھا۔ صبح کے چار بجے جب ہسپتال کی راہداریوں میں نائٹ ڈیوٹی پر مامور عملہ اونگھ رہا تھا، اقبال اپنے مخصوص پرسکون مگر پراسرار انداز میں ہسپتال پہنچا۔ وہ امجد بزدار کا دوسرا بڑا پوتا (حق کا چچازاد بھائی) تھا، جس کا کام صرف مینجمنٹ تھا اور اسے بزدار خاندان میں Silent Cleaner کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ سوئٹ نمبر 7 کی راہداری میں داخل ہوا جہاں حق باہر کھڑا دیوار سے سر لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ وہ اقبال کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ سرجن کا لباس اب بدل چکا تھا۔ اب اس کے جسم پر وہی شب خوابی کا لباس تھا مگر بالکل صاف ستھرا۔ اس پر کہیں بھی خون کے دھبے نہیں لگے تھے۔ شاید اسے دھویا گیا تھا... نہیں بلکہ شاید اس کے جیسا نیا منگوایا گیا تھا۔ قدموں کی آہٹ پہ حق نے آنکھیں کھولیں اور ایک بوجھل نگاہ اقبال پر ڈالی۔ وہ ہواؤں کی سائیں سائیں بھی پہچان لیا کرتا تھا۔

"باہر کا کیا حال ہے؟" اس کی سمندر جیسی آنکھیں یہی سوال کرتی نظر آ رہی تھیں۔

اقبال نے ایک گہری سانس لی اور حق کے قریب آ کر آواز دھیمی کر لی۔

"تمہارے فون کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد میری ٹیم فلائی اوور پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک پر خون کے نشانات کو فائر بریگیڈ کی گاڑی نے روٹین کلیننگ کا نام دے کر دھو دیا ہے۔ بائیک کا ملبہ اب ایک ایسے کباڑ خانے میں ہے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

اکتیس سالہ اقبال ایک خوش شکل شخص تھا جس کی آنکھیں کرخت تھیں۔ وہ قد میں حق کے برابر ہی تھا اور جان میں اس سے تھوڑا کم لیکن مینجمنٹ اچھی کرتا تھا۔

"اور پولیس؟" حق کا لہجہ ابھی بھی تناؤ کا شکار تھا۔ "ایسا حادثہ پولیس کی نظر سے نہیں بچ سکتا۔" اقبال کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھری۔ وہ دونوں راہداری میں کھڑے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود نرسنگ اسٹاف گزرتے ہوئے حق کو سلام کر رہے تھے۔

"پولیس کی دو گاڑیاں پہنچی تھیں، حق! مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ایریا کے ایس ایچ او کو اوپر سے کال جا چکی تھی۔ اسے بتایا گیا کہ ایک لاوارث موٹر سائیکل ملی ہے جس کا سوار شاید نشے کی حالت میں بائیک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

رپورٹ میں ہٹ اینڈ رن (Hit and Run) کا ذکر تک نہیں ہونے دیا گیا۔"

"فوٹیج کا کیا ہوا؟" حق نے ابرو اٹھائی۔ "فلائی اوور کے نیچے سی سی ٹی وی لگا تھا۔" اقبال نے ایک گہری سانس لی۔ الفا اپنے نشان نہیں چھوڑتا وہ یہ جانتا تھا اس لیے جب تک وہ پوری تسلی نہ کر لیتا، اقبال کی جان نہیں چھوٹنے والی تھی۔

"وہ ڈیجیٹل ڈیپارٹمنٹ نے سنبھال لیا ہے۔" اقبال نے فون کی اسکرین حق کے سامنے لہرائی۔

"اسٹریٹ کیمرے میں ٹھیک اسی وقت تکنیکی خرابی دکھائی گئی ہے جب ثالث کی اسپورٹ کار فلائی اوور تک پہنچی تھی۔ سرور سے، اس سے پچھلے ایک گھنٹے کا ڈیٹا مستقل طور پر ڈیلیٹ کر دیا گیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی فورنزک ٹیم یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ وہاں کوئی اسپورٹس کار موجود تھی۔"

حق نے گہری سانس لیتے ہوئے دائیں جانب ویٹنگ ایریا میں، نظر شیشے کے پیچھے بیٹھے ثالث پر ڈالی جو ایک صوفے پر سمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ اس

کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور وہ مسلسل اپنے ناخن چبا رہا تھا۔ثالث کے لیے یہ صرف ایک حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک ذہنی اذیت تھی جس سے وہ شاید ہی کبھی باہر نکل سکتا تھا۔اپنی تسلی ہوتی ہے بعد وہ شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ثالث نے اسے دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔

"بھائی...وہ...وہ مر تو نہیں جائے گا؟"وہ خوفزدہ تھا جیسے خود موت کے منہ میں ہو۔اقبال بھی حق کے پیچھے ہی داخل ہوا۔امجد بزدار کے تینوں پوتے اس وقت اسی کے ہسپتال کی چھت کے نیچے کھڑے تھے۔

"وہ کوما میں ہے ثالث!اس کی زندگی اور اس کا سچ چھپانا میری زمہ داری ہے مگر خود کو بچانا تمہاری..."اس نے ثالث کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اسے واپس بٹھایا۔اس کا لہجہ یک دم بدل چکا تھا۔

"تم بزدار ہو،ثالث!اور ایک بزدار کبھی کمزور نہیں پڑتا۔اس کمرے سے باہر نکلتے ہی تم وہی ثالث بزدار ہو جس کی دنیا میں کوئی حادثہ نہیں ہوا۔اپنا چہرہ دوبارہ صاف کرو اور بال درست کرو۔ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

اقبال نے صوفے کے سامنے پڑے میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر ثالث کی جانب بڑھایا جسے ثالث نے لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا۔اسے اپنے بھائیوں کی موجودگی اس وقت ایک ڈھال محسوس ہو رہی تھی۔وہ اسے مزید ہدایات دیتے باہر نکل گئے۔

کچھ دیر بعد بزدار وی آئی پی سوئٹ کے وسیع و عریض باتھ روم میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر ثالث کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیواریں اسے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہوں۔اس نے قیمتی سیرامک کے بیسن پر اپنے دونوں ہاتھ جما دیے اور سر جھکا لیا۔اس نئے لباس کی خوشبو اسے اجنبی سی لگ رہی تھی۔وہ خون آلود کپڑے اب کہیں کچرے کے ڈھیر میں جا چکے تھے لیکن اسے اپنی پوروں میں اب بھی وہی لیس دار گرم خون محسوس ہو رہا تھا۔اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے سینسر والا نل کھولا۔ٹھنڈا پانی پوری قوت سے گرا۔ثالث نے چلو بھر کر اپنے چہرے پر زوردار چھینٹا مارا جیسے وہ اس بھیانک خواب سے جاگنا چاہتا ہو۔

"وہ زندہ ہے...وہ مرا نہیں ہے۔"

اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ سپید پڑ چکا تھا۔دوبارہ پھر پانی کے چھینٹے مارے،پھر تیسری بار،اور چوتھی بار... یہاں تک کہ اس کے ماتھے پر گرے بال پوری طرح بھیگ کر آنکھوں پر آ گئے۔

"وہ زندہ ہے۔حق بھائی نے کہا ہے وہ زندہ ہے۔"اس نے زیرِ لب دہرایا،جیسے خود کو یقین دلا رہا ہو۔اس کی آواز واش روم کے سناٹے میں اسے کسی اجنبی کی لگی۔

"سب ٹھیک ہے۔اقبال بھائی نے سب نارمل کر دیا ہے۔کوئی ثبوت نہیں،کوئی کیس نہیں،کوئی خون نہیں..."

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بھیگے ہوئے بالوں کو پیچھے کیا اور اپنی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ان ہیل...

ایکسیل ...لیکن اس کے کانوں میں اب تک اس حادثے کی وہ کرخت آوازیں گونج رہی تھیں۔ بائیک کے ٹکرانے کا وہ شور اور پھر اچانک چھا جانے والی وہ جان لیوا خاموشی۔

"میں ایک بزدار ہوں۔ میں ایک بھیڑیا ہوں۔" اس نے حق کے الفاظ کو زیرلب دہرایا۔

"اور بھیڑیے کمزور نہیں پڑتے..." وہ خود اپنی خاندانی حقیقت یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی ثانیے وہ یونہی کھڑا رہا۔ برقی قمقموں میں اس کا وجیہہ سراپا، آئینے میں واضح تھا۔ پانی اس کے چہرے اور بالوں سے ٹپکتا رہا۔ پھر اس نے سامنے پڑے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور نہایت نفاست سے اپنے چہرے کو خشک کیا۔ اس کے ہاتھ اب بھی ہلکا سا لرز رہے تھے مگر اس نے انہیں مٹھیاں بھینچ کر ساکت کر لیا۔ اپنی نئی کا شرٹ کا گریبان درست کیا، بالوں کو انگلیوں سے سیٹ کیا اور خود کو ایک بار پھر اسی 'ثالث بزدار' کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی جسے دنیا جانتی تھی۔ بے فکر، لاڈلا اور پرجوش! آئینے میں نظر آنے والا عکس اب پہلے سے زیادہ پرسکون مگر پہلے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گہری سانس لی، اپنے خوف کو کہیں اندر کسی گمنام کونے میں دھکیلا اور واش روم کا دروازہ کھول کر باہر کی اس دنیا میں قدم رکھا جہاں اب اسے تاحیات ایک گناہ اور ایک راز کے ساتھ جینا تھا۔

☆☆☆☆☆

صبح کے پانچ بجے جب ہسپتال کی شفٹ بدل رہی تھی، حق نے نرسنگ اسٹاف کو آخری ہدایات دیں۔

"اس مریض کا کوئی ریکارڈ کمپیوٹر میں نہیں جائے گا۔ یہ پیشنٹ ایکس (Patient X) ہے۔ اس کی فائل صرف میرے پاس رہے گی۔ کوئی بھی اس کے بارے میں پوچھے، تو کہنا کہ یہ چیریٹی وارڈ کا مریض ہے جسے سڑک کنارے سے بے ہوشی میں اٹھایا گیا تھا۔"

نرسنگ اسٹاف نے دم سادھ کر سنا۔ ہلکے گلابی یونیفارم میں چار نرس ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ کسی میں سوال کرنے کی جرات نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو ضرورت تھی۔ اس کے بعد حق، اقبال اور ثالث، تینوں ہسپتال کے عقبی راستے سے باہر نکلے۔ ہسپتال کے باہر کھڑی گاڑیوں پر شبنم کے قطرے جم چکے تھے مگر حق کے ذہن میں وہ خون آلود انویلپ ابھی بھی تپ رہا تھا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور آئینے میں اپنے پیچھے آتی اقبال کی گاڑی کو دیکھا۔ الفا نے اپنا کام کر دیا تھا مگر سچ کا بوجھ اب اس کے اپنے کندھوں پر تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ بوجھ اسے کبھی سکون سے سونے نہیں دے گا۔ وہ تینوں الگ الگ گاڑیوں میں بزدار پیلس کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ حق اپنی گاڑی میں تھا۔ اس نے ایک بار ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کو چھوا، جہاں وہ لفافہ موجود تھا۔ اسے کھولنے کی ہمت اس میں ابھی نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے وہ لفافہ ابھی کھولا تو شاید وہ گاڑی چلانے کے قابل نہیں رہے گا۔

پیلس پہنچتے ہی ماحول ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ گارڈز نے ہمیشہ کی طرح سلیوٹ مارا، نوکر چاکر اپنے کاموں میں مصروف ہو رہے تھے۔ حق نے ثالث کو دیکھا اور سر کو خم دیتے ہوئے اشارہ کیا۔ اقبال سمجھ چکا تھا وہ ثالث کو ساتھ لیے دائیں جانب والی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

ثالث خاموش تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا ڈراؤنا خواب وہیں چھوڑ آیا ہو۔
حق کا وجود تھکن سے چور تھا مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی ابھی بھی کسی تنے ہوئے کمان کی طرح سیدھی تھی۔ یہ ایک الفا کی جبلت تھی کہ وہ اپنے زخم، اپنوں کو نہیں دکھاتا۔ وہ جانتا تھا کہ الفا کا منصب صرف حکم چلانا نہیں بلکہ اپنے قبیلے کے گناہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر انہیں پاک کرنا ہوتا ہے۔ اس نے ڈیش بورڈ سے وہ خون آلود انویلپ نکالا اور اسے اپنی مٹھی میں بھینچ کر گاؤن کی جیب میں ڈالا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کب بزدار خاندان کے افراد نے اسے الفا کا نام دے دیا تھا۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ اسے الفا ہونے کا فرض نبھانا تھا۔ الفا ہونا کوئی رتبہ نہیں تھا، یہ ایک بوجھ تھا جسے حق بزدار نے اپنی مرضی سے اٹھایا تھا۔ بھیڑیوں کے جھنڈ میں الفا وہ نہیں ہوتا جو سب سے زیادہ غراتا ہے بلکہ وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ سہتا ہے تاکہ اس کے پیچھے کھڑے خون کے رشتے محفوظ رہ سکیں۔ اپنے بالوں کو ہاتھوں سے درست کرتا وہ شب خوابی کے لباس اور چپل میں، سیکیورٹی روم کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی چال مضبوط تھی۔ وہ کچھ حد تک پرسکون تھا۔ اس نے ایک آدمی کو مرنے سے بچایا تھا۔ ثالث کو ایک بڑے گلٹ سے نکال لیا تھا۔ بزداروں پر آنچ بھی نہیں آئی تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا؟ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں واضح ہو رہی تھیں۔ سمندر جیسی آنکھیں۔ شان سے کھڑے بزدار پیلس کی دو مرکزی عمارتوں نے اپنے وسط میں چلتے اس شخص کو دیکھا۔ پیلس کے دامن میں کھڑے قد آور درختوں کے جھنڈ نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

"حق بزدار اس گہرے، ساکت سمندر کی طرح تھا جس کی سطح پر چاندنی رقص کرتی ہے مگر اس کی تہوں میں بے رحم شارک مچھلیاں اور قدیم جہازوں کے ملبے دفن تھے۔"
سلوی ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ اس شب خوابی کے لباس میں ملبوس شخص میں ہر چیز کی زیادتی کی تھی پھر چاہے وہ اس کا اپنوں کے لیے وہ جنونی تحفظ ہو جو اسے کسی بھی حد سے گزار دیتا تھا یا وہ پراسرار خاموشی جو کسی بڑے طوفان کی دستک معلوم ہوتی تھی۔

☆☆☆☆☆

اسی شہر کے دوسرے کونے میں واقع عرب ٹاؤن کے اس شبگیر ہاؤس کا بالائی حصہ اس وقت فجر سے پہلے کی پراسرار خاموشی اور خنکی میں لپٹا ہوا تھا۔ ہوا میں رات کی بچی کھچی نمی اور مٹی کی سوندھی مہک رچی تھی جب نیمل نے سیڑھیاں طے کیں۔ اس نے رات والی شال ہی کندھوں کے گرد لپیٹ رکھی تھی جبکہ لمبے بال ایک ڈھیلے سے جوڑے میں قید تھے۔ وہ پیشہ ورانہ لحاظ سے ایک دفاعی وکیل تھی اور آج اسے اپنے پہلے اور اہم کیس کی فائلز اسٹڈی کرنی تھیں، جس کے لیے اس نے ہمیشہ کی طرح خاموش بالائی منزل کا انتخاب کیا۔ جیسے ہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک مان بھری مسکراہٹ آ گئی۔ سلال سفید گولے والی شرٹ میں ملبوس، جائے نماز کی تہیں لگا رہا تھا۔ وہ پہلے پہل صرف امتحان کی تیاری کے لیے رات کے اس پہر اٹھتا تھا مگر پھر جانے کب کتابوں کے الفاظ اسے رب کے حضور لے گئے

اور اب تہجد اس کی روح کی غذا بن چکی تھی۔ نیمل نے سینے پر بازو باندھے، دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر نرم نگاہوں سے اپنے ساڑھے تین سال چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

" کیا کبھی ایسا ہوگا سلال کہ میں اوپر آؤں اور تم مُجھے سوئے ہوئے ملو؟ یا کم از کم جائے نماز پر نہ ہو؟"

سلال نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اب جائے نماز شیلف میں رکھ رہا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا آپی!" نیمل کو اسکا آپی کہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جب آپی کہتا تھا نیمل شبگیر سرشار ہو جاتی تھی۔

"ایسا تب ہی ہوسکتا ہے جب سلال شبگیر نہ رہے۔" وہ دھیرے سے پلٹا۔

"پاگل! ایسے نہیں کہتے۔" وہ اسے خفگی سے ٹوکتے ہوئے چوکھٹ سے ہٹی آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اللہ تمہیں لمبی زندگی دے، تم سے تو بہت امیدیں ہیں۔"

سلال اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "اور آپ؟ آپ بھی تو روز اوپر آتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو کہ آپ مُجھے جگانے یا ملنے نہ آئیں؟"

نیمل نے شال کو خود میں مزید سمیٹ لیا۔ "ایسا بھی کبھی نہیں ہوگا۔ جب تک اس گھر میں ہوں، میری صبح تمہاری صورت دیکھے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔"

دونوں ایک دوسرے کی زندگی کا لازمی جزو تھے۔ شبگیر ہاؤس کا ہر شخص ایک دوسرے سے یوں جڑا تھا جیسے تسبیح کے دانے جڑے ہوتے ہیں جو الگ الگ ہونے پر بکھر جاتے ہیں۔ ان دانوں کو سمیٹنے میں ایک بڑا ہاتھ نیمل کا تھا۔

" آج رزلٹ ہے نا؟" وہ اس کی میڈیکل کی ڈھیروں کتابوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

سلال نے ایک گہری سانس لی۔ "جی، اسی لیے تو آج دعا ذرا لمبی تھی لیکن ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس سے؟" نیمل نے ابرو اچکائے۔

" جانے اس بار میں فرسٹ آپاؤں گا یا نہیں..." سلال نے کندھے اچکا دیے۔ وہ نیمل کے سامنے اپنے سارے خدشات بنا ہچکچائے رکھ دیتا تھا۔ وہ اسے سمجھتی تھی وہ سب کو سمجھتی تھی۔ نیمل چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا سیدھی ہوگئی۔ ڈھیلے جوڑے میں مقید سیاہ بالوں نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔ شبگیر خاندان کی لڑکیاں وہ لڑکیاں تھیں جن پر سیاہ بال جچتے تھے۔ سیاہ ریشمی بال اور سیاہ چھوٹی آنکھیں جوان کی پہچان تھیں۔

"میڈیکل کا یہ آخری سال تمہارے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ تو لگا دے گا مگر تم ڈاکٹر بنو گے یا نہیں، اس کا فیصلہ تمہارا ضمیر کرے گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔ پورا گھر خاموشی میں ڈوبا تھا بس وہی دونوں بہن بھائی اپنی دنیا میں مگن تھے۔

"بیشک باہر کی دنیا میں لوگ تمہارے میڈلز گنیں گے، تمہاری ڈگریوں کی لمبائی دیکھیں گے لیکن اس ہسپتال کی راہداریوں میں جہاں زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک دھاگے کا فاصلہ ہوتا ہے، وہاں صرف تمہارا کردار کام آئے گا۔ یاد رکھنا سلال! یہ واحد پروفیشن ہے جہاں تمہاری ایک چھوٹی سی نااہلی، تمہاری صرف ایک سیکنڈ کی غفلت یا تمہارا ایک غلط فیصلہ کسی کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔"

اس نے سلال کی آنکھوں میں جھانکا جہاں تھکن کے پیچھے تھوڑی سی بے چینی جھلک رہی تھی۔

"ایک انجینئر کی غلطی سے عمارت گرتی ہے، ایک وکیل کی غلطی سے قیدی کو سزا ہوتی ہے لیکن ایک ڈاکٹر کی غلطی براہِ راست قبرستان کا راستہ دکھاتی ہے۔تم جس دن اس سفید کوٹ کو پہنو، اس دن یہ عہد کرنا کہ تمہیں ان میڈلز سے نہیں، اپنے اس ضمیر سے سروکار ہونا چاہیے جو رات کو تمہیں سکون کی نیند سونے دے۔تم سے کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، اوپر بیٹھا وہ رب تم سے اس ایک ایک قطرے کا حساب لے گا جو تمہاری لاپروائی سے کسی مریض کی آنکھ سے گرا یا اس کی رگوں سے بہا۔"

سلال شبگیر جو دنیا کے لیے ایک بہترین لڑکا تھا۔جس کی تعریف پورا محلّہ کرتا تھا۔بہت کم لوگ جانتے تھے کہ اسے اخلاقیات کے اسباق پڑھانے والی نیمل شبگیر تھی۔اسے انگلی پکڑ کر سکول لے جانے والی نیمل شبگیر تھی۔اسے بہترین انسان بنانے والی نیمل شبگیر تھی۔وہ تئیس سال کا ہونے والا تھا اور آج بھی اسے raise کرنے والی نیمل تھی۔کبھی کبھی ایک مرد کو بہترین مرد بنانے کے پیچھے ایک بہترین عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور جب نیمل شبگیر بولتی تھی تو سلال شبگیر ہمہ تن گوش ہو جاتا تھا۔

"مریض تمہارے پاس صرف اپنی بیماری نہیں لاتا، وہ اپنا پورا خاندان، اپنی امیدیں اور اپنا بھروسہ لے کر آتا ہے۔اگر تم اس بھروسے کی لاج نہ رکھ سکے تو یہ ساری ڈگریاں صرف ردی کے کاغذ ہیں جن میں اول آنے کے لیے تم اتنی تگ و دو کر رہے ہو۔"

سلال کی نظریں جھک گئیں۔پچھلے چند گھنٹوں میں کلاس گروپ کی چیٹ نے اس کے ذہن میں صرف ایک بات بٹھا دی تھی کہ اسے فرسٹ آنا ہے۔کبھی کبھی انسان دباؤ میں آ کر اپنا مقصد بھولنے لگ جاتا ہے تب نیمل شبگیر جیسے لوگوں کا ایک چانٹا کافی ہوتا ہے۔

"سفید کوٹ پہننا آسان ہے سلال مگر اسے سفید رکھنا سب سے مشکل کام ہے۔"

وہ اسکے جھکے سر کو دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔اس بار سلال نے سر اٹھایا اور وہ نیمل کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"مُجھے سب یاد ہے۔" وہ بھول نہیں سکتا تھا اس نے یہ فیلڈ کیوں چنی تھی۔

"باقی اپنی rival کا سناؤ...کیا حالات ہیں۔" نیمل نے ذرا خوشگوار لہجے میں کہا تو اس بات سلال ہنس دیا۔

"عالیہ بری لڑکی نہیں ہے آپی۔وہ بہت ذہین ہے، شاید مجھ سے بھی زیادہ محنتی۔بس وہ پینک جلدی ہو جاتی ہے۔اس کا غصہ اور اس کا ڈر اسے وہ بنا دیتا ہے جو وہ اصل میں ہے نہیں۔"

سلال شبگیر کا مشاہدہ گہرا تھا۔وہ عالیہ کو ایک مثبت مسابقت کے طور پر مانتا تھا مگر عالیہ؟ بزدار پیلس کے ملازمین تک جانتے تھے کہ اسے سلال شبگیر سے کس قدر نفرت تھی۔

"وہ بزدار ہے سلال! ان کے خون میں ہار ماننا نہیں لکھا۔" وہ گہری سانس لیتے بولی۔نظریں اپنے دونوں ہاتھوں پر جما دیں جنہیں شال سے باہر نکال لیا گیا تھا۔نازک

مگر مضبوط سفید ہاتھ۔

"ایک بات پوچھوں؟ آپ نے میڈیکل چھوڑ کر لاء کو کیوں چنا؟ جبکہ آپ تو بائیولوجی کی ٹاپ اسٹوڈنٹ تھیں، ڈاکٹر بننا آپ کا خواب تھا۔"

سلال اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وجہ جانتا تھا مگر نیمل کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ نیمل کے ہاتھ جنہیں وہ پاس میں رگڑ رہی تھی ایک لمحے کو رکے، اور اس نے لب بھینچ لیے۔ اس ایک سوال نے نیمل کو دس سال پیچھے، ماضی کے ان تاریک گلیاروں میں دھکیل دیا جہاں یادوں کے زخم آج بھی تازہ تھے۔ دس سال پہلے کی وہ نیمل، جو میٹرک کی طالبہ تھی، اس نے بہت کم عمری میں ایک بہت بڑی حقیقت جان لی تھی۔

" کہ انہیں بچانے کوئی نہیں آئے گا!"

جب سقراط شبگیر کو پابندِ سلاسل کیا گیا، جب وہ دو سال تک انصاف کی دہلیز پر تنہا لڑتا رہا، تب پری میڈیکل کی کتابیں پڑھتی نیمل کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ مرہم رکھنے والے تو بہت مل جائیں گے مگر حق کے لیے لڑنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح قانون کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر اپنوں کو اپنوں سے چھین لیا جاتا ہے۔ اس دن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مسیحا نہیں بنے گی، وہ "دفاع" بنے گی۔ وہ اپنے خاندان کا دفاع کرے گی۔ ماضی کے اس طوفان کو ایک گہری سانس میں اتارتے ہوئے، وہ ایک ہلکی سی مگر پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ سلال کی جانب متوجہ ہوئی۔

"زخموں کا علاج تو تم کرہی لو گے سلال! میں نے وہ راستہ چنا ہے جہاں سے میں ان ہاتھوں کو روک سکوں جو زخم دیتے ہیں۔" دونوں نے بس ایک ثانیے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اور ویسے بھی تم میرا ادھورا خواب پورا کرو گے اور میں تمہارے کل کا دفاع کروں گی۔"

سلال خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا، وہ جانتا تھا کہ اس ایک جملے کے پیچھے قربانی کی ایک پوری تاریخ دفن تھی مگر وہ کبھی نہیں کہے گی۔ اس نے بھی مزید سوال کرنا غیر ضروری سمجھا۔ سلال کے عقب میں ایستادہ سقراط شبگیر کا کمرہ یونہی بے جان اور خاموش لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی ہو ہی نا۔ ان کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ فضا میں دور سے ابھرتی ہوئی 'اللہ اکبر' کی صدا گونجی۔ محلے کی مسجد سے فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ وہ پاکیزہ آواز سحر کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ان کے دلوں میں اتر رہی تھی۔ اذان کے بعد سلال اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد اسے فجر کے لیے نکلنا تھا اور سقراط کو ساتھ لے کر جانا تھا۔

نیمل بھی اٹھی۔ "یاد رکھنا، چاہے رزلٹ کچھ بھی ہو، تم میرے لیے ہمیشہ ٹاپر رہو گے"

سلال نے اثبات میں سر ہلایا۔ "دعا کیجیے گا کہ آج کا دن خیریت سے گزر جائے۔ مُجھے لگ رہا ہے کہ آج کچھ بہت بڑا ہونے والا ہے۔"

"جو بھی ہوگا بہتر ہوگا۔" وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گئی۔ آج پھر ان دونوں کی باتیں اتنی لمبی ہو گئی تھیں کہ نیمل کی کیس اسٹڈی بیچ میں ہی رہ گئی۔ اب وہ فجر کی نماز کے بعد اس پر کام کرنے والی تھی مگر اس سے پہلے گھر والوں کو بھی اٹھانا تھا۔ نیمل کے سیڑھیاں اترنے کے کچھ ہی دیر بعد سلال اپنے مخصوص جوش کے ساتھ سقراط کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ سلال نے دروازے پر زوردار دستک دی اور آوازیں لگانا شروع کر دیں۔

"چاچو! اُٹھیں نا چاچو! فجر کا وقت ہو گیا ہے، اٹھ جائیں۔"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ سلال نے ایک بار پھر دروازہ پیٹا۔ وہ جانتا تھا کہ سقراط اتنی آسانی سے مصلے پر آنے والا نہیں تھا لیکن سلال نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

"چاچو! میں یہیں کھڑا ہوں جب تک آپ باہر نہیں آئیں گے میں بھی یہیں کھڑا رہوں گا اور اگر میری نماز قضاء ہوئی تو جہنم میں کوڑے آپ کھائیں گے۔"

کوئی پانچ منٹ کی مسلسل مشقت کے بعد دروازہ ایک دم دھاڑ سے کھلا۔ سقراط سامنے کھڑا تھا، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں سرخ اور چہرے پر بیزاری کے تاثرات۔

" کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں سر پر سوار ہو صبح صبح؟" سقراط کی آواز میں غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

"نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔

سقراط نے اسے گھورا۔ "ہاں تو جاؤ، جا کر جماعت کرواؤ۔ مُجھے کیوں تنگ کر رہے ہو؟"

" آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ نماز آپ پر بھی فرض ہے۔" سلال نے جتانے والے انداز میں کہا۔

"مُجھے نیند آئی ہے۔" سقراط نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر سلال نے ہاتھ اٹکا کر اسے روک دیا۔

"الصلواۃ خیر من النوم۔" وہ برجستہ بولا۔ (بیشک نماز نیند سے بہتر ہے۔)

سقراط کچھ سخت کہنا چاہتا تھا، اس کے لبوں پر کڑوی کسیلی بات بھی آئی تھی لیکن سلال کی معصومیت اور ضد دیکھ کر اس نے خاموشی سے لب بھینچ لیے۔ وہ جانتا تھا یہ لڑکا اسے چھوڑنے والا نہیں۔

"تم باز نہیں آؤ گے نا؟" اس نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ اب جلدی کریں، پاپا نیچے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

پچیس منٹ بعد، شبگیر ہاؤس کا بھاری گیٹ کھلا اور تینوں مرد باہر نکلے۔ درمیان میں سلال تھا، اس کے ایک جانب سرمد صاحب تھے اور دوسری جانب سقراط۔ تینوں نے سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ سرمد اور سقراط کے درمیان برسوں کی وہ سرد دیوار ابھی بھی قائم تھی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تک نہیں تھا لیکن سلال ان دونوں کو ایک لڑی میں پرونے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا۔

" آج میرا رزلٹ ہے، آپ دونوں میرے لیے خصوصی دعا کیجیے گا۔" اس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" سرمد صاحب نے اتنا ہی کہا۔

سلال نے اب سقراط کی جانب دیکھا، "اور آپ چاچو؟ آپ دعا نہیں کریں گے؟"

"تمہاری دعائیں تو ویسے ہی عرش ہلا رہی ہوتی ہیں، میری بددعا بھی لگ جائے تو تمہارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔" انداز جلا کٹا اور تمسخرانہ تھا مگر

سلال ہنس دیا۔ آدھے جوڑے میں مقید بال اور ان پر سفید ٹوپی... بالکل ایسا لگتا تھا کوئی باغی صوفی ہو، جس نے دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچانے کے گر تو سیکھ لیے ہوں مگر اپنا دل اب بھی کسی پرانی خانقاہ میں ہی چھوڑ آیا ہو۔

"چاچو! میں سنجیدہ ہوں۔ رزلٹ اچھا آنا بہت ضروری ہے۔"

"تمہیں فرسٹ آنا چاہیے۔ بزداروں کو خاک میں ملاؤ تو بات بنے..."

"آپ تو جنگ کا میدان کھول لیتے ہیں۔ میں تو صرف ٹاپ کرنے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ٹاپ کرو یا نہ کرو، بس جھکنا مت۔"

عرب ٹاؤن کی گلیوں میں چلتے ہوئے، محلے کی یہ مسجد گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ آج سے دس سال پہلے وہ تینوں ایک ساتھ اسی گلی سے گزرتے تھے۔ تب سقراط تئیس سال کا تھا اور سلال تیرہ کا مگر تب سرمد صاحب اور سقراط میں اس قدر فاصلہ نہیں تھا۔ پھر سب بدل گیا۔ سقراط چلا گیا۔ پچھلے دس سالوں میں سلال صرف سرمد صاحب کے ساتھ جایا کرتا تھا لیکن جب سے سقراط واپس آیا تھا، یہ جوڑی اب ایک عجیب سی تکون میں بدل گئی تھی۔ سلال کو روز جلی کٹی سننی پڑتی تھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ سقراط اندر سے اس کی پرواہ کرتا تھا، چاہے وہ جتنا بھی غصہ دکھالے، سقراط شبگیر کے لیے سلال شبگیر بہت اہم تھا۔

مسجد کے قریب پہنچتے ہی سلال نے ایک بار پھر سقراط کا بازو پکڑا، "مسجد میں غصہ باہر چھوڑ کر آئیے گا کیونکہ غصہ حرام ہے۔"

سقراط نے رکتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹکا، "تم اپنی فکر کرو، میرا سر نہ کھاؤ۔"

سرمد صاحب خاموشی سے مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہ اس دوران کچھ نہیں بولے۔ انہیں خوشی تھی کہ سلال کی وجہ سے ہی سہی، سقراط کم از کم مسجد کی دہلیز تک تو آ گیا تھا۔ فجر کی ٹھنڈی ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی اور سلال کا دل رزلٹ کی امید اور اپنے خاندان کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی خواہش کے درمیان دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

بزدار پیلس کی یہ بھاری بھر کم خاموشی اس وقت حق بزدار کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ سیدھا سیکیورٹی کنٹرول روم پہنچا۔ وہاں موجود نائٹ ڈیوٹی گارڈ اسے دیکھ کر فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حق کی نظریں سکرینوں پر جمی تھیں جہاں پیلس کے ہر کونے کی حرکت ریکارڈ ہو رہی تھی۔

"پچھلے چار گھنٹوں کی تمام فوٹیج، خاص طور پر مین گیٹ اور پورچ ایریا کی، ابھی کے ابھی سسٹم سے صاف کر دو۔" اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ گارڈ نے سوال کرنے کی جرات بھی نہ کی۔ "یاد رہے، میری روانگی، میری واپسی اور اقبال کی گاڑی کی انٹری... ایک فریم بھی باقی نہ رہے۔"

جب تک سرور سے ڈیٹا مستقل طور پر ڈیلیٹ نہیں ہو گیا، حق وہیں کھڑا رہا۔ ثبوت مٹانا الفا کی فطرت میں شامل تھا، اب ریکارڈ کے مطابق حق

بزدار پوری رات اپنے بیڈروم میں موجود تھا۔ جب تسلی ہوگئی تو وہ دبے قدموں اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ لاک کرتے ہی اس نے وہ خون آلود لفافہ اپنے گاؤن کی جیب سے نکال کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ اس کا پورا وجود ہسپتال کی مخصوص بو میں بسا ہوا تھا۔ اس نے شاور آن کیا اور برفیلے پانی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ پانی کی دھاریں اس کے چوڑے کندھوں سے ٹکرا کر بہہ رہی تھیں مگر اس کا ذہن اس سفید لفافے پر جمے اس خون کے دھبے میں اٹکا ہوا تھا جس پر اسٹھیٹو سکوپ کا مونوگرام بنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لفافہ محض اتفاق نہیں، ایک پیغام تھا۔ شاید یہ وہی پیغام تھا جسکا اسے انتظار تھا۔ شاور لینے کے بعد، گیلے بالوں کے ساتھ وہ اسٹڈی روم میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ حق کی ذاتی علمی سلطنت تھا۔ دیواروں پر چھت تک لگی الماریاں میڈیکل کی بھاری بھرکم کتابوں اور ریسرچ پیپرز سے بھری تھیں۔ کمرے کے وسط میں اخروٹ کی لکڑی کی ایک بڑی میز تھی جس پر اس کا لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ اس نے قدرے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ حلق میں کانٹے اگ آئے تھے جبکہ ہونٹ خشک پڑ گئے۔ لفافہ خاک ہوتے ہی اندر سے ایک چھوٹی سی کالے رنگ کی یو ایس بی (USB) برآمد ہوئی۔ حق کا دل سینے کے پنجرے میں قید کسی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور یو ایس بی پلگ کر دی۔ سکرین پر ایک ڈائیلاگ باکس نمودار ہوا جو پاس ورڈ مانگ رہا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر اسکرین کی ہلکی نیلی روشنی تھی جو اس کی گہری نیلی آنکھوں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھی۔

" آپ کی زندگی کا ناقابلِ فراموش دن؟" پاسورڈ اس سوال کا جواب تھا۔ اس کے جبڑے بھینچے گئے۔ کیا یہ یو ایس بی بھیجنے والا اس کی زندگی کے اس ناقابلِ فراموش دن سے واقف تھا؟ اس نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ آنکھوں میں ضبط کی سرخی ابھری۔ اس کی زندگی میں خوشی کا تو کوئی ایسا دن نہ تھا مگر ایک سیاہ تاریخ تھی جو اس کے حافظے میں کسی رستے ہوئے زخم کی طرح محفوظ تھی۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے چلیں، اس نے وہ تاریخ درج کی جسے وہ بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہ سکا... گیارہ مارچ! اور پاس ورڈ کھل گیا۔

اندر ایک فولڈر تھا جس میں حالیہ تاریخوں کے نام سے مزید کئی ذیلی فولڈر بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک فولڈر پر کلک کیا۔ سکرین پر تصویریں اور چھوٹی چھوٹی ویڈیوز لوڈ ہونے لگیں۔ جیسے جیسے فائلیں کھلتی گئیں، حق کا چہرہ سپید پڑتا گیا۔ اس کے جبڑے اتنی سختی سے بھنچ گئے کہ گردن کی رگیں تن گئیں۔ آنکھیں گہری بے یقینی کے ساتھ جلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے ایک کے بعد ایک تین چار فولڈر کھولے اور پھر اس کا وجود جیسے لاوے کی طرح پھٹنے کو تیار ہو گیا۔ سکرین پر جو کچھ تھا، وہ حق بزدار کی غیرت، اس کے مان اور اس کی وفا کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وجود میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ایک پل کو دل کیا سب تہس نہس کر دے مگر وہ کافی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور اس مزید دیکھنے کی سکت نہیں رکھ پایا۔ ایک جھٹکے سے اس نے لیپ ٹاپ کی سکرین گرا دی، جیسے وہ ان مناظر کو اپنی یادداشت سے بھی مٹانا چاہتا ہو۔

"مجھے تم سے خلع چاہیے حق بزدار!" سلوئی کی آواز اس کی سماعت میں کسی زہریلے تیر کی طرح گونجی۔

" کیا تم نے مجھ سے وفا کی ہے؟" اسے اپنا ہی سوال اب ایک بھیانک مذاق محسوس ہوا۔

آہ! یہ عورت... جس کے لیے اس نے اپنی پوری زندگی ایک ڈھال بنا دی تھی، کیا وہ واقعی اتنی بے وفا ہو سکتی تھی؟ کیا بز داروں کے الفا کی پیٹھ میں اپنوں نے ہی چھرا گھونپ دیا تھا؟ وہ کرسی سے اٹھا، اس کا پورا وجود جل رہا تھا۔ کمرے کی گرماہٹ اسے اب تپا رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں اب کسی زخمی درندے کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ اسے سمجھ آ رہا تھا کہ وہ ایکسیڈنٹ، وہ شخص، وہ لفافہ اور یہ یو ایس بی... یہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں تھیں۔ اسے جو چاہیے تھا وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہی اس کی خواہش کی تھی مگر اب... اب نے شدت سے چاہا تھا کہ کاش کہ یہ لفافہ اس تک نہ پہنچا ہوتا۔

☆☆☆☆☆

فریش ہونے کے بعد ثالث نے بستر پر لیٹ کر نیند کی وادیوں میں پناہ لینی چاہی مگر بند آنکھوں کے پیچھے سڑک پر بہتا وہ سرخ لہو اور ٹوٹے ہوئے لوہے کی آوازیں پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے، پیاس کی شدت سے اس کی زبان تالو سے چپک رہی تھی۔ کمرے میں رکھا پانی کا جگ وہ ختم کر چکا تھا مگر پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر کار وہ کمرے سے نکلا اور ننگے پاؤں سیڑھیاں اتر کر نیچے ڈائننگ ہال کی طرف بڑھا۔ ابھی فجر کا وقت تھا، ڈائننگ ہال کی گلاس روف (شیشے کی چھت) سے اوپر کا آسمان گہرا نیلا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کچن کے قریب پہنچا، سامنے سے عالیہ آتی دکھائی دی۔ ثالث ایک دم ٹھٹھک گیا۔ عالیہ نے ٹراؤزر شرٹ پر ایک بڑا سا دوپٹہ نماز کے انداز میں سر اور سینے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بلیک ٹی کا مگ تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔

"تم آج لیٹ آئے ہو؟" عالیہ نے مگ ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ متجسس تھا۔ ثالث کے چہرے کا رنگ پل بھر میں بدلا۔ اسے لگا جیسے اس کے ماتھے پر بڑا بڑا 'مجرم' لکھا ہو۔ اس نے تھوک نگلا اور خود پر قابو پاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

"نہیں تو... میں رات میں ہی واپس آ گیا تھا۔"

عالیہ کی پیشانی پر لکیر ابھری۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "اچھا؟ میں تمہارے کمرے میں گئی تھی، تم وہاں نہیں تھے۔"

ثالث بری طرح سٹپٹایا مگر فوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں باتھ روم میں ہوں گا... مگر تم؟ تم اتنی صبح صبح یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے بات کا رخ بدل دیا۔

اب سٹپٹانے کی باری عالیہ کی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے ہالے میں پل بھر کو سرخ پڑا۔ وہ جو ہمیشہ اعتماد سے بات کرتی تھی، اس وقت بالکل ایسے لگی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ اس نے نظریں مگ میں موجود سیاہ مائع پر جما دیں۔

"وہ...وہ میں نماز کے لیے اٹھی تھی۔" اس نے بمشکل جواب دیا۔

ثالث کے چہرے پر حیرت کے نقش ابھرے۔ "واقعی؟"

عالیہ خفت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے دیواروں میں پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔ اسے شدید شرمندگی نے آ گھیر لیا تھا۔

"ہاں...وہ...میں نے سنا ہے اس وقت دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ زنیرہ کہہ رہی تھی کہ سلال شبگیر اس لیے ہر بار ٹاپ کرتا ہے کہ وہ ساری نمازیں پڑھتا ہے۔ تو میں نے سوچا کہ..."

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کیوں بتا رہی تھی؟ اور وہ یہ سب کیوں کر رہی تھی؟ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سنگِ مرمر کا فرش پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ ثالث ایک لمحے کے لیے اپنا کرب، وہ ایکسیڈنٹ اور وہ خوف بھول گیا۔ اسے عالیہ کی اس معصومانہ ضد پر ہنسی آئی۔ اس نے سر اٹھا کر گلاس روف سے باہر دیکھا جہاں اندھیرا اب چھٹنے کو تھا اور سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔

"اچھی کوشش ہے۔" وہ ایک مختصر جملہ کہہ کر اس کے قریب سے گزرا اور کچن میں داخل ہو گیا۔ کچن ابھی خاموش تھا۔ شیبا کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ عالیہ وہیں ساکت کھڑی رہی مگ تھامے اپنے لب کترتی رہی۔ اس نے زندگی میں کبھی ناکامی کا ذائقہ نہیں چکھا تھا اور سلال شبگیر کی برتری اس کے لیے زہر بن چکی تھی۔ اس نے اپنی ذہانت، اپنا غرور، اپنی محنت سب آزما لیا تھا، اب یہ دعا کا آخری حربہ تھا جسے وہ آزما رہی تھی۔ اگر یہ بھی ناکام ہو جاتا تو؟ نہیں...اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکتی تھی۔ ایک جھرجھری سی لی اور اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ثالث کچن سے پانی کی بوتل اٹھا کر باہر آیا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تم نے رزلٹ کو کچھ زیادہ ہی سر پر سوار کر لیا ہے۔ اناؤنسمنٹ شام میں ہو گی، جا کر سو جاؤ پلیز۔" ثالث نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ خود اتنا بے چین تھا کہ عالیہ کی یہ ذہنی کیفیت اسے مزید الجھا رہی تھی۔

"ثالث! کیا دعائیں صرف اچھے لوگوں کی ہی قبول ہوتی ہیں؟" وہ سر اٹھائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ ثالث نے بوتل منہ سے ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ نظریں جھکا گئی، اب دونوں ہاتھوں سے کپ تھامے، اس کے پیندے میں چمکتی کافی کو دیکھ رہی تھی۔ آواز اور لہجے میں ایک انجانا سا ڈر تھا۔ ثالث نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

"میں نہیں جانتا..." اس نے ایک بار پھر اوپر آسمان کو دیکھا جہاں سیاہی اب نیلاہٹ میں بدل رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ نیلاہٹ دو نیلی آنکھوں میں بدل گئی۔ وہ سرد، تنبیہہ کرتی آنکھیں۔

"آج رات کچھ ہوا ہی نہیں، بھول جاؤ سب..." الفا کا حکم اس کی سماعت میں گونجا۔

ثالث نے رخ موڑا اور سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے رک کر عالیہ کو دیکھا۔

"جیت صرف نمبروں سے نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو اس قدر مت تھکاؤ کہ اگر نتیجہ تمہارے حق میں نہ آئے تو تم ٹوٹ جاؤ۔ دعا ضرور کرو مگر اس یقین کے ساتھ کہ تم نے اپنی محنت کر لی ہے۔ باقی سب قسمت ہے۔"

عالیہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس سے ایک سال چھوٹا تھا مگر آج اس کی باتوں میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور بوجھ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس ایک رات نے ثالث بزدار کو کتنا بدل دیا تھا۔ آزاد پنچھی قید ہو چکا تھا، اور عالیہ؟ عالیہ ابھی تک اپنی انا کے قید خانے میں جیت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور شبگیر ہاؤس کا کچن اس وقت اشتہا انگیز خوشبوؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سرسوں کے ساگ کے تڑکے کی مخصوص مہک پورے ڈائننگ ہال میں پھیلی ہوئی تھی، جو سرد صبح کی خنکی میں ایک عجیب گھریلو اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی۔ زہرہ بیگم کچن میں چولہے کے پاس کھڑی مہارت سے پراٹھے بیل رہی تھیں مگر وہ اکیلی نہیں تھیں۔ سلال اس وقت ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح اپنی ماں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ وہ گرم گرم پراٹھے پلیٹ میں رکھ کر باہر ڈائننگ ٹیبل پر سجا رہا تھا۔ یوں جیسے یہ اس کا پسندیدہ کام ہو۔ ڈائننگ ٹیبل پر تارہ اور نوفہ اپنے اسکول کے یونیفارم میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ سفید یونیفارم پہ گہرا میرون رنگ کا کوٹ جسکی دونوں جیبوں پر سکول کا نام کنندہ تھا۔ نوفہ نے پونی ٹیل کر رہی تھی جبکہ تارہ کے بال تھے ہی گردن تک۔ اس نے ایک جانب کی مانگ نکال رکھی تھی اور اس کے سیاہ چمکتے چھوٹے بال بھلے لگ رہے تھے۔ سلال نے بڑی محبت سے ان کے سامنے پلیٹیں رکھیں اور پھر ان کے لنچ باکس پیک کرنے لگا۔ وہ بڑے سلیقے سے سینڈوچز کے ساتھ ڈرائی فروٹس اور نٹس رکھ رہا تھا تاکہ وہ دونوں دن بھر توانا رہیں۔

"افو! آج پھر ساگ کے پراٹھے؟" تارہ نے پلیٹ میں موجود ساگ کو دیکھ کر بری طرح ناک منہ چڑایا۔ "بھائی! کوئی پراٹھا یا ساگ بھی روز روز کھاتا ہے؟"

سلال کچھ جواب دیتا، اس سے پہلے چغلی خان نے اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے سماعت میں چبھنے والی آواز نکالی۔

"ہاں! آج پھر کھاؤ، ورنہ ڈنڈا کھاؤ!"

"تم سے کسی نے پوچھا چغلی خان؟" سلال نے ٹیفن بند کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"مٹھو بولو... مٹھو! سلال جھوٹا، سلال جھوٹا!" چغلی خان نے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے شور مچایا۔ سلال شبگیر نے زندگی میں ایک بار ہی جھوٹ بولا ہوگا۔ وہ بھی فون پر بات کرتے ہوئے اور اس دن بدقسمتی سے چغلی خان نے سن لیا تھا۔ بس اس دن کے بعد سلال 'جھوٹا' مشہور ہو گیا اور اس دن کے بعد سے سلال اور مٹھو کی بگڑ گئی۔ سلال نے اسے چغلی خان کا نام دیا اور مٹھو نے اسے سلال جھوٹے کا۔ نہ وہ ایک دوسرے کے بنا رہ سکتے تھے اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ۔

"لوگ صبح صبح ایوکاڈو (Avocado) کھاتے ہیں اور ایک ہم ہیں جو ساگ کھا رہے ہوتے ہیں۔" تارہ نے اپنی تلملاہٹ جاری رکھی۔

اسے ساگ خاص پسند نہیں تھا لیکن دیسی گھروں میں ساگ کو بہت عزت اور رتبہ دیا جاتا ہے اور شبگیر خاندان میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ دادی اور زہرہ بیگم دونوں کو ساگ بے حد پسند تھا۔

”شکر کرو امی اچھا ساگ بناتی ہیں ورنہ لوگوں کو پکانا تک نہیں آتا۔“ سلال نے اس کے سر پہ چپت لگائی جبکہ تارہ پراٹھا چھوڑ کر ٹوسٹ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ کم از کم وہ ہر صبح پراٹھے نہیں کھا سکتی تھی۔ کھانے کی پلیٹ کے قریب اپنا ریکارڈنگ کیمرہ رکھے، ایک ہاتھ سے ٹوسٹ کھاتے دوسرے سے ریکارڈنگ کیمرہ کے بٹن دباتے وہ کافی محو لگ رہی تھی۔ اسی دوران سرمد صاحب شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے وقار کے ساتھ کرسی سنبھال چکے تھے۔ ان کے ساتھ ہی کمالہ بیگم (دادی) بھی آ بیٹھی تھیں۔ دادی کے چہرے کے تاثرات تنے ہوئے تھے۔ انہیں سلال کا یوں کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹانا قطعی پسند نہیں تھا۔ گھر میں زہرہ بیگم کے علاوہ نیمل، نامرہ، تارہ اور نوفہ بھی تھیں مگر سلال کا جھکاؤ ہمیشہ گھریلو کاموں کی طرف رہتا تھا۔ لڑکیوں کو کام کرنے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔ دن میں ایک کام والی آتی تھی جو صفائی ستھرائی کر جاتی تھی مگر کھانا زہرہ بیگم خود بناتی تھیں اور لانڈری وہ چاروں بہنیں مل کر ہفتے کے آخر میں کرتی تھیں۔ گھر کا نظام اچھا چل رہا تھا مگر سلال... اسے اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا پسند تھا۔ اسے تارہ اور نوفہ کا ٹیفن پیک کرنا پسند تھا۔ وہ ڈاکٹر بننے جا رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس عمر میں ان کی نشوونما کے لیے کیسی خوراک ضروری تھی۔ اس وقت بھی دادی کچھ بولی نہیں تھیں مگر ان کی خاموش نظریں سلال کے ہر قدم کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ سلال کی اس 'غیر مردانہ' عادت پر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں۔ سرمد صاحب نے حسب معمول ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا تاکہ صبح کی خبریں دیکھ سکیں۔

”جلدی کھا لو تارہ! وین آنے والی ہے۔ تم لیٹ کرواؤ گی۔“ نوفہ نے مزے سے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے تارہ کو ٹہوکا دیا۔ وہ تارہ کے برعکس ساگ کی شوقین تھی۔ اور وہ تارہ کی اس ریکارڈنگ والی عادت سے اکثر پریشان ہو جاتی تھی۔ ناشتے کی بڑھتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبو اوپر پہنچی تو سیڑھیوں سے جوتوں کی چاپ سنائی دی۔ نیمل اب نیچے اتر رہی تھی۔ ناشتے کی خوشبو نے اس کی بھوک کو مزید بڑھا دیا۔

”واہ۔ امی! آج تو خوشبو نے دل جیت لیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کرسی کھینچی اور سرمد صاحب کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”نیمل آپی آ گئیں! سلال ڈر گیا! سلال ڈر گیا!“ چغلی خان نے پھر سے راگ الاپنا شروع کر دیا۔

سلال نے ایک گہرا سانس لیا اور گھور کر اسے دیکھا جو اب ڈائننگ ٹیبل کے اوپر چکر کاٹ رہا تھا۔

”اگر تم اب بولے تو تمہارا ہری مرچوں کا کوٹہ بند کر دوں گا، سمجھے؟“

مٹھو نے اپنی گردن ٹیڑھی کی اور معصومیت سے بولا۔

”سلال بھائی... رزلٹ ڈے... پٹائی ڈے! پٹائی ڈے!“

چچ چچ چچ... آخر وہ اتنا صاف کیوں بولتا تھا؟ جس خوبی نے سلال کو اسے خریدنے پر مجبور کیا تھا وہ اب الٹا اس کے گلے پڑ چکی تھی۔ پورے ڈائننگ ٹیبل پر مسکراہٹیں پھیل گئیں سوائے دادی کے، جن کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ سرمد صاحب نے مسکراتے ہوئے سلال کی طرف دیکھا۔

"چغلی خان کی باتوں پر مت جاؤ سلال، مُجھے یقین ہے کہ آج تم شبگیر ہاؤس کا نام روشن کرو گے۔" ان کی حوصلہ افزائی نے سلال کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑا دی۔ زہرہ بیگم کچن سے باہر آئیں اور ان کے ہاتھ میں چائے کا تھرمس تھا۔ سلال اب سب کے سامنے چائے کے کپ رکھ رہا تھا تا کہ زہرہ بیگم چائے ڈال سکیں۔ وہ چھیالیس سالہ ایک گھریلو خاتون تھیں۔ یقیناً وہ آج سے دس سال پہلے بہت خوبصورت رہی ہوں گی مگر اب دل کی بیماری نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ان کی بیٹیوں کو صاف رنگت ان سے ہی ملی تھی۔

چغلی خان اب ڈائننگ ہال کے جھومر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

"ساگ... ساگ... سلال کا دماغ باغ باغ!" سلال کی دھمکی پر اس نے جھومر پر جھولتے ہوئے ایک اور نعرہ لگایا۔

تارہ نے ہنستے ہوئے ایک بادام اس کی طرف اچھالا۔ چغلی خان نے کمال پھرتی سے ہوا میں ہی اسے اپنی مڑی ہوئی سرخ چونچ سے کیچ کیا اور پھر اپنے ایک پنجے میں پکڑ کر مزے سے کترنے لگا۔

"دیکھا سلال بھائی؟ یہ نوفہ سے زیادہ تمیزدار ہے کم از کم بادام تو کھاتا ہے۔" تارہ نے ساتھ بیٹھی نوفہ کو چھیڑا جس کی بادام کھاتے جان جاتی تھی۔

"تمیز اور یہ؟ ہنہہ! ابھی تھوڑی دیر میں جب آپی کے کسی کیس کی فائل کتر دے گا یا پاپا کے موزے چھپا دے گا، تب اسے تمیز یاد آئے گی۔" سلال نے تپتے ہوئے کہا۔

چغلی خان نے بادام ختم کیا اور اڑتا ہوا سیدھا سلال کے کندھے پر آ بیٹھا۔ اس نے اپنی لمبی دم سلال کی گردن پر لہرائی۔ جس سے سلال کو گدگدی ہوئی۔ اب وہ پیار جتانے آیا تھا۔ مالک سے اَن بَن اپنی جگہ مگر محبت اپنی جگہ...

"رزلٹ... رزلٹ... عالی... یہ... ٹھاہ!" اس نے سلال کے کان کے قریب ہوتے ہوئے دھماکے کی آواز نکالی۔ اسے عالیہ کا نام لیتے ہوئے مشکل پیش آتی تھی اس لیے توڑ مروڑ کر لیتا تھا۔

سلال نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ پوری قوت سے اس کی شرٹ کے دھاگے پکڑ کر جم گیا۔ دادی نے ناپسندیدگی سے ایک نظر مٹھو پر ڈالی۔ وہ ایک تنگ مزاج خاتون تھیں جنکا مزاج پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہو جاتا تھا۔ کبھی چغلی خان انکا بیٹا بن جاتا تھا اور کبھی وہ انہیں نحوست اور گندگی پھیلانے والا پرندہ لگتا تھا مگر چغلی خان کو دادی کی ناراضی کی کبھی پرواہ نہیں رہی تھی۔ وہ تو بس سلال کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

"اچھا بابا! اب ہٹو، مُجھے بھی ناشتہ کرنا ہے۔" سلال نے اسے پیار سے پچکارا تو وہ اڑ کر نیمل کی کرسی کی پشت پر جا بیٹھا اور وہاں سے دادی کو آنکھیں دکھانے لگا۔ نیمل نے ہنستے ہوئے اپنے بال بچائے ورنہ وہ اس کے بالوں میں چونچ گھسانے سے نہیں کتراتا تھا۔ اسے نیمل کے بال پسند تھے اور ان کی خوشبو اور بھی زیادہ اچھی لگتی تھی۔

"چغلی خان کی پیشگوئیاں اکثر سچ ثابت ہوتی ہیں، دیکھنا آج تم واقعی ٹھاہ کر کے بزداروں کا غرور توڑ دو گے۔" نیمل خلاف توقع اچھے موڈ میں تھی۔

جبکہ نوفہ نے نیمل کو گہری نظروں سے دیکھا۔نوفہ کے لیے نیمل محض ایک بہن نہیں تھی بلکہ اس کے پسندیدہ ناولوں کا وہ مرکزی کردار تھی جس میں رعب، ٹھہراؤ اور ذہانت کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔وہ اکثر بنا کہے نیمل کے چھوٹے چھوٹے کام کر دیا کرتی تھی صرف اس کے قریب رہنے کے لیے،اس کی پسندیدہ بہن بننے کے لیے جبکہ نیمل اس کی کوششوں سے واقف تھی۔اس لیے ہمیشہ وہ اسے کتابیں لا کر دیتی تھی۔اس وقت بھی نوفہ چائے پیتے ہوئے گھریلو حلیے میں ناشتہ کرتی نیمل کو دیکھ رہی تھی۔نیمل نے ہاٹ پاٹ کھولا اور دھواں اڑتا ہوا ساگ کا گرما گرم پراٹھا نکال کر سرمد صاحب کی پلیٹ میں رکھا۔میز پر لوازمات کی کمی نہیں تھی۔ایک طرف ساگ کا پیالہ تھا تو دوسری طرف مکھن،اچار،دہی،ابلے ہوئے انڈے،ٹوسٹ اور جیم بھی موجود تھے۔مگر شبگیر ہاؤس کی روایت تھی کہ جس دن زہرہ بیگم کے ہاتھ کے ساگ والے پراٹھے بنتے،اس دن باقی سب چیزیں ثانوی ہو جاتیں۔اسی دوران دادی نے ادھر ادھر دیکھا اور تھوڑی بے چینی سے بولیں۔

" کوئی نامرہ کو بھی اٹھا دو، ناشتے کی میز سونی لگ رہی ہے۔" دادی کو نامرہ سے خاص لگاؤ تھا،شاید اس لیے کہ وہ ان کی طرح تھوڑی منہ پھٹ اور ضدی تھی۔سلال نے دادی کے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دادی! آپ کو پتا تو ہے اس کا کالج گیارہ بجے شروع ہوتا ہے۔وہ اتنی جلدی کبھی نہیں اٹھتی۔"

اس وقت سادہ پینٹ اور گول گلے والی شرٹ میں سلال کی شخصیت بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔صبح کی روشنی اس کی شفاف رنگت اور گہری بھوری آنکھوں کو مزید واضح کر رہی تھی جیسے وہ خود اس تازہ دم صبح کا ایک حصہ ہو۔

"اور سقراط؟ سقراط کیوں نہیں آیا ابھی تک؟" کچن سے زہرہ بیگم کی بلند ابھری۔

"چاچو نماز کے بعد سو گئے تھے امی! اب مشکل سے ہی اٹھیں گے۔" سلال نے تھرمس میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی نہیں! وہ اٹھ چکے ہیں اور تیار بھی ہو رہے ہیں۔" نیمل نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے سکون سے اطلاع دی۔"انہیں کالج جانا ہے۔ ان کی جاب ہو گئی ہے۔"

نیمل کی اس بات پر جیسے ڈائننگ ٹیبل پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔تارہ اور نوفہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا،دادی کا چائے کا پیالہ ہوا میں ہی معلق ہوا جبکہ نوالہ توڑتے ہوئے سرمد صاحب کا ہاتھ پل بھر کو فضا میں ساکت ہوا۔ٹی وی پر چلنے والی خبروں کی ہلکی آواز اس خاموشی میں مزید واضح ہو گئی۔

"جاب؟" دادی نے سوالیہ نظروں سے نیمل کو دیکھا۔ان کے لہجے میں فکرمندی نمایاں تھی۔"اس نے ہم سے تو ذکر نہیں کیا؟ کہاں جاب ملی ہے اسے؟"

نیمل نے چائے کا سپ لیا اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے جواب دیا۔

" قادری کالج میں، اسپورٹس کوچ کے طور پر۔آج ان کا پہلا دن ہے۔"

دادی کے ماتھے پر تیوری چڑھی۔" قادری کالج؟ اسکا تو بزداروں سے چھتیس کا آکڑا ہے۔"

" تبھی تو وہ وہاں کوچ بنے ہیں..." سلال کی بڑبڑاہٹ دھیمی تھی مگر سب سن سکتے تھے۔وہ اب نیمل کی طرف دیکھ رہا تھا۔شاید وہ معاملہ

سنبھال لے۔

"تو آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ وہ چھپ کر بیٹھے رہیں؟ اب پاکستان واپس آ ہی گئے ہیں تو انہیں کام کاج کرنا ہی ہوگا اور دادی میں تو کہتی ہوں اب چاچو کی عمر ہو چکی ہے۔ برائے مہربانی ہمارے لیے چاچی ڈھونڈیں۔" اس کے آخری الفاظ نے ماحول کا تناؤ کم کر دیا۔ سرمد صاحب خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ رات میں ہی سقراط سے دو دو ہاتھ ہو چکے تھے۔ ابھی انہیں خاموش رہنا تھا۔

"میں تو آج بیاہ دوں اسے مگر یہ نافرمان میری بات مانے تب نا..." سقراط کی شادی کے ذکر پر دادی کے دل کو ہاتھ پڑ چکا تھا۔

"اور کیا دادی... چاچو کے سبھی پرانے دوستوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بچے ہیں ان کے اور ایک چاچو ہیں کہ بالوں کا جوڑا کیے، ہاکی اٹھائے گھومتے رہتے ہیں۔ بے لگام گھوڑے کو لگام ڈالنی چاہیے۔" وہ سیڑھیوں پہ بوٹوں کی آہٹ سن چکی تھی تبھی دادی کو مزید تیار ہی تھی۔

سیڑھیوں پر بوٹوں کی بھاری چاپ مزید واضح ہوئی اور چغلی خان اڑ کر ڈور بیل کے اوپر جا بیٹھا اور پھر سے چلایا۔

"خطرہ! خطرہ! شیر آیا! شیر آیا!"

سقراط آستینیں چڑھائے نیچے آ رہا تھا۔ سیاہ رنگ کا ٹریک سوٹ پہنے اور بالوں کو کھلا چھوڑے وہ اب نچلے زینے تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے گھنے اور سنہری مائل بھورے بال کسی شیر کی ایال کی طرح اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ وہ جب سر جھٹک کر بات کرتا، تو بالوں کا وہ گھنا والیم اس کی شخصیت میں mufasa جیسی ہیبت لے آتا تھا۔ زیادہ تر سقراط بالوں کو آدھے جوڑے میں باندھ کر رکھتا تھا اور اس وقت وہ کھلے ہوئے تھے اس لیے مٹھو سقراط کو دیکھتے ہی شیر شیر چلانے لگتا تھا۔ وہ تارہ اور نوفہ کے ساتھ لائن کنگ دیکھ چکا تھا اور ان دونوں کے تبادلہ خیال پر ہی مٹھو نے سقراط کو شیر سے تشبیہہ دے دی تھی۔ سقراط کے ڈائننگ ہال میں قدم رکھتے ہی فضا میں ایک غیر محسوس سا تناؤ لہرایا۔ سرمد صاحب نے نظریں نہیں اٹھائیں، ان کے سپاٹ تاثرات بتا رہے تھے کہ رات والی بحث ابھی ان کے ذہن میں تازہ ہے۔

"السلام علیکم!" سقراط نے اپنی مخصوص کھردری مگر بے نیاز آواز میں سب کو مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!" سلال نے اپنی شرارتی آنکھیں سقراط پر جماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دادی کے ساتھ والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ کمالہ بیگم کو اپنے دونوں بیٹوں سے بے پناہ محبت تھی مگر سرمد کی موجودگی میں وہ سقراط کی طرف جھکاؤ دکھانے سے کتراتی تھیں، کہیں بڑے بیٹے کی ناراضی مول نہ لینی پڑے۔ اس وقت بھی وہ ناشتے کی پلیٹ میں مگن، انجان بنی رہیں۔

"سقراط!" زہرہ بیگم کچن سے باہر نکلیں، ان کے چہرے پر ایک ممتا بھری چمک تھی۔

"جی بھابھی!" سقراط کے لہجے میں زہرہ بیگم کے لیے ہمیشہ ایک خاص احترام ہوتا تھا جو شاید گھر کے کسی اور فرد کے لیے نصیب نہیں تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو بھئی! سنا ہے تمہاری جاب ہو گئی ہے۔ اب اچھے سے کام کرنا اور کھانا پینا ٹھیک رکھنا، سمجھے؟" انہوں نے سقراط کے لیے پراٹھا نکالتے ہوئے کہا۔

"بھابھی کا چمچا..."سرمد صاحب چائے کا سپ لیتے ہوئے ہولے سے بڑبڑائے۔ان کا لہجہ اتنا دھیما تھا کہ صرف قریب بیٹھے لوگوں نے ہی سنا مگران کی نظریں اب بھی اپنے کپ پر جمی تھیں۔دادی نے بھی بات سنی ان سنی کر دی اور پراٹھے کا نوالہ توڑنے میں مصروف رہیں۔سقراط نے سرمد صاحب کی بات کو نظرانداز کیا اور اپنی نظریں سامنے بیٹھی نوفہ اور تارہ پر جمائیں، جو اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی خلائی مخلوق ان کے دسترخوان پر آ بیٹھی ہو۔

"کیا دیکھ رہی ہو دونوں؟ اسکول جانے کا ارادہ نہیں ہے یا آج چغلی خان کی ڈیوٹی تم سنبھال رہی ہو؟"اس نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

"چاچو! آپ سچ میں کوچ بن گئے ہیں؟ کیا اب آپ سلال بھائی کو بھی ڈرل کروائیں گے؟"

سقراط نے پراٹھے کا نوالہ ساگ میں ڈبویا اور بڑے مزے سے گویا ہوا۔

"سلال کو؟ اسے تو میں گراؤنڈ کے دس چکر لگواؤں گا، اس کی چربی بہت بڑھ گئی ہے۔"

"چاچو! بھائی کی چربی نہیں، ان کا دماغ بڑھ گیا ہے۔یونو ڈاکٹروں والا غرور.."

تارہ نے ہنستے ہوئے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

"اوہو! ڈاکٹر؟"سقراط نے ایک طنزیہ نظر سلال پر ڈالی جو اب فون نکالے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔"ڈاکٹر صاحب! ذرا میرا معائنہ تو کیجیے، میرا غصہ آج کل قابو میں نہیں رہ رہا، کوئی کڑوی گولی ہے آپ کے پاس؟"

"چاچو! آپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے والی دوا تو آج تک بزدار فارماسیوٹیکل والے بھی نہیں بنا پائے...میں معمولی سا انسان ہوں۔"وہ فون پر ٹائپنگ کر رہا تھا مگر جواب دینا ضروری سمجھا۔

سقراط کا ہاتھ پل بھر کو رکا۔اس کی آنکھوں میں ایک گہری، پراسراری چمک ابھری۔

"انہیں علم ہونا چاہیے کہ میدان میں جب شبگیر اترتا ہے تو قواعد بدل جاتے ہیں۔"

میز پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔چغلی خان جواب تک خاموش تھا، اڑ کر سقراط کے کندھے پر آ بیٹھا اور اپنی باریک آواز میں پھر سے چلایا۔

"گولی...ٹھاہ...ٹھاہ!"

یہ سنتے ہی سقراط نے مٹھو کو بازو پر بٹھایا اور اسے ساگ والا نوالہ پیش کیا۔"دیکھا! اسے کہتے ہیں سمجھدار پرندہ۔اسے پتا ہے کہ آج کا دن ٹھاہ ٹھاہ والا ہی ہے۔"

سرمد صاحب نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی، ایک گہری نظر دسترخوان پر بیٹھے اپنے بچوں اور بھائی پر ڈالی۔چند سرخ نوٹ نکال کر تارہ اور نوفہ کے سامنے رکھے اور پھر خاموشی سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔وہ ایک اصول پسند باپ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اور سقراط کی بدمزگی بچوں کے سامنے آئے۔ان کے جاتے ہی جیسے فضا پر چڑھا ہوا ایک بوجھل اور سرد پردہ ایک دم اتر گیا۔ماحول میں دوبارہ جان پڑ گئی۔

"چاچو! سچ بتائیں، آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟" تارہ نے شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔ "مطلب اتنے سالوں بعد، اتنے سارے سٹوڈنٹس... آپ کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ آج کل کے بچے کتنے تیز ہو گئے ہیں۔" باہر گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔

"تارہ بیٹا، میں نے ان شیروں کو سدھایا ہے جن کے سامنے آج کل کے یہ ٹماٹر بچے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ تم بس دیکھتی جاؤ، تمہارے چاچو گراؤنڈ میں کیسے آگ لگاتے ہیں۔"

"آگ نہ ہی لگائیں تو بہتر ہے چاچو! کہیں فائر بریگیڈ نہ بلانی پڑ جائے۔" سلال فون پینٹ کی جیب میں ڈالتے پھر سے متوجہ ہوا۔ نیمل اور نوفہ بھی اس گفتگو میں شامل ہو گئیں اور دسترخوان پر مسکراہٹوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ سب کچھ بہت متوازن اور خوشگوار تھا، جب اچانک لاؤنج میں لگے بڑے ٹی وی کی اسکرین پر ایک نئی لہر ابھری۔

'نشاطِ صبح' پروگرام شروع ہو چکا تھا اور نشاط بزدار اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسکرین پر نمودار ہوئیں۔ وہ مخصوص میزبان کے انداز میں کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں اور آج کے خاص مہمان کا تعارف کروا رہی تھیں۔

"یہ کتنی خوبصورت ہیں نا؟" تارہ کے لبوں سے بے اختیار ستائش نکلی۔ وہ نشاط کے اسٹائل اور خوبصورتی سے ہمیشہ متاثر رہتی تھی۔

"جی نہیں! نجف خالہ زیادہ پیاری ہیں۔" نوفہ نے فوراً تصحیح کی۔

نوالہ توڑتے سقراط کے ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے۔ ٹی وی اس کی پشت پر تھا، اسے نشاط نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی آواز... وہ آواز کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اترنے لگی۔ اس کے گلے میں جیسے کانٹے اگ آئے اور ادھورا نوالہ وہیں اٹک گیا۔ کمالہ بیگم نے اپنی دھندلی آنکھوں سے بیٹے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھی۔ سلال اور نیمل نے بھی یہ لرزش محسوس کی۔ نوفہ اور تارہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے پشیمان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تارہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، جیسے وہ خود کو کوس رہی ہو کہ اس نے یہ بات شروع ہی کیوں کی۔ سقراط نے کپکپاتے ہاتھوں سے ادھورا نوالہ پلیٹ میں چھوڑا اور پانی کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس کی گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ ماحول کے اس دم گھٹتے ہوئے تناؤ کو کم کرنے کے لیے نیمل فوراً بول اٹھی۔

"چاچو! آپ آج مُجھے کورٹ چھوڑ دیں گے؟ آج میرا ایک اہم کیس ہے اور پاپا اپنی گاڑی لے گئے ہیں۔"

"نہیں۔" سقراط کا جواب مختصر اور بے مروت تھا۔ "مُجھے دیر ہو رہی ہے۔ تم سلال کے ساتھ جانا۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے کھلے بال گردن کو چھو رہے تھے اور اس کی چال میں پرانی وحشت لوٹ آئی تھی۔ نیمل نے ایک گہری، تاسف بھری سانس لی اور اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"چاچو کا زخم ابھی بھرا نہیں ہے۔" سلال نے دھیرے سے کہا اور کچن کی جانب چلا گیا۔ اتنے میں باہر اسکول وین کا ہارن گونجا۔ نوفہ اور تارہ، جو اس خاموشی سے گھبرا رہی تھیں، لپک کر اٹھیں۔ انہوں نے جلدی جلدی اپنے بیگ اٹھائے، لنچ باکس سمیٹے اور دادی کو دعا کا کہہ کر باہر کی جانب بھاگیں۔ گھر میں اب صرف سلال، نیمل، سوئی ہوئی نامرہ، زہرہ بیگم اور دادی رہ گئے تھے۔ نیمل نے ٹی وی بند کر دیا۔ اسکا نشاط

بزدار کو دیکھنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔اس کی کورٹ جانے کی بات پر زہرہ بیگم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔وہ کچن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی نکلیں اور نیمل کے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھ گئیں۔ان کی تیکھی نظریں نیمل کے پراعتماد چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"شادی میں صرف پندرہ دن باقی ہیں نیمل! اب تم یہ کورٹ کچہری کے چکر کا ٹنا بند کردو۔ پہلے ہی محلے والے باتیں کرتے ہیں کہ شبگیر وں کی بڑی بیٹی وکیل بن کر مجرموں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے۔اب گھر پر بیٹھو اور اپنی تیاری پر دھیان دو۔"

اسی وقت سلال اپنے مخصوص شربت کا گلاس اٹھائے دسترخوان پر واپس آیا۔سوکھے انار دانے اور پودینے کے پتے رات بھر پانی میں بھیگ کر اپنی رنگت اس کانچ کے گلاس میں چھوڑ چکے تھے۔سلال اپنی صحت کے معاملے میں حد درجہ حساس تھا اور یہ نہار منہ پیا جانے والا شربت اس کے معدے اور آنتوں کے لیے کسی اکسیر سے کم نہ تھا۔

"امی، صرف پانچ دن کی بات ہے۔اس کے بعد دس دن تو میں گھر میں ہی قید رہوں گی۔ یہ میرا پہلا ذاتی کیس ہے اور میرے کیریئر کے لیے بہت اہم ہے۔ میں اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتی۔"

" کمال کرتی ہو نیمل! سسرال جا کر کیا تم کیس لڑو گی؟" دادی نے مداخلت کی۔"بیٹیوں کو رخصتی سے پہلے گھر کی چار دیواری میں سجنا سنورنا چاہیے، نہ کہ کالے کوٹ پہن کر ججوں کے سامنے بحث کرنی چاہیے۔"

"دادی! آپ کی پوتی ججوں کو قائل کرنا جانتی ہے تو کیا وہ آپ کو قائل نہیں کر پائے گی؟ امی جانے دیں اسے، پانچ دن میں کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑے گا۔" سلال نے شربت کا گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا، وہ ہر مقام پر اپنی بہنوں کا ساتھ دیتا تھا۔

ابھی وہ کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ چغلی خان یکدم اڑ کر میز کے بیچوں بیچ آ بیٹھا۔

"وکیلنی بھاگی! وکیلنی بھاگی! سلال جھوٹا، سلال جھوٹا!" اس نے گردن ٹیڑھی کر کے سلال کو چڑایا۔

سلال نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی، "چغلی خان! اگر اب تم بولے تو میں تمہیں کچن کے کسی مسالے والے ڈبے میں بند کردوں گا، سمجھے؟"

اس نے جواباً اپنا پر پھڑ پھڑایا اور اس بار دادی کی گود میں جا چھپا۔سلال نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، " فکر نہ کریں امی، میں جاتے ہوئے انہیں کورٹ ڈراپ کردوں گا۔"

یہ سنتے ہی نیمل کی بڑی بہن والی روح اچانک جاگ اٹھی۔اس نے مشکوک نظروں سے سلال کو دیکھا۔

" مگر تمہارا رزلٹ تو شام میں اناؤنس ہوگا نا؟ تم اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟"

سلال کا ہاتھ شربت کے گلاس پر تھوڑا سا تھرکا۔وہ پل بھر کو گھبرایا مگر فوراً خود پر قابو پا لیا۔"وہ...مُجھے ذرا ضروری کام ہے۔"

"ایسا کون سا ضروری کام ہے جو رزلٹ سے بھی زیادہ اہم ہے؟" وہ جرح پہ اتر آئی۔

سلال نے بے بسی سے دادی کی طرف دیکھا۔وہ اب اپنی گود میں لیٹے مٹھو کے ملائم پروں پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔اس سے نفرت اپنی جگہ اور محبت اپنی جگہ...

"دادی! دیکھیں ذرا ان دونوں عورتوں کو۔ ایک مُجھے گھر سے نکالنا نہیں چاہتی اور دوسری مُجھے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہی۔ کیا میں اس گھر کا بیٹا ہوں یا کوئی قیدی؟"

"چھوڑ و اسے نیمل! جوان بیٹا ہے، اسے اپنے کام کرنے دو۔"

نیمل نے ایک تنبیہہ نظر سلال پر ڈالی، پراٹھے کا آخری لقمہ لیا اور میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ اب نامرہ کے کمرے کی طرف تھا۔

نامرہ کے کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی، سر پر دو تکیے رکھے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ نیمل نے تکیہ ہٹایا تو نامرہ نے منمنا کر ایک کروٹ لی اور کمبل مزید اوپر کھینچ لیا۔

"نامرہ! اٹھ جاؤ، سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے اور دادی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

"میرا کالج گیارہ بجے ہے۔ پلیز، مُجھے سونے دیں۔"

نیمل اس کی بات ان سنی کرتے کمرے کے پردے ہٹانے لگی۔ عین اسی وقت سائیڈ ٹیبل پر رکھا نامرہ کا فون اس کے سکون کا دشمن بن چکا تھا۔ الارم کی مخصوص بیپ کے ساتھ ساتھ واٹس ایپ کی مسلسل کالز فون کو میز پر تھرتھرا رہی تھیں مگر نامرہ مدہوشی کی اس حد پر تھی جہاں اسے بم دھماکے بھی لوری محسوس ہوتے۔

نیمل نے ایک جھٹکے سے اس کے منہ پر رکھا تکیہ ہٹایا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر ہلایا۔

"نامرہ اٹھ جاؤ! تمہارا فون کب سے سر پیٹ رہا ہے، اسے اٹھاؤ ورنہ میں اسے کھڑکی سے باہر پھینک دوں گی۔"

نامرہ کسمسائی، ایک جھرجھری لی مگر اٹھنے کے بجائے دوسری کروٹ لی اور تکیے کے بغیر ہی بستر میں منہ چھپا لیا۔ فون ایک بار پھر بجنے لگا۔

اب کی بار نیمل کو واقعی کوفت ہونے لگی تھی۔ اس نے فون اٹھا کر زبردستی نامرہ کے ہاتھ میں تھمایا۔

نامرہ نے بمشکل ایک آنکھ کھولی اور سکرین پر اپنی کلاس فیلو کا نام دیکھ کر کال ریسیو کی۔

"ہاں بولو..." اس کی آواز نیند کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھی۔

"نامرہ! آج دس بجے ہر حال میں کالج پہنچ جانا، آج ہماری فیلڈ ہے ورنہ اٹینڈنس نہیں لگے گی۔"

کال کٹتے ہی میسجز کے نوٹیفیکیشنز کا تانتا بندھ گیا۔ نامرہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی پلکوں پر منوں بوجھ لدا ہو۔ فجر کے بعد سونا اس کی عادت تھی مگر اس نیند کے بعد دوبارہ بیدار ہونا اسے زندگی کا سب سے بڑا عذاب لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ سوئی ہی نہیں بس ابھی آنکھ لگی اور دنیا اسے جگانے کے درپے ہو گئی۔

"کیا یار! یہ لوگ سکون سے سونے کیوں نہیں دیتے؟ ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔"

وہ روہانسی ہوئی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

نیمل نے ہاتھ باندھ کر اسے گھورا۔ "اور اب تم ایک گھنٹہ باتھ روم میں لگاؤ گی۔ دس خود ہی بج جائیں گے۔"

نیمل کی پھرتی اور نامرہ کی سستی کا ہمیشہ سے مقابلہ تھا۔نیمل اپنے کام منٹوں میں نبٹاتی تھی جبکہ نامرہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔وہ سست تھی مگر صرف گھر کی حد تک۔ نیمل کی گھوری کا اثر ہوا اور وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔اپنے بے ترتیب بکھرے بالوں کو ایک ہاتھ سے اکٹھا کر کے جوڑا بنایا اور بستر سے نیچے پاؤں دھرے۔اس نے ایک کھلا سا ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور اوپر سلال کی سیاہ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جو اس کے وجود پر خاصی بڑی لگ رہی تھی۔نامرہ اس گھر کی سب سے بڑی 'کپڑے چور' تھی۔سلال کی الماری سے نئی شرٹس غائب ہونا ایک معمول کی بات تھی۔وہ ننگے پاؤں، نیند میں لڑکھڑاتی ہوئی لاؤنج سے گزری اور سیدھی ڈائننگ ہال میں پہنچ گئی۔سلال کی نظر جیسے ہی اپنی برانڈ نیو شرٹ پر پڑی، اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔

"یا خدایا! یہ شرٹ تو میں نے ابھی تک پہنی بھی نہیں، ٹیگ بھی نہیں اتارا تھا۔"

وہ اپنی شرٹ کی یہ حالت دیکھ کر جیسے درد سے بلبلایا۔وہ کتنا ہی چھپا لیتا، نامرہ کی جاسوسی نظریں اس کی جیکٹس، ہوڈیز اور شرٹس ڈھونڈ ہی نکالتی تھیں۔

"ٹیگ میں نے رات اتار دیا تھا۔" نامرہ نے اس کے احتجاج کو مکمل نظرانداز کیا، کرسی کھینچی اور بیٹھتے ہی میز پر سر رکھ دیا۔اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اب بھی نیند امڈ رہی تھی۔

"آ گئی میری لیلیٰ؟" دادی نے پیار بھری نظروں سے اپنی لاڈلی پوتی کو دیکھا۔

نامرہ نے میز پر سر رکھے رکھے ہی برا سا منہ بنایا۔

"دادی یار...کتنی بار کہا ہے مجھے لیلیٰ مت کہا کریں۔مجھے اس نام سے چڑ ہوتی ہے۔"

"کیوں نہ کہوں؟ میری سوہنی پوتی ہے تو لیلیٰ ہی نا!" دادی کی اکلوتی سہیلی کا نام لیلیٰ تھا جو اب جانے نیپال میں زندہ بھی ہو گی یا نہیں؟ نامرہ انہیں لیلیٰ کی یاد دلاتی تھی اس لیے وہ اسے لیلیٰ بلاتی تھیں۔سلال نے کڑھتے سے اپنی شرٹ کا بازو دیکھا جو نامرہ نے موڑ کر اپنے حساب سے سیٹ کیا ہوا تھا۔

"امی! اسے کہیں میری شرٹس واپس کرے۔" بات اب زہرہ بیگم تک جا پہنچی تھی۔

زہرہ بیگم نے کچن سے جھانک کر دیکھا۔

"اپنے کپڑے پہنا کرو نامرہ! یہ تم کیا بنی گھومتی رہتی ہو۔" انہوں نے نامرہ کے بھالو جیسے حلیے پر اسے کہا۔"اور جلدی ناشتہ کرو۔تم ہمیشہ دیر کر دیتی ہو۔" انہیں نامرہ کے وقت پر کالج کی فکر ستاتی رہتی تھی۔نامرہ نے سر اٹھایا، بالوں کی لٹیں اس کی آنکھ پر جھول رہی تھی۔

"ناشتہ؟ امی، ابھی تو میرا دماغ بھی نہیں کھلا، معدہ کیسے کھلے گا؟ بس ایک کپ کڑک چائے دے دیں، شاید مجھے ہوش آ جائے کہ میں اس وقت کس سیارے پر ہوں۔"

وہ سلال اور اس کی دہائی کو کمال بے نیازی سے نظر انداز کر گئی۔

چغلی خان اب دادی کی گود سے اڑ کر نامرہ کی کرسی کی پشت پر آ بیٹھا۔

"چور! چور! شرٹ چور! نامرہ سست، نامرہ سست!"

نامرہ نے جھلا کر ہاتھ ہوا میں لہرایا۔"خاموش ہو جاؤ چغلی خان! ورنہ میں تمہارے پروں سے رنگین برش بنا کر بیچ آؤں گی۔"

سلال نے تاسف سے سر ہلایا۔ اس خاندان کی سب سے بڑی بیوپاری نامرہ شبگیر تھی۔ وہ ہر چیز کو 'بیچنے' کے لیے تیار رہتی تھی۔ کام کی چیز تو الگ، اسے کچھ ناکارہ چیز بھی ملتی تھی تو وہ اس کی حالت درست کر کے اسے بیچ آتی تھی۔ روپے پیسوں کے معاملے میں اس کے حساب بہت سیدھے تھے۔ گھر سے مل گئے تو ٹھیک ورنہ نامرہ جانتی تھی اسے کب، کیا اور کہاں بیچنا تھا اور اس کی بیچی ہوئی چیزوں کو واپس ڈھونڈ نا کسی کے بھی بس کا کام نہیں تھا۔

" کسی دن شبگیروں کو ہی نہ بیچ آنا..." سلال نے طنز کیا مگر پرواہ کسے تھی۔ نامرہ نے میز سے سر اٹھایا اور جیسے ہی چائے کے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا، سلال نے پھرتی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نظریں نامرہ کے بکھرے حلیے اور نیند سے بھری آنکھوں پر تھیں۔

" پہلے جا کر برش کرو، پھر چائے ملے گی۔" سلال کی نفاست بھری طبعیت جاگ اٹھی۔ اس کے منع کرنے پر نامرہ نے ایک لمبی انگڑائی لی اور جھنجھلا کر بولی۔

"رات کو کیا تھا نا، اب کیا بار بار برش کرتی رہوں؟ ویسے بھی صرف چائے ہی تو پینی ہے، پراٹھا تھوڑی کھانا ہے۔"

سلال نے ایک بار پھر تاسف سے سر ہلایا۔ اسکا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"نامرہ! تم ملک کے سب سے ایلیٹ کالج (بزدار انٹرنیشنل کالج) میں اسپورٹس سائنسز کی اسٹوڈنٹ ہو جہاں لوگ چیتے کی طرح پھرتیلے ہوتے ہیں، اور ایک تم ہو... جیسے کسی نے سستی کا مجسمہ بنا کر ہمارے گھر بھیج دیا ہو۔"

نامرہ اب بیدار ہونے کی کوشش میں تھی۔ اس نے اپنی شرٹ (جو دراصل سلال کی تھی) کے بازو اوپر چڑھائے اور فخر سے بولی۔

"میں اپنی تعریفیں خود نہیں کرتی ورنہ میری فٹنس کے قصے تو پورا کالج سناتا ہے۔"

"جی جی بالکل! تمہاری تعریفیں تو پورا محلّہ کرتا ہے، خاص طور پر جب تم دوپہر تک سوتی رہتی ہو۔" سلال نے تمسخرانہ انداز میں کہتے، چائے کپ میں انڈیلی۔

نامرہ نے کپ کی بھاپ سونگھی اور ایک بامعنی نظر سلال پر ڈالی۔

" آپ میری فکر چھوڑیں اور اپنے رزلٹ پر دھیان دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج ایک لڑکی سے ہار جائیں۔"

نامرہ کا اشارہ عالیہ کی طرف تھا، جس کا نام سنتے ہی سلال کے چہرے پر سنجیدگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور خاموشی سے اپنا شربت پینے لگا۔ عالیہ کا ذکر اس کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ہوتا تھا جبکہ نامرہ نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

اسی دوران نیمل اپنا بیگ سنبھالتی، مکمل طور پر تیار ہو کر ہال میں آئی۔

"ٹھیک ہے، میری رائڈ آ چکی ہے، میں جا رہی ہوں۔" اس نے دادی کے گلے لگ کر انہیں خدا حافظ کہا۔ زہرہ بیگم خفگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور ان کے گلے لگ گئی۔

"صرف پانچ دن امی! میری پیاری امی ہیں نا آپ.. پلیز مان جائیں۔ آپ ایسے دیکھیں گی تو میں کام کیسے کروں گی؟"

اس کے یوں لپٹنے پر زہرہ بیگم نے گہری سانس لی۔

"ہاں ٹھیک ہے لیکن اس ہفتے تمہاری شادی کا جوڑا آ جانا چاہیے۔ سمجھ رہی ہو نا؟"

"جی جی بالکل.. کل ہم ساری بہنیں شاپنگ پہ جائیں گی اور میں ایک بھاری بھرکم روایتی شادی کا جوڑا لاؤں گی اور بتائیں؟" وہ ان کے گلے میں بازو ڈالے کھڑی تھی اور بس... زہرہ بیگم فوراً پگھل گئیں۔ اپنے بچوں کے لیے مائیں فوراً پگھل جاتی ہیں۔ وہ مسکرا دیں۔ نیمل انہیں خدا حافظ کہتے باہر نکل گئی۔ جبکہ نامرہ مندھی مندھی آنکھوں سے چائے پی رہی تھی۔ اور پھر آدھے گھنٹے بعد، شبگیر ہاؤس کے گیٹ پر ایک دلچسپ منظر تھا۔ نامرہ اپنی چمکتی ہوئی نیلی سکوٹی اسٹارٹ کر رہی تھی جبکہ سلال اپنا بھاری بیگ کندھے پر لٹکائے اس کے پیچھے بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ دادی گیٹ پر کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں اور ان کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔

"سلال! ایک لڑکی کے پیچھے بیٹھ رہے ہو؟ کچھ تو غیرت کرو، مرد ہو کر خود چلایا کرو موٹر سائیکل۔" دادی کی پرانی سوچ ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی۔ سلال کی بائیک اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی اس لیے اسے نامرہ کے ساتھ جانا پڑ رہا تھا۔

سلال نے ہنستے ہوئے ہیلمٹ پہنا۔ "دادی! پہلی بات تو یہ کہ یہ موٹر سائیکل نہیں، سکوٹی ہے اور دوسری بات یہ کہ میں اپنی سگی بہن کے پیچھے بیٹھا ہوں، کسی غیر لڑکی کے نہیں۔ اب اس میں غیرت کیسی؟"

سلال کو ان باتوں سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ بنا ہچکچاہٹ کے نامرہ کے پیچھے بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔ اسے دنیا کی پرواہ کبھی نہیں رہی تھی۔ اسے اپنوں سے سروکار تھا۔

"تھام کے بیٹھنا سلال شبگیر صاحب! کیونکہ آج مُجھے دیر ہو رہی ہے۔" نامرہ نے شرارت سے کہا اور ایک جھٹکے سے سکوٹی آگے بڑھا دی۔ سلال نے بمشکل اس کے کندھے پکڑ کر توازن برقرار رکھا۔ دادی نے دور جاتی سکوٹی کو دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی گیٹ بند کر کے اندر مڑ گئیں۔

"آج کل کے بچے بھی نا..."

جیسے ہی سکوٹی گلی کے موڑ سے غائب ہوئی، شبگیر ہاؤس میں پھیلا ہوا وہ مخصوص صبح کا شور یکدم دم توڑ گیا۔ جو رونق کچھ دیر پہلے تک لگی ہوئی تھی وہ اب خاموشی میں بدل چکی تھی۔ گھر میں اب صرف زہرہ بیگم کچن کے برتن سمیٹ رہی تھیں، دادی اپنی تسبیح لے کر بیٹھ گئی تھیں اور چغلی خان اکیلا لاؤنج کے پنکھے پر بیٹھا چونچ سے اپنے پر صاف کر رہا تھا۔ روزانہ کا یہی معمول تھا۔ بچوں کے جاتے ہی یہ گھر سونا ہو جاتا تھا، جیسے اس کی روح ان جوان قدموں کے ساتھ ہی باہر نکل گئی ہو۔ اب سب کو انتظار تھا تو بس شام کا، جب رزلٹ کے ساتھ خوشیاں یا اداسیاں گھر لوٹنی تھیں۔

☆☆☆☆☆

قادری میڈیکل کالج کا ہاکی گراؤنڈ صبح صبح سورج کی نرم تپش اور لڑکوں کے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ یہ وہ گراؤنڈ تھا جہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز کبھی داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ ہوئی تھی مگر اب نہیں رہی تھی۔ ٹیم کے کھلاڑی، جو زیادہ تر بااثر گھرانوں کے چشم و چراغ تھے، گراؤنڈ کے بیچوں بیچ ٹولیوں میں کھڑے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے مہنگے فونز پر مصروف تھے۔ ان میں چند ایک (جنہیں لگتا تھا انکا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا) سگریٹ کا دھواں اڑانے میں مصروف تھے۔ یوں تو سگریٹ نوشی سختی سے ممنوع تھی مگر... پچھلی رات واٹس ایپ گروپ میں 'نئے ہاکی کوچ' کی تقرری کا میسج تو سب نے پڑھا تھا مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ان کا سامنا کس سے ہونے والا ہے۔

سنا ہے آج نیا کوچ آ رہا ہے۔" بالآخر نئے کوچ کا ذکر ہو ہی چکا تھا۔

"یار یہ نیا کوچ بھی ویسا ہی ہوگا جیسے پچھلے تھے۔ دو دن حکم چلائے گا پھر ہماری گاڑیوں کے ماڈل دیکھ کر خود پانی پلانے لگے گا۔" ٹیم کے کیپٹن، زاویار نے ہاکی اسٹک سے گھاس کریدتے ہوئے طنزیہ کہا۔ قہقہوں کا ایک طوفان اٹھا مگر وہ قہقہہ ادھورا رہ گیا کیونکہ ٹھیک اسی لمحے گراؤنڈ کے آہنی گیٹ کے کھلنے کی بھاری آواز آئی۔ دور سے ایک مضبوط وجود ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کالی ٹریک پینٹ اور شرٹ پہنے، جس کی آستینیں اس کے مضبوط بازوؤں پر تنی ہوئی تھیں اور ہاتھ میں ایک پرانی مگر چمکدار ہاکی اسٹک۔ سقراط شبگیر کے آدھے کھلے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی آنکھیں کسی شکاری عقاب کی طرح ٹیم کے ایک ایک لڑکے کا معائنہ کر رہی تھیں۔ وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، لڑکوں کے قد چھوٹے محسوس ہونے لگے۔ سقراط دراز قد تھا اور اس کے مضبوط بازو یہ بتا رہے تھے کہ وہ شخص صرف باتیں کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیم کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ سلام کیا، نہ ہی اپنا تعارف کروایا۔ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر ایک سرد نظر سب پر ڈالی۔

"تم لوگ دس منٹ لیٹ ہو۔" اس کی آواز میں گرج نہیں تھی مگر وہ اتنی بھاری تھی کہ گراؤنڈ کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتی محسوس ہوئی۔

"اوہیلو! آپ کوچ ہیں؟" زاویار نے ڈھٹائی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "یہ اسپورٹس کالج ہے، کوئی آرمی یونٹ نہیں کہ آپ منٹ گن رہے ہیں۔"

سقراط نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی۔ اس نے زاویار کے ہاتھ میں لگی سگریٹ دیکھی۔ اگلے ہی لمحے سقراط کی ہاکی ہوا میں لہرائی اور ایک زوردار ٹک کی آواز آئی۔ زاویار کے ہاتھ سے سگریٹ اڑ کر دور جاگری اور اس کی انگلیاں سن ہوگئیں۔

پورے گراؤنڈ میں سکتہ طاری ہوگیا۔ لڑکے حیران رہ گئے۔

"پہلا سبق..." وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

"ہاکی گراؤنڈ تمہارا ڈرائنگ روم نہیں ہے اور یہاں سگریٹ کا دھواں نہیں، تمہارے پسینے کی بو ہونی چاہیے۔" سقراط کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی..." ایک چوڑا چکلہ لڑکا جو دراصل ٹیم کا ڈیفینڈر تھا، غصے سے آگے بڑھا مگر سقراط نے صرف اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا اور اسے پیچھے دھکیلا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گرا جیسے کسی دیوہیکل وجود سے ٹکرا گیا ہو۔

"میرا نام سقراط شبگیر ہے۔ اور آج سے تمہاری زندگی، تمہاری سانسیں اور تمہارا وقت میرا ہے۔ جو نہیں مانتا، وہ اسی وقت اس گیٹ سے باہر جا سکتا ہے۔ لیکن اگر رک گئے.. تو میں تم سے وہ کام لوں گا جو تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔"

اس نے ہاکی گراؤنڈ کے چکر کی طرف اشارہ کیا۔ "پوری ٹیم۔ دس چکر۔ ابھی۔"

"دس چکر؟ آپ پاگل ہیں؟ یہ چار کلومیٹر بنتے ہیں!" ایک لڑکا چلایا۔

سقراط نے کندھے اچکائے۔ "اب پندرہ ہوگئے۔ جتنا بولو گے، پانچ بڑھتے جائیں گے۔"

لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ زاویار کی آنکھوں میں آگ تھی مگر سقراط کے وجود سے اٹھنے والا رعب اسے قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ کوئی عام پانی پلانے والا کوچ نہیں تھا۔ یہ وہ تھا جو انہیں توڑ کر دوبارہ جوڑنے آیا تھا۔

دھیرے دھیرے، ٹیم نے دوڑنا شروع کیا۔ پہلے پانچ چکروں کے بعد ان کے پھیپھڑے پھٹنے لگے، دس چکروں کے بعد کچھ لڑکے گھٹنوں پر آ گرے۔ مگر سقراط وہیں ساکت کھڑا رہا جیسے پتھر کا کوئی بت ہو۔

"ہاکی وہ کھیل نہیں ہے جو صرف ہاتھوں سے کھیلا جائے، یہ وہ جنگ ہے جو دل گردے سے لڑی جاتی ہے۔" اس کی آواز گراؤنڈ میں کوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ پندرہ چکر مکمل ہوتے ہوتے ٹیم کے شہزادوں کا حال یہ تھا کہ کسی کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور کوئی زمین پر لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آخری دعائیں مانگ رہا تھا۔ زاویار جو ٹیم کا سب سے بڑا اتڑی باز تھا، اس وقت گھٹنوں پر ہاتھ رکھے زمین پر تھوک رہا تھا۔ اس کی مہنگی برانڈڈ ٹی شرٹ پسینے سے تر ہو کر جسم سے چپک گئی تھی۔ سقراط نے ایک ہاکی بال زمین پر رکھی اور ایک ہی ہٹ سے اسے سیدھا گول پوسٹ کے کونے میں پیوست کر دیا۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ سب نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"ہاکی صرف ایک لکڑی کا ٹکڑا نہیں ہے۔ یہ تمہارے بازو کی توسیع (Extension) ہے۔ اگر تم وقت کی پابندی نہیں کر سکتے تو تم بال کی

ٹائمنگ کبھی نہیں پکڑ سکو گے۔ اگر تم اپنے غصے کو نظم و ضبط میں نہیں بدل سکتے تو تم کبھی گول نہیں کر سکو گے۔"

وہ بھاری آواز میں بول رہا تھا جبکہ باقی سب میدان سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے جب اچانک کان پھاڑ دینے والی 'سیٹی' گونجی۔ لڑکوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعت کو اس تیز آواز سے بچانے کی کوشش کی۔ سقراط نے گلے میں لٹکی سیٹی دانتوں میں دبائی اور ایک لمبا سانس بھر کر اسے دوبارہ بجایا۔

"لائن اپ! تھری، ٹو، ون... ہری اپ!" اس کی آواز کسی فوجی کمانڈر کی طرح گونجی۔

"سر... پلیز... اب اور نہیں..." ایک لڑکا ہانپتے ہوئے بولا۔ "ہمارے پھیپھڑوں کی کیپیسٹی ختم ہو گئی ہے۔"

سقراط نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی پھر چلتے ہوئے اس کے قریب آیا، جھکا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھ دیں۔

"اگر سانس لینے میں مسئلہ ہے تو جاؤ وارڈ میں جا کر آکسیجن لگوا لو لیکن یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

اس نے سیٹی کا ایک اور زوردار وار کیا اور لڑکے جیسے کسی برقی جھٹکے کے زیرِ اثر فوراً سیدھے کھڑے ہو گئے۔ سقراط نے ہاکی کی گیندوں سے بھرا ہوا نیٹ گراؤنڈ کے بیچ میں الٹ دیا۔ سفید گیندیں ہر طرف بکھر گئیں۔

"اب کھیل شروع ہوگا۔" اس کے لبوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ آئی۔ اس نے ٹیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ گراؤنڈ کے پار باقی اسٹوڈنٹس رک رک کر آج ہاکی ٹیم کو دیکھ رہے تھے۔ آج تو میدان میں الگ ہی جلوہ تھا۔

"زاویار! تم اور تمہاری ٹولی ایک طرف۔ باقی سب دوسری طرف۔ کوئی پوزیشن نہیں، کوئی رول نہیں۔ مقصد صرف ایک ہے... گیند میرے پاس نہیں پہنچنی چاہیے۔ جس نے گیند مجھ سے چھین لی، اسے کل کی چھٹی۔ اور اگر میں نے گول کر دیا تو اگلے دس چکر ننگے پاؤں!"

لڑکوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ 'ننگے پاؤں دس چکر' کا سن کر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ غصہ اور خوف مل کر ان کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ پندرہ لڑکے ایک طرف تھے اور اکیلا سقراط شبگیر دوسری طرف۔ وہ سب اسے شکاری بھیڑیوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے گہری سانس لی۔ ہاکی کو اپنے گھٹنے سے ٹکاتے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے آدھے جوڑے کو کسا۔ گیند کو اپنی ہاکی کے ہک میں پھنسایا اور دوڑا پھر جو تماشہ شروع ہوا، وہ قادری کالج کے در و دیوار نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیٹی بجاتا، ان کے اشاروں پر ناچنے کے بجائے انہیں اپنے اشاروں پر نچا رہا تھا۔ زاویار نے پوری قوت سے سقراط پر جھپٹنا چاہا مگر سقراط نے ہاکی کو ایک خاص زاویے سے گھمایا اور گیند زاویار کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل گئی۔ زاویار اپنا توازن کھو کر گھاس پر اوندھے منہ گرا۔

"ٹویٹ...!" سقراط نے سیٹی بجائی۔ "پاؤں بھاری ہیں تمہارے زاویار! تمہاری توجہ گیند پر نہیں، مجھ پر ہے۔ ہاکی سے پیار کرو، مجھ سے نہیں!"

وہ اکیلا ان پندرہ لڑکوں کے درمیان کسی بجلی کی لہر کی طرح گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ گیند کو ہوا میں اچھالتا، کبھی زمین پر اس کی رفتار اتنی تیز کر دیتا کہ لڑکوں کو صرف سفید لکیر نظر آتی۔ وہ سب مل کر بھی اس ایک شخص سے گیند نہیں چھین پا رہے تھے۔

" گھیر و انہیں! لیفٹ سے آؤ!" ایک لڑکا چلایا۔

تین لڑکوں نے سقراط کو گھیر لیا۔ سقراط نے سیٹی بجاتے ہوئے ایک زوردار نعرہ لگایا، ہاکی کو ریورس فلک کیا اور گیند ان تینوں کے سروں کے اوپر سے گزرتی ہوئی سیدھی گول پوسٹ میں جا گری۔

" گول...!" سقراط کی پرسکون آواز گونجی۔ "دس چکر ننگے پاؤں۔ ابھی اور اسی وقت!"

" کوچ! یہ ناانصافی ہے، آپ پروفیشنل ہیں اور ہم..." ایک لڑکا روہانسہ ہو گیا۔ وہ رو دینے کو تھا۔
سقراط نے ہاکی کو اپنے کندھے پر رکھا اور قدم بڑھا کر اس کے قریب آیا۔

"میدان میں دشمن یہ نہیں دیکھتا کہ تم پروفیشنل ہو یا امیچر۔ وہ صرف تمہارا خون دیکھتا ہے۔ جوتے اتارو اور دوڑنا شروع کرو، ورنہ شام تک یہیں..."

لڑکے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی ان 'بگڑے ہوئے نوابوں' کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے۔ ایک ایک کر کے سب نے اپنے مہنگے جوتے اتارے۔ ٹھنڈی گھاس اور کہیں کہیں موجود کنکر ان کے تلووں کو لگ رہے تھے مگر سامنے کھڑے اس دیوہیکل کوچ کی آنکھوں کا جلال ایسا تھا کہ کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ انکار کرے۔ سقراط وہیں گراؤنڈ کے بیچ میں کھڑا رہا۔ ہاتھ میں سیٹی تھامے، سورج کی روشنی میں اس کا پسینے سے چمکتا چہرہ اور گردن تک لٹکتے بال اسے کسی قدیم یونانی جنگجو کا روپ دے رہے تھے۔ وہ انہیں تڑپا رہا تھا، وہ انہیں تھکا رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر... وہ ان کے اندر کے اس زنگ آلود غرور کو کھرچ رہا تھا جو انہیں محنت سے دور رکھتا تھا۔

"تیز... اور تیز! یہ پیر ہیں یا مکھن کے پیڑے؟" وہ ہر چکر پر سیٹی بجاتا اور طنز کے تیر برساتا۔ زاویار بزدار ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ اسے فی الوقت لگ رہا تھا کہ یہ کوچ اسے ذاتی طور پر نشانہ بنا رہا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سقراط شبگیر کی یہ تو صرف 'بسم اللہ' تھی۔ اس کی آمین تو اگلے کو چولہے میں بھیج کر ہوتی تھی۔ جب دس چکر پورے ہوئے، تو وہ پندرہ لڑکے گراؤنڈ میں ڈھیر ہو چکے تھے۔ اب ان میں قہقہے لگانے کی سکت تھی نہ سگریٹ پینے کی طلب۔ ان کے لیے اب دنیا کا سب سے بڑا دشمن وہ ٹریک سوٹ والا شخص تھا جو اب سکون سے اپنی ہاکی بیگ میں ڈال رہا تھا۔

"پریکٹس ختم۔کل ٹھیک سات بجے۔" سقراط نے آخری بار سیٹی بجائی، جوان کے کانوں میں کسی وارننگ کی طرح گونجی۔"اور ہاں..کل جوتے تھوڑے ہلکے پہن کر آنا کیونکہ کل ہم نے دوڑ نا نہیں، اڑ نا ہے۔"

وہ پلٹا اور مضبوط چال کے ساتھ گراؤنڈ سے باہر نکل گیا، پیچھے پندرہ شکستہ وجودوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آج ان کا پالا کسی کوچ سے نہیں بلکہ کسی عذاب سے پڑا تھا۔

☆☆☆☆☆

سورج کی روشنی آج قدرے تیز تھی۔فضا میں ایک عجیب سی گھٹن کا احساس تھا۔عالیہ اپنی چمچماتی ہوئی مہنگی سیڈان کے پچھلے حصے میں بیٹھی، مسلسل اپنے ناخن کتر رہی تھی۔رزلٹ شام میں تھا مگر یہ وقت کاٹنا اس کے لیے محال ہو چکا تھا۔گھر کی وسیع وعریض دیواریں اسے قید خانہ لگ رہی تھیں۔زنیرہ کا فون اس کے لیے ایک فرار کا راستہ ثابت ہوا تھا..شاپنگ،ہلہ گلہ اور تھوڑی سی ذہنی تفریح۔شاید ان سب سے اس کی حالت تھوڑی بہتر ہو جاتی۔اسی لیے وہ گھر سے نکل آئی تھی۔ اس نے گاڑی کا ہیٹر بند کروا کر اے سی آن کروایا ساتھ جس کی ٹھنڈک بھی اسے وہ سکون نہیں دے پا رہی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔اس کا سیاہ سلک کا سوٹ اور ڈیزائنر چشمہ اس کے شاہانہ پن کو واضح کر رہا تھا مگر ماتھے کی شکنیں اندرونی اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں۔تیکھے نقوش والی عالیہ بزدار بلاشبہ ایک خوبصورت لڑکی تھی مگر اسکی غیر بردبار طبعیت نے اسے نک چڑی بنا دیا تھا۔اس وقت بھی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔جیسے ہی گاڑی مین شاہراہ پر مڑی، ٹریفک کی روانی اچانک تھم گئی۔دور سے ایک شور اٹھا، جو پہلے مدھم تھا مگر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا ایک طوفان بن گیا۔

یہ 'آزادیِ فلسطین' کے حق میں نکلا ہوا ایک بہت بڑا جلوس تھا۔سینکڑوں، ہزاروں لوگ بینرز اٹھائے،نعرے لگاتے سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے۔عالیہ نے کوفت سے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔

"افوہ! یہ لوگ بھی نا...جب دیکھو سڑکیں بلاک کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ان کے چلانے سے کیا فلسطین آزاد ہو جائے گا؟ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" وہ تپے گال لیے بڑبڑانے لگی۔

"بی بی جی! راستہ بالکل بند ہے، میں گاڑی ٹرن کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ڈرائیور نے بے بسی سے کہا اور اسٹیئرنگ کو تیزی سے گھمایا۔

گاڑی ابھی آدھی مڑی ہی تھی کہ ہجوم میں سے ایک لڑکا پوری رفتار سے بھاگتا ہوا آیا اور زوردار طریقے سے گاڑی کے بونٹ سے ٹکرایا۔اس کے گاڑی سے ٹکرانے کی آواز اس قدر تیز تھی کہ عالیہ کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ڈرائیور نے بھی گاڑی روک دی۔

"اوہ مائی گاڈ! ڈرائیور انکل یہ کیا ہو رہا ہے؟" لمحہ بھر کے خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔وہ تیزی سے آگے ہوئی تاکہ دیکھ سکے ٹکرانے والا بچ گیا تھا یا نہیں۔

گاڑی کے بونٹ سے ٹکرانے والا لڑکا ایک لمحے کو لڑکھڑایا، پھر سنبھل کر سیدھا ہوا۔اس نے اپنے چہرے پر سیاہ وسفید فلسطینی رومال (کوفیہ)

لپیٹ رکھا تھا جس سے صرف اس کی آنکھیں نمایاں تھیں۔اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا اور وہ ہانپ رہا تھا۔
جیسے ہی اس نے سر اٹھایا، اس کی نظریں سیدھی پچھلی نشست پر بیٹھی عالیہ سے ٹکرائیں۔عالیہ کا سانس جیسے سینے میں ہی منجمد ہو گیا۔وہ ساکت رہ گئی گویا کسی نے اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔
وہ آنکھیں...وہ گہری، بھوری اور ذہانت سے لبریز آنکھیں جن میں اس وقت جنون کا ایک سمندر موجزن تھا۔وہ ان آنکھوں کو اماوس کی رات میں بھی پہچان سکتی تھی۔وہ سلال شبگیر تھا۔اس کا سب سے بڑا حریف، وہ لڑکا جو تعلیمی میدان میں اسے نیچا دکھانے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ایک لمحے کے لیے وقت تھم گیا۔سلال کی آنکھوں میں ایک لمحاتی حیرت ابھری پھر فوراً ہی وہ حیرت ایک عزم میں بدل گئی۔اس نے گاڑی پر ہاتھ مار کر اپنے توازن کو درست کیا اور ایک پل میں دوبارہ ہجوم کی لہروں میں غائب ہو گیا، جہاں نعرے بازی اپنے عروج پر تھی۔
عالیہ وہیں بت بنی بیٹھی رہی۔اس کا دل سینے میں ہتھوڑے مار رہا تھا۔
"بی بی جی! میں ریورس کر رہا ہوں، یہاں دنگا فساد بڑھ سکتا ہے۔" ڈرائیور نے گھبرا کر کہا اور گاڑی کو تیزی سے پیچھے ہٹایا۔جیسے ہی گاڑی جلوس سے دور ہوئی، عالیہ کے اندر ایک شدید نفرت کی لہر اٹھی۔وہ جیسے ہوش میں آئی۔اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔
"مستقبل کا ڈاکٹر بننے والا یہ لڑکا...سڑکوں پر آوارہ گردوں کی طرح دنگا فساد کا حصہ بن رہا ہے؟" اس نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔" کتنا دوغلا انسان ہے۔ایک طرف شرافت کا لبادہ اور دوسری طرف یہ غنڈہ گردی..."
اس نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا۔خوبصورت لمبے ناخن اس کی ہتھیلیوں میں چبھ گئے۔
سلال شبگیر کی اس جھلک نے اس کے دل میں موجود رقابت کی آگ میں جیسے پٹرول ڈال دیا تھا۔اسے سلال سے نفرت تھی یا نہیں یہ الگ بحث تھی فی الوقت اسے بس اس بات کا غصہ تھا کہ وہ لڑکا جو ہر چیز میں پرفیکٹ بنتا تھا، وہ آج اسے ایک 'عام انقلابی' کی شکل میں نظر آیا تھا۔
گاڑی اب صاف شاہراہ پر دوڑ رہی تھی مگر عالیہ کا دماغ وہیں اس سڑک پر اٹکا ہوا تھا۔اسے آج کے رزلٹ میں سلال کو ہرانے کی خواہش اب ایک جنون کی شکل اختیار کر چکی تھی۔وہ اسے صرف ایک سٹوڈنٹ کے طور پر نہیں بلکہ اس سڑک چھاپ ذہنیت کے طور پر شکست دینا چاہتی تھی جو اس نے ابھی ابھی دیکھی تھی۔غصے کی یہ لہر اب ایک طوفان بن کر اس کے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

شہر کے ایک مہنگے نجی اسکول کا لان اس وقت نئی نسل کے نمائندہ طالب علموں سے بھرا ہوا تھا۔یہاں کلاس رومز سے باہر نکلتے ہی دھوپ کی تپش سے زیادہ برانڈز، آئی فونز اور سوشل میڈیا فالوورز کی گرمی محسوس ہوتی تھی۔میٹرک کی طالبات جو اپنی نوعمری کی آخری سیڑھی پر تھیں، یہاں دو گروہوں میں بٹی ہوئی نظر آتی تھیں۔ایک وہ جو ٹرینڈ سیٹ کرتی تھیں اور دوسری وہ جو ان ٹرینڈز کا شکار ہوتی تھیں۔
نوفہ شبگیر، کینٹین کے ایک دور افتادہ کونے میں لکڑی کی بینچ پر بیٹھی اپنی بائیولوجی کی کتاب میں سر دھنسائے ہوئے تھی۔اس کی گول مٹول جسامت اور معصوم آنکھیں اسے اس گلیمرس ہجوم میں الگ تھلگ کر دیتی تھیں۔جیسے ہی اس نے اپنا لنچ باکس (ٹیفن) کھولا تو گھر کے کھانے

کی اشتہا انگیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ تارہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بنا وہ لنچ نہیں کرتی تھی۔ ابھی اس نے پہلا نوالہ توڑا بھی نہیں تھا کہ چار لڑکیوں کا ایک ٹولہ (جن کے یونیفارم ڈیزائنر فٹنگ میں تھے اور چہروں پر مہنگے سن بلاک کی تہہ تھی) اس کی میز کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اسکول کا مشہور mean girls گینگ تھا، جس کی سربراہ زوئی تھی۔ (اصل نام تو زوہا کامران تھا مگر سوشل میڈیا پہ وہ Zoi Kim بن چکی تھی۔ یہ آج کل کے بچے بھی نا...)

"اوہ مائی گاڈ! گائز، کین یو اسمیل دیٹ؟" زوئی نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک ڈرامائی انداز اپنایا۔ "آئی تھنک ہم کسی کچی آبادی کے ڈھابے پر آ گئے ہیں۔"

نوفہ کے ہاتھ وہیں جم گئے۔ اس کا چہرہ پل بھر میں سرخ ہوا اور اس نے تیزی سے اپنا ٹیفن بند کرنے کی کوشش کی۔
"رک جاؤ اچار ریہ! اتنی بھی کیا جلدی ہے؟" دوسری لڑکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ٹیفن پر ہاتھ رکھا۔
"کیا تم لوگ نہاتے بھی اچار کے پانی سے ہو؟ تمہارے بالوں سے بھی وہی کھٹی سی بو آتی ہے۔" تیسری لڑکی نے اس کے خوبصورت سیاہ سلکی بالوں کا مذاق اڑایا۔ کبھی کبھی لوگ ہماری جن چیزوں کا مقابلہ نہیں کر پاتے اسکا مذاق اڑا کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ان لڑکیوں کے ساتھ بھی تھا۔ نوفہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک حساس اور کتابی لڑکی تھی۔ جس کا دفاع ہمیشہ اس کے الفاظ نہیں بلکہ اس کی خاموشی ہوتی تھی۔ وہ بحث و مباحثے اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والی تھی۔

"تمہارے گھر میں تو ہر طرف اچار کے ڈرم ہوتے ہوں گے نا؟" زوئی نے ڈیسک پر جھک کر اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ "ویسے ایک بات بتاؤ، کیا یہ اچار کھا کھا کر ہی تم اتنی گول مول (Chubby) ہو گئی ہو؟ آئی مین، لک ایٹ یور سیلف، تم تو خود ایک چلتا پھرتا مٹکا لگتی ہو۔"

گینگ کی باقی لڑکیاں تالیاں بجا کر مصنوعی قہقہے لگانے کی بھرپور کوشش کرنے لگیں۔ نوفہ کا سر مزید جھک گیا، اسے لگا جیسے اسکول کی زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ اتنی موٹی نہیں تھی کہ اسکا مذاق بنایا جاتا مگر اب بنایا جا رہا تھا اور اسے یہ قبول نہیں تھا۔

"اچار مٹکے میں ہوتا ہو گا زوئی، اور عقل... وہ شاید تمہارے ڈی این اے میں ہی نہیں ہے!"
ایک پراعتماد آواز دائیں جانب سے ابھری۔ تارہ ہاتھ میں کینٹین کا چکن ریپ تھامے نمودار ہوئی۔ اس کے چھوٹے بال اور عقاب جیسی تیز آنکھیں اس وقت غصے سے چمک رہی تھیں۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں اس کا کیمرہ تھا، جس کا لینز سیدھا ان لڑکیوں کی طرف تھا۔

"اوہ، تو جونیئر اچار یہ بھی آ گئی؟" زوئی نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ "اپنا یہ سستا کیمرہ نیچے کرو، تمہیں پتا ہے اسکول میں ریکارڈنگ الاؤڈ نہیں ہے؟"

تارہ نے ایک قدم آگے بڑھایا، اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔

"ریکارڈنگ تو ہو چکی ہے اور نہ صرف اس بلنگ (Bullying) کی جو تم ابھی کر رہی تھی بلکہ ایک اور سپیشل فیچر بھی میرے پاس ہے۔"

تارہ نے فون کی سکرین گھمائی۔ سکرین پر ایک ویڈیو چل رہی تھی جس میں زوئی، پچھلے ہفتے کے کیمسٹری ٹیسٹ کے دوران اپنی آستین میں چھپائی گئی پرچیوں سے نقل کر رہی تھی۔ زوئی کی رنگت پل بھر میں کاغذ کی طرح سفید پڑ گئی۔

"یہ... یہ تم نے کب کیا؟" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ "کلاس میں کیمرہ الاؤڈ نہیں ہے! میں پرنسپل سے تمہاری شکایت کروں گی۔" اسکے چہرے کا رنگ اس کے بالوں کے چند سرخ لٹوں جیسا ہو گیا۔ مصنوعی بہادری دکھانے کی کوشش کی۔

تارہ نے کیمرہ واپس اپنی جیب میں ڈالا اور آگے بڑھی۔ اسکا لہجہ سخت تھا۔

"کرو شکایت! لیکن یاد رکھنا، چیٹنگ کرنا بھی الاؤڈ نہیں ہے اور کسی کو اس کے خاندانی کاروبار یا جسمانی ساخت پر باڈی شیم کرنا تو بالکل بھی الاؤڈ نہیں ہے۔ اگر یہ ویڈیو گروپ چیٹ پر گئی تو تمہارا وہ پرفیکٹ انفلوئنسر والا امیج مٹی میں مل جائے گا اور اسکول سے ریسٹیکیٹ الگ ہو گی۔ اب بولو، کس کا نقصان زیادہ ہے؟"

زوئی اور اس کی سہیلیاں ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگیں۔ تارہ کا وار اتنا بھرپور اور منطقی تھا کہ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہاں تارہ کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ اپنی امیج خراب نہیں کر سکتی تھی۔ زوئی نے پیر پٹخا اور غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اپنے گینگ کے ساتھ وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ نوفہ نے ایک گہری سانس لی اور تارہ کو دیکھا جو اب سکون سے اس کے سامنے بینچ پر بیٹھ رہی تھی۔

"تارہ! آپی نے منع کیا تھا نا کہ دوسروں کی خفیہ ریکارڈنگ نہیں کرنی چاہیے؟ یہ ڈیجیٹل بلیک میلنگ ہے۔" نوفہ نے خفگی اور ڈر کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

"آپی نے بلاوجہ کے سمجھوتے کرنے سے بھی منع کیا ہے پھر تم انہیں جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟" تارہ نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔ نہ تو نوفہ ڈرپوک تھی اور نہ ہی اسے لفظوں کی کمی تھی پھر اسے نوفہ کے یوں چپ کر کے لوگوں کی باتیں سننے کی عادت سے کوفت ہوتی تھی۔

"آپی نے بلاوجہ لڑائی جھگڑے سے بھی تو منع کیا ہے نا..." اور نوفہ کے لیے آپی (نیمل) کی بات سر آنکھوں پر۔

تارہ نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے ریپ کا ایک بڑا نوالہ لیا اور اسے چباتے ہوئے بولی۔

"دیکھو نوفہ، کچھ لوگ پیار کی زبان نہیں سمجھتے۔اس ریکارڈنگ کی وجہ سے اب وہ کبھی تمہارے قریب آنے کی ہمت نہیں کریں گی۔ یہ ڈیجیٹل بلیک میلنگ نہیں ہے بلکہ یہ سیلف ڈیفنس ہے جو ہر شخص کا حق ہے۔"

نوفہ نے خاموشی سے دوبارہ اپنا ٹیفن کھولا مگر اب اس کے ہاتھ کپکپا نہیں رہے تھے۔

" کبھی اپنے کام یا اپنے باپ کی محنت پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جو ہمیں 'اچاری خاندان' کہتی ہیں نا؟ انہیں پتا نہیں ہے کہ شبگیر ز کا اچار اس شہر کے ہر بڑے مال میں بکتا ہے۔ہم پروڈیوسرز ہیں نوفہ اور یہ لوگ صرف کنزیومرز ہیں۔ہم اپنی فیکٹری سے سینکڑوں لوگوں کا چولہا جلاتے ہیں۔اچار کی سمیل بری نہیں ہوتی، یہ محنت کی خوشبو ہے۔اگلی بار کوئی ایسا کہے تو اسے بتانا کہ ہمارے پاپا کے اچار کے بزنس سے جو ٹیکس جاتا ہے،اس سے شاید ان کے باپوں کی سڑکیں بنتی ہیں۔"

ریپ کا نوالہ چباتے تارہ شبگیر کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔وہ چھوٹے بالوں والی لڑکی سب برداشت کر سکتی تھی مگر اپنے باپ کی ذات اور کام پر ایک حرف بھی نہیں۔ دیکھنے میں وہ نامرہ جیسی تھی اور اپنوں کے لیے پوزیسیو ہونے میں اس سے کہیں ہاتھ آگے۔نوفہ کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی۔اسے اپنی بہن کی عقلمندی اور دلیری پر ہمیشہ رشک آتا تھا۔تارہ نے جس طرح اپنے فیملی بزنس کو ڈیفینڈ کیا تھا، اس نے نوفہ کے اندر کے خوف کو ایک فخر میں بدل دیا۔اسے اپنی بہنوں پر فخر ہوتا تھا اور اس وقت بھی اس کے گال پھول کر مزید لال ہو گئے۔

"اب جلدی سے لنچ ختم کرو، اگلا پیریڈ میتھس کا ہے اور تمہیں ابھی میرا ہوم ورک بھی انسپیکٹ کرنا ہے۔" تارہ نے شرارت سے کہا اور دونوں بہنیں اس شور شرابے والے اسکول کے کونے میں ایک دوسرے کے تحفظ کے احساس کے ساتھ لنچ کرنے لگیں۔نوفہ میتھس میں اچھی تھی جبکہ تارہ کو میتھس سے چڑ تھی نہیں بلکہ اسے میتھس کی ٹیچر سے چڑ تھی جس کی وجہ سے وہ میتھس کو ہی ناپسند کرنے لگی تھی وجہ ٹیچر کا غیر منصفانہ رویہ تھا جو تارہ کو چڑاتا تھا ایسے میں نوفہ اس کی مدد کرتی تھی آخر وہ بہن کس لیے تھی؟

شبگیر خاندان کا اچار کا کاروبار محض ایک چھوٹا سا کارخانہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کے دادا کی وہ محنت تھی جسے سرمد شبگیر نے اپنی خون پسینے کی کمائی سے ایک چھوٹے برانڈ میں بدل دیا تھا۔شبگیر اچار کی مہک اب صرف کچن تک محدود نہیں تھی بلکہ شہر کے ہر بڑے سپر اسٹور کے ریک اس کی گواہی دیتے تھے۔حال ہی میں سرمد صاحب نے 'شبگیر مصالحہ' کے نام سے ایک نئی رینج بھی متعارف کروائی تھی،جس نے مارکیٹ میں آتے ہی توجہ کھینچ لی تھی۔ نیپالی اور پاکستانی ذائقوں کو ملا کر جو انہوں نے اچار بنایا تھا وہ منفرد تھا اور ایسے ہی نیپالی طریقوں پر مصالحہ جات اچھے بن گئے تھے۔یہی وجہ تھی کہ اسکول کی ان ماڈرن لڑکیوں کے لیے یہ چھیڑنے کا سب سے آسان ذریعہ تھا۔انہیں لگتا تھا کہ مصالحوں اور اچار کی تجارت کرنے والے شاید ان کے اس پرفیومز والے کلچر کا حصہ نہیں بن سکتے۔مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان تیکھے مصالحوں کی چمک نے ہی شبگیر ہاؤس کے در و دیوار کو وہ مضبوطی دی تھی جس پر اب ان کی اولاد فخر سے کھڑی تھی۔

☆☆☆☆☆

بزدار انٹرنیشنل اسپورٹس کالج کا میس ہال اس وقت کسی عالیشان ہوٹل کے ڈائننگ ایریا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بلند و بالا شیشے کی دیواریں جن کے پار کھیل کا وسیع میدان دھوپ میں چمک رہا تھا اور اندرونی فضا میں کافی کی بھینی بھینی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ اسٹوڈنٹس کے ڈیزائنر اسپورٹس گیئرز، برانڈڈ اسنیکرز اور مہنگے پرفیومز کی ملی جلی مہک اس جگہ کے ایلیٹ ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ نامرہ اس وقت اپنی سادہ سی جینز اور شرٹ کے اوپر سلال کی اوورسائز ڈ جیکٹ پہنے، ہاتھ میں سفید سیرامک کی ٹرے اٹھائے بوفے لائن کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لیئرز میں کٹے بال لاپروائی سے بکھرے ہوئے تھے اور چھوٹی آنکھیں سیاہ بینگز میں مزید چھپ رہی تھیں۔ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر دبلی پتلی سی لڑکی اپنے بکھرے بالوں میں کالج کی پُرکشش اسپورٹس گرل لگتی تھی۔ وہ اور آئمہ (کلاس فیلو) ایک ایک ڈش کے سامنے رکتے اور اپنی پسند کے لوازمات ٹرے میں رکھتے جاتے۔

"آج سلال بھائی کا رزلٹ ہے نا؟" آئمہ نے اپنی ٹرے میں ایوکاڈو ٹوسٹ رکھتے ہوئے دھیمے سے پوچھا۔

نامرہ نے پلیٹ میں پین کیکس رکھتے ہوئے شرارت سے اسے دیکھا۔

"ایک تو تم جب سلال کو بھائی کہتی ہو نا، مُجھے واقعی ہنسی آجاتی ہے۔"

آئمہ نے حیرت سے ابرو اٹھائی۔ "کیوں بھئی؟ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔"

"صرف ایک سال بڑا، آئمہ!" نامرہ نے فوراً تصحیح کی اور اپنی ٹرے میں میپل سیرپ کا جار رکھتے ہوئے آگے بڑھی۔ "ہم نے اسکول کالج ساتھ ختم کیا۔ وہ میرا بڑا بھائی کم اور میرا جڑواں بھائی زیادہ ہے۔ مُجھے تو کبھی کبھی اسے بھائی کہتے ہوئے بھی عجیب لگتا ہے۔"

"تم تو پاگل ہو..." آئمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ "سلال بھائی جیسا بھائی میرا ہوتا نا تو..."

"تم بھی وہی کرتیں جو میں کرتی ہوں۔" نامرہ نے پین کیک اٹھاتے منہ میں ڈالا۔ "گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔" وہ پین کیک چباتے بمشکل بولی۔ جس میس میں لڑکیاں کھاتے وقت بھی نفاست کا خیال رکھتی تھی وہاں نامرہ شگیر، بولتے وقت منہ سے باہر نکلتے پین کیک کو ہاتھوں سے واپس ٹھونس رہی تھی۔ نیمل دیکھ لیتی تو دس کلمات سے نوازتی۔

"خیر سلال بھائی مرغے کی کٹیگری میں نہیں آتے۔ وہ تو خوبصورت مور ہیں۔"

آئمہ دل و جان سے 'سلال بھائی' سے متاثر تھی۔ اسکا کوئی بھائی نہیں تھا اور شدت سے خواہش تھی کہ سلال جیسا ایک بھائی تو اسکا بھی ہوتا۔

دونوں اپنی ٹرے اٹھائے ہال کے وسط میں لگی ایک اسٹائلش میز کی طرف بڑھ گئیں۔

آئمہ کی بات پر نامرہ بے اختیار ہنس دی اور اس کی ہنسی کی کھنک اس پرسکون ہال میں ایک تازگی بھر رہی تھی۔ وہ دونوں اب ایک میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

"یہ جیکٹ بھی سلال بھائی کی ہے نا؟" آئمہ نے آنکھیں چھوٹی کیے تنک کر پوچھا۔

"تم تو ایسے تپ رہی ہو جیسے وہ تمہارا بھائی ہے اور میں کوئی غیر ہوں۔" نامرہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"ہاں تو کیا ہوا۔ بھائی بھائی ہوتا ہے..." آئمہ کی آواز سنائی دے رہی تھی جب اسی لمحے میس ہال کے بھاری شیشے کے دروازے کھلے۔

ثالث اپنے دو دوستوں کے جھرمٹ میں اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پچھلی رات کا تناؤ، وہ تھکن اور وہ خوف اب بھی کسی گہرے سائے کی طرح موجود تھا جو اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا تھا۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر سامنے والی میز پر بیٹھی نامرہ پر پڑی، زمین کی گردش پل بھر کو رہی۔ آئمہ کی اس کی جانب پشت تھی۔ اسے بس سامنے بیٹھی نامرہ نظر آ رہی تھی۔ جو اس وقت آئمہ کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی، کم از کم چند لمحوں کے لیے ہی سہی مگر ثالث کو وہ دنیا کی پرسکون اور معصوم ہستی لگی۔ اسے دیکھ کر ثالث کو یوں لگا جیسے وہ اچانک کسی گہرے سیاہ غار سے نکل کر تیز دھوپ میں آ کھڑا ہوا ہو۔ نامرہ کی وہ بے فکری، اس کی وہ بے نیاز ہنسی... یہ سب اس جرم کے برعکس تھا جسے ثالث پچھلی رات اپنے دامن سے باندھ آیا تھا۔ ثالث کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے سوچا تھا کہ کالج آ کر وہ نارمل ہو جائے گا مگر نامرہ کو دیکھتے ہی اسے اپنا گناہ مزید بدنما لگنے لگا۔ اس کے تنے ہوئے تاثرات پگھلنے لگے مگر سکون کی جگہ ایک عجیب سی وحشت نے لے لی۔ اسے لگا جیسے اب وہ اس معصومیت کے قابل نہیں رہا۔ اسے نامرہ خود سے میلوں دور نظر آئی۔

"چلو یہاں سے... مُجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے اچانک اپنے دوستوں سے کہا، اس کا لہجہ کٹا کٹا اور عجیب تھا۔

" کیا؟ ابھی تو آئے ہیں ثالث!" اس کے دوست نے حیرت سے پوچھا مگر ثالث رکنے والا نہیں تھا۔

وہ ایک لمحہ مزید وہاں رکتا تو شاید نامرہ کی ہنسی اسے مزید کچوکے لگاتی۔ وہ وہیں سے الٹے قدموں پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس وقت کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے وہ میس ہال، وہ ناشتہ اور وہ ہنسی اب ایک ایسی سزا بن چکی تھی جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا۔

" ثالث یار بھوک لگی ہے۔ بنا انرجی کے کیسے کھیلیں گے؟" اس کے دوسرے دوست نے اسے کہنی پکڑ کر روکنا چاہا۔ ثالث ایک جھٹکے سے مڑا۔

"تو جاؤ کھاؤ تم.. ٹھونس لو... کس نے منع کیا ہے؟" وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ میس کاؤنٹر پہ بیٹھا اسٹاف تک ساکت رہ گیا۔ ثالث کی رنگت گلابی پڑ چکی تھی اور اس کی گردن کی نسیں ابھر آئیں۔ اسکے دوست سہم کر پیچھے ہوئے۔

"ثالث..." ایک دوست نے ہمت کی۔

"مُجھے اکیلا چھوڑ دو..." وہ بے رخی سے کہتا پلٹ گیا۔ اسکے دوست وہیں کھڑے رہ گئے۔

نامرہ کے ساتھ آئمہ نے بھی مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں اب دولڑکے کھڑے تھے جبکہ ثالث جا چکا تھا۔ آئمہ نے سوالیہ نظروں سے نامرہ کو دیکھا۔

جیسے پوچھا ہو اُسے کیا ہوا ہے؟' جبکہ نامرہ نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیئے۔ اسے کیا فرق پڑتا تھا جو مرضی ہوتا رہے۔

☆☆☆☆☆

کچھ دیر بعد کالج کا ایسٹروٹرف (Astro Turf) گراؤنڈ کسی جنگی میدان کا منظر پیش کر رہا تھا۔فضا میں ہائی پریشر اسپرنکلرز سے گرتے پانی کی پھوار تھی جو ٹرف کو نم کر رہی تھی تاکہ گیند کی رفتار برقرار رہے۔چاروں طرف اونچی فینسنگ کے پار لگے بلوط کے درختوں سے چھن کر آتی دھوپ گراؤنڈ پر بچھے نیلے قالین نما ٹرف پر عجیب سے سائے بنا رہی تھی۔یہاں کا ماحول عام کالجوں جیسا نہیں تھا۔ایک طرف ایکسرسائز فزیالوجی اور اسپورٹس سائنٹسٹ کے اسٹوڈنٹس لیپ ٹاپ اور سنسرز لیے کھلاڑیوں کی ہارٹ ریٹ اور آکسیجن لیول نوٹ کر رہے تھے تو دوسری طرف بائیومکینکس کی ٹیم ہائی اسپیڈ کیمروں سے کھلاڑیوں کے دوڑنے کے زاویوں کا تجزیہ کر رہی تھی۔ہوا میں ڈیپ ہیٹ اور پسینے کی تیز بو کے ساتھ ساتھ ہاکی اسٹکس کے ٹرف سے ٹکرانے کی کلک کلک کی آوازیں ایک مخصوص ردھم پیدا کر رہی تھیں۔

نامرہ اب نیلے ٹریک سوٹ یعنی یونیفارم میں ملبوس، اپنے کانوں میں وائرلیس ہیڈسیٹ لگائے فیلڈ کے کنارے بنے ری ہیب اسٹیشن پر کھڑی تھی۔اس کے سامنے ایک ٹیبلٹ پر کھلاڑیوں کا لائیو ڈیٹا چل رہا تھا۔دل کی رفتار، مسلز fatigue سے لے کر آکسیجن لیول...سب کچھ۔اسکے کے بال اب پونی میں بندھے تھے جس سے نکلنے والی بینگز کی لٹیں اس کی آنکھوں میں آ رہی تھیں جنہیں وہ بار بار جھنجھلا کر پیچھے ہٹاتی۔اس کے لیے یہ محض ڈیوٹی نہیں تھی۔وہ اسپورٹس انجریز کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے محسوس کرنے کا فن جانتی تھی۔گراؤنڈ کے سینٹر ہاف میں ثالث اپنی مکمل کٹ میں موجود تھا۔اس نے پیروں پر ہیوی ڈیوٹی شن گارڈز، ہاتھوں میں پروفیشنل گلووز اور منہ میں گم شیلڈ (Gum Shield) پہنی ہوئی تھی۔بظاہر وہ مکمل محفوظ تھا مگر اس کے اندر جو آگ لگی تھی، وہ اس کٹ سے زیادہ مضبوط تھی۔کھیل شروع ہوا تو ثالث کی رفتار غیر معمولی تھی۔وہ جان بوجھ کر خطرناک ٹیکلز کر رہا تھا۔ہاکی میں جب کوئی غلط زاویے سے سلائیڈ مارتا ہے تو کٹ کے باوجود اس کے جوڑ مڑ سکتے ہیں۔ثالث نے یہی کیا۔ایک تیز رفتار موو کے دوران اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنا توازن اس طرح بگاڑا کہ اس کا گھٹنا کٹ کے اوپری حصے سے ٹرف پر بری طرح رگڑ کھا گیا۔ٹرف برن (Turf Burn) کسی آگ کی طرح تپتا ہوا تھا مگر وہ نہیں رکا۔چند منٹ بعد ایک شاٹ کو روکتے وقت اس نے اپنا ہاتھ غیر محفوظ زاویے پر رکھا۔گیند اس کے دستانے کے اس حصے پر لگی جہاں پیڈنگ کم تھی۔انگلیوں کے جوڑوں پر۔درد کی ایک لہر اس کے پور پور میں دوڑ گئی مگر اسے یہی درد چاہیے تھا۔اسے جسمانی تکلیف کی وہ لہر چاہیے تھی جو اس کے دماغ میں گونجتی ٹکر کی آواز کو دبا سکے۔جب ثالث کے ماتھے پر ایک مخالف کھلاڑی کی اسٹک کا کنارہ (جو کہ کٹ کا حصہ نہیں تھا) لگا اور وہاں سے خون کا ایک قطرہ اس کی سفید جرسی پر گرا تو کوچ نے غصے سے سیٹی بجائی۔

"ثالث! آف دی فیلڈ! دفع ہو جاؤ! ابھی!" کوچ کی آواز گونجی۔ثالث لنگڑاتا ہوا، پسینے میں شرابور، نامرہ کے اسٹیشن کی طرف بڑھا۔اس کے بھاری جوتوں کی آواز ٹرف پر عجیب لگ رہی تھی۔وہ نامرہ کے سامنے جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔اس کا سینہ شدتِ جذبات سے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔نامرہ نے ٹیبلٹ سائیڈ پر رکھا اور نہایت ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔اس نے نیلے لیٹیکس دستانے چڑھا لیے تھے۔

"تمہارے ریفلیکسز اتنے برے نہیں ہیں کہ تمہیں اتنی چوٹیں لگیں۔" نامرہ نے سرد لہجے میں کہا اور ایک اسپرے اٹھا کر اس کے ہاتھ پر چھڑکا۔ "یا تو تم نشے میں ہو یا پھر تم اسپورٹس کالج کو سرکس سمجھ رہے ہو۔"

ثالث نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔ نامرہ کے ہاتھ جب اس کے زخمی ہاتھ کو معائنے کے لیے چھو رہے تھے تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے بھڑکتے ہوئے انگارے پر برف رکھ دی ہو۔ نامرہ کے چہرے پر ہمدردی کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا صرف پیشہ ورانہ سختی تھی۔

"یہ ٹرف برن نہیں، یہ بیوقوفی کا نشان ہے۔" نامرہ نے اس کے گھٹنے پر پٹی باندھتے ہوئے اسے زور سے جھٹکا دیا۔ "تم جیسے سیلفش کھلاڑیوں کی وجہ سے پوری ٹیم کا ڈسپلن خراب ہوتا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ تم اولمپکس میں جاؤ گے؟ اس لاپروائی کے ساتھ تم صرف ہسپتال کے بستر تک جا سکتے ہو۔"

ثالث نے ایک گہری سانس لی۔ نامرہ کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اسے چھید رہا تھا مگر اسے یہ ملامت اچھی لگ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ نامرہ اسے اس کے گناہ کی وہ سزا دے رہی ہے جو اسے اب تک کسی نے نہیں دی تھی۔

"تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟" اس کے ماتھے کا زخم صاف کرتے ہوئے نامرہ نے پوچھا، اس کی آواز میں طنز تھا۔ ان کی آپس میں جتنی دشمنی سہی مگر فیلڈ میں نامرہ ایمانداری سے کام کرتی تھی۔

"ہو رہی ہے..." ثالث نے دھیمے سے کہا، "مگر اس سے نہیں جو تم کر رہی ہو۔"

نامرہ کے تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ رکے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے ثالث کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ ثالث کو اس کی آنکھیں پل بھر کو نظر آئیں۔ وہ چھوٹی تھیں مگر خوبصورت تھیں۔ لیکن نامرہ کو ثالث کی آنکھوں میں ایک ایسی ویرانی تھی جو اسے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ ایک لمحے کو تھمی مگر پھر فوراً خود کو سنبھالا اور پٹی کو آخری گرہ لگا کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"ہو گیا! اب یہاں سے جاؤ اور میری فیلڈ خراب مت کرو۔ تمہاری یہ ڈرامہ بازی کسی اور کے لیے ہوگی، میرے لیے تم صرف ایک کیس فائل ہو جس کا ڈیٹا مجھے رات تک اپ لوڈ کرنا ہے۔"

وہ مڑی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پروفیسر کی ہدایات سننے لگی جیسے ثالث کا وجود اس کے لیے کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔ اس کے پونی میں بندھے بال اڑ رہے تھے۔ ثالث کھڑا ہوا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں درد تھا، پٹیاں کھینچ رہی تھیں مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان ابھر آیا۔ اس نے اپنی ہاکی اسٹک دوبارہ اٹھائی۔ اسے شاید وہ مرہم مل گیا تھا جو اسے پچھلی رات کی یاد سے دور لے جا سکتا تھا۔ وہ دوبارہ گراؤنڈ کی طرف مڑا، اب اس کی چال میں وہ شکست نہیں تھی بلکہ ٹھہراؤ تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اسے دوبارہ 'زندہ ہونا' محسوس کرنے کے لیے نامرہ کے پاس ہی آنا پڑے گا، چاہے وہ اسے اپنی نفرت سے ہی کیوں نہ نوازے۔ گراؤنڈ میں کوچ کی سیٹی دوبارہ گونجی اور ثالث بزدار اب ایک بالکل مختلف کھلاڑی بن کر دوبارہ ٹرف پر اتر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

عدالت کی راہداریوں میں کالے کوٹ کی سرسراہٹ اور بوٹوں کی آواز ایک خاص رعب پیدا کر رہی تھی۔ نیمل شبگیر سادہ سے سوٹ پر کالا کوٹ پہنے، بالوں کا ایک نفیس اور ڈھیلا سا بنایا ہوا جوڑا سجائے، اپنے آفس سے باہر نکلی۔ وہ ایک ڈیفنس لائیر تھی اور اس کا کیس اس کے لیے محض ایک قانونی جنگ نہیں بلکہ اس کے اصولوں کا امتحان تھا۔ اسے ایک ایسے لڑکے کا دفاع کرنا تھا جسے ریپ کے جھوٹے الزام میں پھنسایا گیا تھا۔ نیمل کی آنکھوں میں وہ مخصوص تیزی تھی جو صرف ان لوگوں میں ہوتی ہے جنہیں اپنے موقف کی سچائی پر کامل یقین ہو۔ جب وہ لا کالج میں تھی، تب بھی وہ اپنی باؤنڈریز اور اصول پسندی کے لیے مشہور تھی۔ بڑے سے بڑے رئیس زادے اس سے فلرٹ کرنے سے پہلے سو بار سوچتے تھے۔ ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ جن سے بات کرنے سے پہلے پر تولنے پڑتے ہیں۔ جن کی ذات کا وہ مخصوص رعب کسی کو جلدی ان کے قریب جانے نہیں دیتا۔ نیمل شبگیر بھی ویسی ہی لڑکی تھی۔ وہ جیسے ہی وہ راہداری میں پہنچی، وہاں کھڑے تین اسٹوڈنٹس (جو کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں وہاں آئے تھے) اسے دیکھ کر رک گئے۔ ان میں سے ایک حارث تھا جس کی انا کو نیمل نے کالج کے دنوں میں بری طرح کچلا تھا، اس نے حقارت سے نیمل کو دیکھا۔

"وہ دیکھو... نیمل شبگیر! بن گئی ڈیفنس لائیر۔" حارث نے اپنے دوستوں کو کہنی ماری۔

"کیا یار! کس کی شکل دیکھ لی صبح صبح۔ سارا دن خراب جائے گا۔" دوسرا لڑکا جواد بڑبڑایا۔ یہ وہ لڑکا تھا جسے نیمل نے کالج کے دور میں ایک بار تمیز سکھانے کے لیے سب کے سامنے جھاڑ دیا تھا۔ یوں تو وہ خوش مزاج تھی اور اپنی خوش مزاجی سے ہی اگلے کو میٹھی میٹھی تمیز سکھا دیتی تھی۔

"بڑا غرور تھا اسے اپنے خاندان کی نیک نیتی پر، اب دیکھو... مجرموں کو بچانے کے لیے کالی وردی پہن لی ہے۔" حارث نے طنز کیا۔ "ارے ہاں... اس کے تو خاندان میں ہی مجرم ہیں۔" یقیناً اسکا اشارہ سقراط کی جانب تھا۔

وہ قریب آ رہی تھی۔ اس کی چال میں نفاست تھی۔ وہ آوازیں سن کر بھی ان سنی کر رہی تھی۔ تبھی حارث نے اپنا فون نکالا اور ایک تصویر اسکرین پر لہرائی۔

"یہ لڑکی دیکھو..." اس نے اپنے دوستوں کو ایک انسٹاگرام پروفائل دکھائی۔

"یہ کون ہے؟" جواد نے پوچھا۔

"یہ وردہ سکندر ہے۔ محترمہ کی کزن!" حارث کے لہجے میں ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" تیسرا دوست بھی حیران ہوا۔

"آج کل انسٹاگرام پہ کسی کو ڈھونڈنا مشکل نہیں ہے۔ ویسے تو اس نے مُجھے بلاک کرنے کی دھمکیاں دی ہیں مگر جب بھی میسج کرو، ریپلائے ضرور آتا ہے۔ ڈیفنس لائیر نیمل شبگیر کی کزن، وردہ سکندر... تک پہنچنا اور اس سے باتیں کرنا کچھ خاص مشکل کام نہیں تھا۔"

نیمل ان کے قریب سے گزری تو اس کے کانوں میں وردہ سکندر اور ریپلائے کے الفاظ کسی گرم سلاخ کی طرح اترے۔ اس کے قدم نہیں رکے، اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا مگر اس کے اندر ایک لاوا سا پکنے لگا۔ وردہ... اس کی کم عمر کزن ان جیسے اوباش لڑکوں کے جال

میں پھنس رہی تھی؟ وہ کوئی ردعمل دے کر خود کو کمزور ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے خاموشی سے گزر گئی۔ کچھ دیر بعد وہی تینوں لڑکے اپنے ایچ او ڈی کے حکم پر نیمل کے آفس کے سامنے کھڑے تھے۔ انہیں اپنی فائنل اسائنمنٹ کے لیے ایک کیس اسٹڈی چاہیے تھی اور نیمل سے بہتر گائیڈ کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ نیمل اپنے ڈیسک پر بیٹھی فائل پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ان تینوں کو دیکھا۔ وہ اب بھی وہی مغرور اور لاپرواہ لڑکے لگ رہے تھے مگر فی الوقت نیمل کے سامنے ان کی زبانیں گنگ تھیں۔

"تو...آپ لوگوں کو یہ کیس اسٹڈی چاہیے؟" اس کی آواز میں وہ کاٹ تھی کہ ریان نے تھوک نگلا۔

"جی میم...وہ سر نے کہا تھا کہ..." جواد نے ہکلاتے ہوئے کہنا چاہا مگر نیمل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ ان کے گرد دائرہ بنانے لگی۔ اس کے قدم مضبوط تھے۔ اس کی خاموشی ان تینوں کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ پھر وہ ان کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ دراز قد تھی تو ان کے مقابل کھڑی رعب دار لگی۔

"میں کام کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوں۔ جب کوئی ٹھیک سے کام نہیں کرتا تو مُجھے غصہ آتا ہے...اور جب مُجھے غصہ آتا ہے تو مجھ میں میرے 'نانا' آجاتے ہیں۔" اس نے نہایت سکون سے کہا مگر اس کے لہجے کی سردی سے مقابل کی ریڑھ کی ہڈی میں جھرجھری دوڑ گئی۔

"آپ کے نانا؟" حارث نے نادانی میں پوچھ لیا۔

نیمل نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"یہ فائلیں لو اور کل صبح تک ریسرچ مکمل ہونی چاہیے۔" اس نے نانا کا تعارف کروانا ضروری نہیں سمجھا۔

وہ فائلیں ان کے ہاتھوں میں تھما کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے بعد ان تینوں نے سکھ کا سانس لیا مگر تجسس اب بھی باقی تھا۔ ریان نے قریب سے گزرتے ایک جونیئر وکیل کو روکا۔

"او بھائی! یہ نیمل میم کے نانا کون ہیں؟"

جونیئر وکیل نے حیرت سے انہیں دیکھا، جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے آئے ہوں۔

"تم لوگوں کو نہیں پتا؟" وہ اچنبھے سے بولا۔ تینوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"امجد بزدار!" دو لفظی جواب دے کر وہ آفت بڑھ گیا۔

یہ نام سنتے ہی حارث کے ہاتھ سے فائل گرتے گرتے بچی۔ جواد کا رنگ پیلا پڑ گیا اور ریان کی تو جیسے سٹی ہی گم ہوگئی۔

"امجد...امجد بزدار؟ وہ 'دی لائن آف بزدار'؟" حارث کی آواز بمشکل نکلی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس لڑکی کی کزن کو میسج کرنے کے قصے سنا رہا تھا۔ اسے اپنی گردن پر کسی نادیدہ پھانسی کے پھندے کا دباؤ محسوس ہوا۔

"بھائی...انسٹاگرام اکاؤنٹ ڈیلیٹ کرنا پڑے گا۔" جواد نے کانپتی آواز میں کہا۔

"انسٹا گرام چھوڑو... مُجھے لگ رہا ہے ہمیں یہ شہر ڈیلیٹ کرنا پڑے گا!" ریان نے بدحواسی میں اپنا بیگ سنبھالا۔شاید وہ اس سے بھی ناواقف تھے کہ شبگیر خاندان کی بزداروں سے نہیں بنتی تھی ورنہ اتنے خوفزدہ نہ ہوتے۔

فی الوقت ان تینوں کی حالت ایسی تھی جیسے انہوں نے غلطی سے کسی شیرنی کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو اور اب انہیں پتا چلا ہو کہ اس کا نانا 'جنگل کا بادشاہ' ہے۔ وہ تینوں جو تھوڑی دیر پہلے نیمل کے خاندان کی نیک نیتی کا مذاق اڑا رہے تھے اب راہداری میں ایسے بھاگ رہے تھے جیسے پیچھے امجد بزدار کا پورا قبیلہ کلاشنکوفیں لیے کھڑا ہو نہیں بلکہ بھیڑیوں کا پورا خاندان ان کے شکار پہ نکل آیا ہو۔ دور ایک ستون کی اوٹ میں کھڑی نیمل یہ منظر دیکھ رہی تھی،اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ بزداروں سے تعلق ہونا کبھی کبھی واقعی بہت کارآمد ثابت ہوتا تھا۔وہ تینوں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ گہری سانس لے کر تنے اعصاب ڈھیلے کیے اور خود پر قابو پاتے ہوئے پلٹ گئی۔اب وہ متوازن چال سے آگے بڑھ رہی تھی۔

نیمل شبگیر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے نانا 'امجد بزدار' پر گئی تھی۔ وہ امجد بزدار کی بڑی بیٹی زہرہ بزدار کی بڑی بیٹی تھی۔اس کے تعارف کے لیے اتنا کافی تھا۔

The eldest daughter and the eldest granddaughter!

وہ اپنی مرضی کی مالکن تھی۔ کسی کو سر پہ بٹھانا ہو یا زمین پر پٹخنا ہو اس کا میکنزم بالکل اپنے نانا جیسا تھا۔بس یہ ایک عادت تھی جو اسے بزداروں سے جوڑتی تھی ورنہ وہ پوری کی پوری شبگیر تھی۔ڈیفنس لائیر نیمل شبگیر!

☆☆☆☆☆

سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔سورج کی روشنی اب مدھم پڑ چکی تھی مگر شبگیر فیکٹری کے بلند و بالا گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی فضا میں سرکے کی کھٹاس اور لال مرچوں کی تیکھی مہک نے مدھم تپش کا زور توڑ دیا۔ یہ 'شبگیر پکلز اینڈ سپائسز' کا وسیع و عریض کارخانہ تھا جہاں دور سے آتا مشینوں کا شور اور مزدوروں کی چہل پہل زندگی کے دھڑکنے کا ثبوت دے رہی تھی۔ اچانک خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک بھاری بائیک کے انجن کی گونج سنائی دی۔ اندر موجود گارڈز نے چونک کر دیکھا۔ایک سیاہ ہیوی بائیک نہایت مہارت سے اندر داخل ہوئی تھی۔سوار نے سیاہ ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا۔آنکھوں پر سن گلاسز تھے اور ہیلمٹ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے آدھے بال سر کے اوپر ایک چھوٹے سے جوڑے میں قید تھے جبکہ باقی آدھے اس کی گردن پر ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔وہ نہایت اطمینان سے ببل چبا رہا تھا۔گیٹ پر اس کی پہچان ہوتے ہی اسے فوراً اندر آنے دیا گیا تھا۔ پرانے گارڈز کی نظریں جیسے ہی اس کے چہرے پر پڑیں،ان کے ہاتھ خود بخود سلام کے لیے تن گئے۔دس سال...ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔دس سال پہلے جو تیس سال کا تیکھے نقوش والا نوجوان یہاں سے گیا تھا،آج وہ تینتیس چونتیس سالہ ایک بھرپور، توانا اور رعب دار مرد بن کر لوٹا تھا۔

"سقراط صاحب؟" ایک بوڑھے گارڈ کی آواز میں حیرت اور خوشی ملی جلی تھی۔ سقراط نے چشمہ تھوڑا نیچے کر کے اسے دیکھا ایک دلکش مگر مختصر سی مسکراہٹ دی اور سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر آگے بڑھ آیا۔ انٹرکم پر سرمد صاحب کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دوسری منزل پر موجود اپنے آفس کی کھڑکی سے اپنے باغی بھائی کو دیکھ رہے تھے جو دس سال بعد اس مٹی پر قدم رکھ رہا تھا جسے اس کے بڑوں نے خون پسینے سے سینچا تھا۔ سرمد صاحب جانتے تھے کہ آج کل فیکٹری کا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔ مزدوروں کی سیاست اور منشی کی چالاکیوں نے کام کا بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ انہوں نے انٹرکم اٹھایا اور سقراط کو براہِ راست ہال میں جانے کا کہا جہاں مزدوروں کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ انہیں دو مختصر جملوں میں سارا معاملہ بتا چکے تھے۔ سقراط کے لیے اتنا کافی تھا۔ وہ جانتا تھا اسے کیوں بلایا گیا تھا۔

فیکٹری کے بڑے ہال میں جو نسبتاً خالی ہوتا تھا اس وقت مچھلی منڈی کا سماں تھا۔ ایک طرف وہ بوڑھے ملازم تھے جو شبگیر خاندان کے وفادار تھے اور دوسری طرف وہ نئے لڑکوں کا گروہ تھا جنہیں منشی نے ہڑتالوں اور بدتمیزی پر اکسا رکھا تھا۔ تیس سال پہلے منشی ظفر اس کارخانے کا حصہ بنا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ منشی کے عہدے پر آیا اور اب یہاں سیاست دان بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سقراط ہال میں داخل ہوا مگر اس سے پہلے وہ کئی رجسٹر کئی ریکارڈ دیکھ کر آیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اب لکڑی کا ایک ڈنڈا تھا۔ اس نے خاموشی سے ہال کے بیچوں بیچ پڑے ایک لکڑی کے اونچے اسٹول کو کھینچا اور اس پر طرح براجمان ہو گیا۔ آنکھوں سے چشمہ اتر کر اب شرٹ کے گول گلے میں لٹک رہا تھا۔

"ہاں بھئی! کیا میلہ لگا رکھا ہے؟" سقراط کی آواز گونجی تو پورے ہال میں سانپ سونگھ گیا۔

منشی ظفر ایک کونے میں کھڑا مسکرا رہا تھا فوراً آگے بڑھا اور مصنوعی ہمدردی سے بولا۔

"سقراط بیٹا! آپ کیوں زحمت کر رہے ہیں؟ یہ مزدور لوگ ہیں، ذرا پیسوں کے پیچھے ہڑتال کر دی ہے اور یہ پرانے لوگ..." اس نے بوڑھے ملازموں کی طرف حقارت سے اشارہ کیا، "یہ اب کام کے نہیں رہے، میں کہتا ہوں انہیں فارغ کر دیں تاکہ نئے خون کو جگہ ملے۔"

سقراط نے منشی کو پیر سے سر تک دیکھا۔

"منشی جی! نیا خون اگر کینسر زدہ ہو جائے تو اسے جسم میں نہیں رکھتے، نکال دیتے ہیں۔"

منشی کا رنگ فق ہو گیا۔ نئے گروہ کا لیڈر، ایک اکھڑ مزاج نوجوان شیرا ایک قدم آگے بڑھا۔

"دیکھیں صاحب! ہمیں تنخواہ زیادہ چاہیے اور ان بڈھوں کی وجہ سے ہمارا کام لیٹ ہوتا ہے۔ ہم یہاں ہڑتال ختم نہیں کریں گے جب تک ہماری مانگیں پوری نہیں ہوتیں۔"

سقراط نے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے ڈنڈے کو زمین پر ایک بار ٹھونکا۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ شیرا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مانگیں وہاں پوری ہوتی ہیں جہاں مانگنے والا سلیقہ جانتا ہو۔ تم تو بھیک بھی ڈنڈے کے زور پر مانگ رہے ہو۔" اکھڑ مزاج تو وہ شروع سے

تھا۔" تمہیں لگتا ہے کہ تم لوگ ہڑتال کرو گے اور فیکٹری بند ہو جائے گی؟" اس نے تمسخرانہ نظر اس مخصوص گروہ پر ڈالی جن سے بغاوت اور سازش کی بو آتی تھی۔

"جی بالکل! ہم کام نہیں کریں گے تو کام کیسے ہوگا؟" شیرا نے سینہ تان کر کہا۔

"تم لوگ کام نہیں کرو گے تو میں سب کا اچار بنا کر ان مرتبانوں میں بھر دوں گا، کم از کم کسی کے کام تو آؤ گے۔"

پرانے ملازموں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دوسرے گروہ میں چہ میگوئیاں دوڑ گئیں۔ شاید وہ اب تک سرمد صاحب کی نرم دلی کا فائدہ اٹھا کر اس قدر ہوشیار ہوئے تھے۔ یہ سقراط پتا نہیں کہاں سے آ گیا تھا۔

"اب میری بات غور سے سنو، دونوں گروہ۔" سقراط کا لہجہ اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"یہ فیکٹری صرف اچار اور مصالحہ نہیں بناتی، یہ شگیر ز کا نام بناتی ہے۔ جو پرانے بابا لوگ یہاں بیٹھے ہیں، انہوں نے تب سے یہاں کام کیا ہے جب تم لوگ شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ منشی جی کہتے ہیں انہیں نکال دوں؟ منشی جی! اگر گھر کا بزرگ بوڑھا ہو جائے تو اسے گھر سے نہیں نکالتے، اس کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں۔"

اس نے منشی کو ملامتی نظروں سے دیکھا اور پھر ایک بوڑھے ملازم رحمت چاچا کو پاس بلایا۔ یہ وہ لوگ جو پیکنگ کا کام کرتے تھے۔ مصالحہ جات اور اچار کے پیکٹس کو بڑے بڑے ڈبوں میں ڈالنا، انہیں لوڈ کرنا۔ یہ ان دو گروہ کے ذمہ تھا۔

"چاچا! یہ لڑکے کہتے ہیں آپ کام نہیں کر سکتے۔"

"بیٹا! ہم تو جان مارتے ہیں پر یہ لڑکے مشینیں خراب کر دیتے ہیں تا کہ ہڑتال کا بہانہ ملے۔" رحمت چاچا کی آواز میں سچائی تھی۔

سقراط نے شیرا کی طرف دیکھا جواب پسینہ پونچھ رہا تھا۔

"کیوں بھئی شیرا؟ مشینیں خراب کرنا تمہارا کھیل ہے؟ دیکھو، میں ہاکی کا کھلاڑی ہوں۔ مُجھے پتا ہے کہ جب بال گول پوسٹ میں نہ جا رہی ہو تو بال نہیں، کھلاڑی بدلا جاتا ہے۔"

اس نے ڈنڈے کی نوک سے منشی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور منشی جی! آپ کا حساب کتاب میں نے دیکھ لیا ہے۔ جتنا پیسہ آپ ان لڑکوں کو ہڑتال کے لیے دے رہے ہیں اس سے آدھے میں یہ سب خوش ہو جاتے۔ آپ کا کمیشن آج سے بند۔"

منشی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "سقراط صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

سقراط اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا اس کی قامت اور اس کا رعب پورے ہال پر چھایا ہوا تھا۔

"اب فیصلہ سنو! پرانے ملازموں کی تنخواہ میں بیس فیصد اضافہ ہوگا کیونکہ ان کی وفاداری کی کوئی قیمت نہیں۔ اور تم لوگ..." اس نے نئے گروہ کی طرف دیکھا، "تمہارے لیے اگلے ایک مہینے کا پروبیشن ہے۔ اگر کام میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوئی یا ایک بھی مشین خراب ہوئی تو میں تمہیں نکالوں گا نہیں بلکہ ایک ایک نقصان کی قیمت وصول کروں گا۔" وہ ان کا پروپیگنڈا اچھے سے سمجھ گیا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں لو دیتی ہوئی تھیں۔

شیرا اور اس کے ساتھیوں کی سٹی گم ہو چکی تھی اور منشی کے تو اپنے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ سقراط ہال سے باہر نکلتا ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر ملازم ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں کی تھکن اور ایک عجیب سی بے بسی تھی۔

"صاحب... ایک عرض کرنی تھی۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

سقراط نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "بولیں بزرگو! کیا مسئلہ ہے؟"

"صاحب! ایک سال ہو گیا ہے... گھر نہیں گیا۔ بیٹی کی شادی کی بات چل رہی ہے، بیوی بیمار ہے۔ منشی جی سے کئی بار چھٹی مانگی پر یہ کہتے ہیں کہ کام کا بوجھ ہے۔ چھٹی نہیں مل سکتی۔" اس نے ایک نظر خوفزدہ ہو کر منشی کی طرف دیکھا جو وہیں کھڑا تیکھی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

سقراط کی نظریں دھیرے سے گھومیں اور منشی کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"منشی جی... یہ چھٹیاں دینے یا نہ دینے کا ٹھیکہ آپ نے کب سے لے لیا؟" اس کی آواز تیز اور طنزیہ تھی۔

منشی نے ہکلاتے ہوئے صفائی دینی چاہی۔ "وہ... صاحب... فیکٹری میں کام بہت ہے اگر سب ایسے ہی گھر جانے لگے تو..."

"رہنے دیجیے..." سقراط نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ پھر وہ اس بوڑھے ملازم کی طرف مڑا۔ "آپ کل سے دس دن کی چھٹی پر ہیں۔ سکون سے گھر جائیں، بیٹی کا رشتہ پکا کریں اور بیوی کا علاج کرائیں۔ آپ کی تنخواہ میں سے ایک روپیہ بھی نہیں کٹے گا۔"

بوڑھے ملازم کی آنکھوں میں چمک آئی مگر وہ فوراً ہی بجھ گئی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں منشی کی طرف دیکھا جیسے ڈر ہو کہ سقراط کے جاتے ہی منشی اسے کچا چبا جائے گا۔

"لیکن صاحب... منشی جی..." اس نے سرگوشی نما انداز میں کہا۔

سقراط اس کے خوف کو بھانپ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا نیچے پٹخا اور ہال میں موجود تمام مزدوروں کو مخاطب کیا۔

"آج کے بعد کسی کو منشی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل سے میں روزانہ فیکٹری آ رہا ہوں، یہیں اسی اسٹول پر بیٹھوں گا۔ کسی کو کوئی تکلیف ہو تو ڈائریکٹ مجھ سے بات کرے۔"

مزدور نے ایک بار پھر ڈرتے ہوئے دہرایا، "پر صاحب... منشی جی..."

"چولہے میں جائے منشی..." وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھتے جبکہ دوسرا اچھالتے ہوئے بولا۔ انداز میں بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ منشی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جیسے اسے زندہ چولہے میں جھونک دیا گیا ہو۔

"اب آپ سب لوگ جا سکتے ہیں۔"

اس کے حکم پر ہال میں موجود سبھی مزدور ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ وہ واپس منشی ظفر کی طرف پلٹا۔

"منشی جی، کل سے ذرا ٹائم پر آ جائیے گا۔ مُجھے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔"

منشی ظفر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد سقراط جس رفتار سے فیکٹری آیا تھا اسی رفتار سے واپس چلا گیا مگر پیچھے مزدوروں کے چہروں پر ایک ایسی تسلی چھوڑ گیا جو شبگیر فیکٹری میں برسوں بعد دیکھی گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

سورج کی ڈھلتی ہوئی سنہری شعاعیں نیمل کے آفس کی کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھیں جہاں میز پر پھیلی فائلز اب ایک ترتیب سے اپنی جگہ پا چکی تھیں۔اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھا، چار بجنے والے تھے پھر ایک لمبی سانس کھینچی اور کرسی پیچھے دھکیل کر ذرا سکون سے بیٹھ گئی۔آج سلال کے میڈیکل کالج کا وہ خاص دن تھا جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔بچپن سے لے کر آج تک وہ ہمیشہ اس کے رزلٹ کے لیے جاتی رہی تھی اور سلال کو بھی اسے ہمیشہ اپنے رزلٹ کے دن دیکھ کر حوصلہ ہوتا تھا۔سرمد صاحب فیکٹری کے کام میں ناک ناک ڈوبے رہتے تھے اور زہرہ بیگم اپنی ناساز طبیعت کی بدولت ہمیشہ ہر جگہ موجود نہیں ہو پائیں۔کم عمری سے ہی یہ زمہ داری نیمل نے سنبھال اور کب یہ لازم و ملزوم ہو گیا پتا ہی نہیں چلا۔نیمل شبگیر کی پوری زندگی اپنے خاندان کے گرد گھومتی تھی۔وہ اس کے لیے سب کچھ تھے۔

سرمد صاحب نے آج خاص طور پر گاڑی اور ڈرائیور بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ابھی ڈرائیور کے پہنچنے میں چند منٹ باقی تھے تو اس نے میز پر پڑا اپنا فون اٹھا لیا۔

اسکرین روشن ہوتے ہی فیملی گروپ کے نوٹیفیکیشنز کی بھرمار تھی۔نوفہ اور تارہ نے، جو ہمیشہ شرارتوں میں ایک دوسرے کی سگی شریکِ جرم رہتی تھیں انسٹاگرام کی کچھ ریلز شیئر کر رکھی تھیں۔نیمل نے مسکراتے ہوئے پہلی ریل پلے کی۔ویڈیو ایک اینیمیٹڈ فارمیٹ میں تھی جس کا عنوان تھا کہ 'اللہ تعالیٰ نے بڑی بہن کو کیسے بنایا؟'

ایک بڑا سا برتن (جو کہ بڑی بہن کی شخصیت تھا) سامنے رکھا تھا اور غیب سے ایک ہاتھ مختلف خوبیوں کے چھوٹے برتن اس میں انڈیل رہا تھا پہلے ایک بڑا جگ جو پانی سے بھرا ہوا تھا میں گرا۔'ڈھیر ساری ممتا اور ذمہ داری' نیمل کے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ آئی، اسے اپنا وہ وقت یاد آیا جب اپنے چار بہن بھائیوں کے اسکول کے داخلے سے لے کر ان کے کالج کے فارم بھرنے تک سب کچھ اسی کے کندھوں پر تھا۔

پھر ایک اور برتن گرا۔تحفظ یعنی protective streak۔ہاں یہ تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔تبھی تو کالا کوٹ پہنا تھا۔

پھر آیا قربانی کا جذبہ۔اس لمحے نیمل کی نظریں اپنے سامنے پڑی لاء کی ڈگری پر جم گئیں، جس کے پیچھے اس کا ڈاکٹر بننے کا ادھورا خواب دفن تھا۔

ویڈیو چلتی رہی...'حکم چلانے کی عادت' پر پورا مٹکا انڈیلا گیا تو وہ بے ساختہ ہنسی۔

"ظالموں نے کتنا غور کیا ہے مجھ پر..." ہنستے ہوئے زیرِ لب بڑبڑائی۔مگر اصل کلائمیکس ابھی باقی تھا۔جیسے ہی اسکرین پر لکھا آیا Listening Power (یعنی دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ) تو وہ بڑا ہاتھ رکا، ذرا سا ہچکچایا اور پھر ایک چھوٹے سے چمچ سے پانی کا محض ایک قطرہ اس بڑے برتن میں ٹپکایا۔یہ دیکھتے ہی نیمل زور سے ہنس دی۔

"یہ تو سراسر زیادتی ہے۔" وہ ہنستے ہنستے کرسی کی پشت سے جا لگی۔یہ سچ تھا، بڑی بیٹی اور پھر بڑی بہن...وہ اپنی سناتی تو سب کو تھی مگر جب

سننے کی باری آتی تو وہ کسی کی نہیں سنتی تھی۔ سن بھی لیتی تھی تو فیصلہ وہی کرتی تھی جو اسکا دماغ کہتا تھا۔

وہ ابھی ٹائپنگ پیڈ کھول کر ان دونوں چڑیلوں کو کوئی کرارا سا جواب دینے ہی والی تھی کہ فون کی اسکرین پر ڈرائیور کا نام چمکنے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس لی، اپنی ہنسی ضبط کی اور سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کالا کوٹ اتار کر بازو پر رکھا، فائلز بیگ میں ڈالیں اور پروقار انداز میں چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"سنتی تو میں واقعی کسی کی نہیں ہوں..." اس نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ چہرے پر ایک فخریہ چمک لہرائی۔ اب اسکا رخ سلال کے کالج کی جانب تھا۔

☆☆☆☆☆

کالج کے وسیع وعریض گراؤنڈ پر اب شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ پریکٹس سیشن ختم ہو چکا تھا اور فیلڈ پر کھلاڑیوں کی گہما گہمی اب تھکن زدہ قدموں کی چاپ میں بدل گئی تھی۔ ثالث جو ابھی کچھ دیر پہلے تک گراؤنڈ میں اپنی تمام تر توانائی نچوڑ چکا تھا اب ایک لکڑی کے بنچ پر بیٹھا اپنی ہیوی کٹ اتار رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر لگی وہ پٹی جو نامرہ نے نہایت بے دلی سے باندھی تھی اب پسینے سے تھوڑی اکھڑ رہی تھی مگر اس کا لمس اب بھی ثالث کے اعصاب پر طاری تھا۔ اچانک اس کے قریب بینچ پر رکھا فون تھرتھرایا۔ اسکرین پر عالیہ کا نام چمک رہا تھا۔

ثالث کی شخصیت میں چاہے کتنی ہی اکھڑاہٹ کیوں نہ ہو، وہ عالیہ کی کال کبھی نظرانداز نہیں کرتا تھا۔

"ہیلو؟" اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے گہری سانس لی۔

" کہاں ہو ثالث؟ میں کب سے پارکنگ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" عالیہ کی آواز میں تھوڑی بے چینی اور بہت زیادہ لاڈ تھا۔

"بس ابھی فارغ ہوا ہوں، کٹ پیک کر رہا ہوں۔" ثالث دھیرے سے نے جواب دیا۔

"جلدی آؤ! میرا رزلٹ ہے اور تمہیں پتا ہے تمہارے بغیر میرا بی پی لو ہونے لگتا ہے۔ مُجھے تمہارا ساتھ چاہیے، بس فوراً پہنچو پارکنگ میں۔"

"لیکن میری حالت؟ عالیہ میرے ماتھے پر پٹی ہے، پسینے میں شرابور ہوں۔" اس نے اپنی اکھڑی ہوئی پٹی کو چھوتے ہوئے کہا۔ وہ فی الوقت گھر جانا چاہتا تھا۔

"ثالث! تم ایسے ہی رگڈ (Rugged) لک میں اچھے لگتے ہو۔ اب بحث مت کرو اور جلدی آؤ، ہمیں کالج پہنچنا ہے۔"

فون بند ہوا تو ثالث نے ایک لمبی آہ بھری۔ اس نے اپنی کٹ بیگ میں ڈالی اور بوجھل قدموں سے پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ پارکنگ لاٹ میں اس وقت گاڑیوں کا رش کم ہو رہا تھا۔ جیسے ہی ثالث اندر داخل ہوا، اس کی نظریں خود بخود بائیک اسٹینڈ کی طرف گئیں۔ وہاں نامرہ کھڑی اپنی سکوٹی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنا نیلا ٹریک سوٹ تبدیل کر لیا تھا اور اب وہی صبح والی جینز اور شرٹ میں تھی۔ سلال کی وہ اوورسائز ڈ جیکٹ اب اس کے بیگ میں ٹھنسی ہوئی تھی اور اس کے بکھرے ہوئے بال ہیلمٹ پہننے کی وجہ سے ماتھے پر آ رہے تھے۔ وہ تھکی ہوئی تھی اسے بھی جلد گھر پہنچنا تھا اور پہنچتے ہی بستر پر گر جانا تھا۔ بس بہت ہوگئی پھرتی... اسے اب سست نامرہ بننا تھا۔

عالیہ نے نامرہ کو دیکھ کرنا گواری سے لب بھینچے۔گاڑی کی ڈگی شاپنگ بیگز سے بھر چکی تھی۔کافی حد تک اسکا ذہن پرسکون تھا مگر نامرہ کو دیکھ کر وہ سکون غارت ہوا محسوس ہوا۔ثالث گاڑی کی طرف آنے کے بجائے سیدھا نامرہ کی طرف مڑ گیا۔نامرہ نے جیسے ہی ثالث کو قریب آتے دیکھا اس کے چہرے پر صبح والی وہی بیزاری لوٹ آئی۔اس نے ایک ہاتھ سے ہیلمٹ کا اسٹریپ درست کیا اور سرد نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب کیا ہوا؟ کوئی نئی ہڈی تڑوالی یا پٹی کھل گئی؟"اس کا لہجہ کسی تیز دھار نشتر کی طرح تھا۔

ثالث اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا مگر اسے نامرہ سے کے وجود سے ٹکرا کر آنے والی ہوا میں ہلکی سی شیمپو اور تازگی کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔اس نے ماتھے کی پٹی کی طرف اشارہ کیا جواب لٹک رہی تھی۔

"پٹی...اکھڑ گئی ہے۔"

نامرہ نے ایک گہری سانس لی جیسے اپنی چڑچڑاہٹ پر قابو پا رہی ہو۔

"دیکھو ثالث! میری ڈیوٹی آج ری ہیب میں تھی۔میں تمہاری پرسنل نرس نہیں ہوں۔صبح جو پٹی باندھی تھی وہ گراؤنڈ تک کے لیے کافی تھی۔ اب اپنے باپ دادا کے ہسپتال جاؤ اور اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔مہربانی کر کے دوبارہ یہ تماشہ مت کرنا۔"

اس نے ایک بار بھی نہ عالیہ کی گاڑی کی طرف دیکھا اور نہ ثالث کی آنکھوں میں ٹھہری اس پُر اسرار التجا کو اہمیت دی۔سکوٹی کو کِک ماری، ہیلمٹ کا شیشہ نیچے کیا اور زن سے پارکنگ سے باہر نکل گئی، پیچھے اپنی بے نیازی کی خوشبو چھوڑ گئی۔ثالث وہیں کھڑا اسے دور جاتے دیکھتا رہا جیسے اس کی روح کا کوئی حصہ اس سکوٹی کے ساتھ ہی چلا گیا ہو۔گاڑی سے اچانک ہارن ابھرا تو وہ جیسے ٹرانس سے باہر نکلا۔ایک گہری سانس لی اور عالیہ کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔جیسے ہی وہ پچھلی سیٹ پر عالیہ کے پاس بیٹھا، عالیہ نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔پہلے تو وہ اس کے زخموں کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"

"بتایا تو تھا۔ٹرف برن ہوا ہے۔"وہ کوفت سے بولا۔عالیہ کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"ثالث! آخر تم ان لوگوں سے دور کیوں نہیں رہتے؟"

"اور آخر تم ان دونوں بہن بھائیوں سے اتنا چڑتی کیوں ہو؟"ثالث نے تھکن سے آنکھیں موند لیں۔سیٹ سے پشت ٹکا کی۔

"مُجھے یہ دونوں زہر لگتے ہیں۔سلال ہو یا یہ نامرہ...دونوں میں رعونیت کی انتہا ہے۔ان کی اوقات کیا ہے ہمارے سامنے؟ ثالث تم ان سے کئی درجے اوپر ہو، تم بزدار ہو۔ان سے دور رہا کرو خاص طور پر اس لڑکی سے، یہ تمہارے لائق نہیں ہے۔"

عالیہ کی باتوں میں چھپی انا اور حسد کی بو ثالث کو ناگوار گزری۔وہ جانتا تھا کہ نامرہ رعونی نہیں تھی۔اسے ثالث نے اسے اس قدر تنگ کیا تھا کہ وہ اب اس سے خار کھانے لگی تھی۔اگر عالیہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ثالث شاید اسے بزداروں والے لہجے میں ہی جواب دیتا مگر عالیہ تو اس کی بہن تھی اور اس کی کمزوری بھی۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس ایک بار پھر سر جھٹک کر اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔باہر تیزی سے

پیچھے جاتے درختوں کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں اب بھی نامرہ کا وہ سرد لہجہ گونج رہا تھا۔

"مہربانی کر کے دوبارہ یہ تماشہ مت کرنا..."

گاڑی آگے بڑھ گئی مگر ثالث کا دل وہیں اس پارکنگ میں بھٹک رہا تھا جہاں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک سکوٹی گزری تھی۔

☆☆☆☆☆

بزدار میڈیکل کالج کا سیمینار ہال اجنبیوں کے لیے محض ایک عالیشان عمارت ہو سکتی تھی مگر وہاں زیرِ تعلیم طلبہ کے لیے یہ کسی میدانِ کارزار سے کم نہ تھا۔ میڈیکل کے آخری دو سالوں کے نتائج کا یہاں باقاعدہ اعلان ایک ایسی روایت تھی جو کمزور دل والوں کے لیے نہیں بنی تھی۔ ہال کے باہر چہل پہل عروج پر تھی مگر واش روم ایریا کی سفید ٹائلوں والی راہداری میں ایک عجیب سی پراسرار خاموشی تھی۔ اسٹوڈنٹس تیار ہو کر باہر نکل چکے تھے اب وہاں صرف نفوس باقی تھے۔ سلال شیشے کے سامنے کھڑا اپنے لرزتے ہاتھوں سے سفید شرٹ کے بٹن بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے تک یہی سلال سڑکوں پر ایک جوشیلے ہجوم کے بیچ چہرے پر نقاب سجائے، بلند آواز میں فلسطین کے حق میں نعرے بلند کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے لہجے میں جو گھن گرج تھی وہ اب کہیں دب سی گئی تھی۔ اسکا دن والا حلیہ یکسر بدل چکا تھا اور اب وہ سفید کوٹ پہن کر اپنے بکھرے بالوں کو درست کر رہا تھا۔ اس کا دوست ماحد جو دیوار سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا اب مزید خاموش نہ رہ سکا۔

"کئی گھنٹے فلسطین کے حق میں بولتے وقت تمہارے ہاتھ ایک بار بھی نہیں کانپے۔ اب کیوں یہ حالت ہو رہی ہے؟" ماحد نے طنزیہ مگر فکرمند لہجے میں پوچھا۔ اسے سلال کا یوں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ہنگامی اجلاسوں اور احتجاجوں کا حصہ بننا کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ سلال نے ایک گہری سانس لی اور اپنی انگلیوں کی مدد سے ماتھے پر آتے بالوں کو پیچھے کیا۔ اس کی نظریں شیشے میں نظر آتے اپنے ہی وجود پر جمی تھیں۔

"سمجھا کرو ماحد... آپی آ رہی ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا مگر اس ایک جملے میں نیمل کا وہ رعب چھپا تھا جو سلال کے لیے کسی بھی احتجاجی پولیس سے زیادہ بھاری تھا۔

ماحد نے سر جھٹکا۔ "اگر اتنا ہی ڈر رہے تو جاتے کیوں ہو؟"

سلال کی انگلیاں ایک لمحے کو رکیں۔ اس نے شیشے میں اپنے پیچھے کھڑے ماحد کا عکس دیکھا۔

"ڈر اس لیے ہے کہ آپی نے منع کیا ہے اور جاتا اس لیے ہوں کیونکہ میں مجاہد ہوں۔"

ماحد نے آگے بڑھ کر سلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"تو میرے بھائی! اگر اتنے ہی بڑے مجاہد ہو تو فلسطین جاؤ، یہاں میڈیکل کالج کے واش روم میں کھڑے ہو کر بال سیٹ کرتے ہوئے یہ باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

سلال کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے اپنا سفید کوٹ درست کیا اور ماحد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ بھوری چمکتی

ہوئی فلسطینی آنکھیں۔

"ماحد! ہر جنگ سرحدوں پر نہیں لڑی جاتی۔ کچھ جنگیں شعور کی ہوتی ہیں۔ میں یہاں ڈاکٹر بن رہا ہوں تا کہ کل کو ان زخموں کو مرہم لگا سکوں جن کا آج میں ذکر کر رہا ہوں۔ لیکن اگر آج میں اپنی زبان کا حق ادا نہ کر سکا تو کل میرے ہاتھوں کی مسیحائی بھی کسی کام کی نہیں رہے گی۔"

اس نے آخری بار شیشے میں خود کو دیکھا۔ سختی سے بندھے نقاب کے نشانات جو چہرے پر تھوڑے سے واضح تھے انہیں پانی سے ہلکا کیا اور ایک گہری سانس بھر کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"چلو اب... رزلٹ کا وقت ہو گیا ہے۔"

دونوں واش روم سے باہر نکل آئے۔ سیمینار ہال کی راہداریوں میں طلبہ کا رش بڑھ رہا تھا مگر سلال کے قدموں میں وہ تیزی نہیں تھی جو ایک ٹاپ اسٹوڈنٹ کے رزلٹ سے پہلے ہونی چاہیے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ماحد کی کسی بات کا جواب دینے کے لیے رکا ہی تھا کہ اچانک فضا میں ایک جانی پہچانی آواز ابھری... کلک! یہ کسی اسمارٹ فون کے شٹر کی آواز تھی۔ سلال ایک جھٹکے سے پلٹا۔ اس کے عقب میں چند گز کے فاصلے پر لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ کھڑا تھا جو سلال کے اچانک مڑنے پر بوکھلا کر ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ سلال کے ماتھے پر غصے کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ لائبریری میں پڑھتے ہوئے، کیفے ٹیریا میں بیٹھتے ہوئے یا گراؤنڈ میں چلتے ہوئے۔ کوئی نہ کوئی خاموشی سے اس کی تصویریں قید کر رہا تھا۔ اس نے ماحد کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور نہایت باوقار مگر تیکھے قدموں سے ان لڑکیوں کی جانب بڑھا۔ اس کا سفید کوٹ اس کی قامت کے ساتھ لہرایا۔

"ایکسکیوزمی!" اس نے گروہ کے سامنے رک کر نہایت نپے تلے اور تمیز دار لہجے میں بات شروع کی۔ "آپ میں سے جو صاحبہ ابھی میری تصویر کشی فرما رہی تھیں، کیا میں ان سے اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

لڑکیوں میں ایک لمحے کو خاموشی چھائی۔ وہ سب خود پر قابو پانے کی کوشش میں تھیں۔ یہ میڈیکل کے پہلے سال کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا سلال انہیں پکڑ لے گا۔ خاموشی کا وقفہ ٹوٹا اور ان میں سے ایک لڑکی جس نے ہاتھ میں فون پکڑا ہوا تھا، تھوڑی تلملا کر سامنے آئی۔

"دیکھیں مسٹر سلال! آپ کوئی سلیبریٹی نہیں ہیں کہ ہم آپ کی تصویریں بنائیں۔ ہم تو بس ہال کا ویو لے رہے تھے۔ اتنی خود پسندی اچھی نہیں ہوتی۔"

سلال کے لبوں پر ایک سرد مسکراہٹ آئی۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر سر اٹھایا۔

"دیکھیں محترمہ! خود پسندی کا تو پتا نہیں مگر اپنی پرائیویسی کا علم مجھے بخوبی ہے۔ آپ کی گیلری میں میری پچھلے ایک ہفتے کی جو تصویری تاریخ جمع ہو رہی ہے وہ قانونی طور پر ہراساں کرنے کے زمرے میں آتی ہے۔ اور ایک معزز شہری ہونے کے ناطے میں آپ پر ہتکِ عزت اور پرائیویسی کی خلاف ورزی کا کیس کر سکتا ہوں کیونکہ مردوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں، جن کا دفاع کرنا میں جانتا ہوں۔"

اسکی اتنی لمبی چوڑی اور اردو میں کی گئی بات ان لڑکیوں کو کیا خاک سمجھ آنی تھی البتہ
لفظ کیس سنتے ہی اس لڑکی کا چہرہ غصے اور شرمندگی سے سرخ پڑ گیا۔اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتی یا اپنی صفائی میں کچھ کہتی۔سلال کے عقب سے آواز ابھری۔

"سلال...!"

وہ بغیر پلٹے بھی یہ آواز پہچان سکتا تھا۔یہ آواز کسی بھی عدالت کے جج کے ہتھوڑے سے زیادہ وزن رکھتی تھی۔سلال دھیرے سے پلٹا۔
سامنے ماحد کھڑا تھا،جس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔اس کے برابر میں نیمل شبگیر کالا کوٹ پہنے، سینے پر بازو باندھے تیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

نیمل نے ایک نظر ان لڑکیوں پر ڈالی جواب وہاں سے کھسکنے کی تیاری میں تھیں اور پھر تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے سلال کو دیکھا۔چاچو بات بات پر بندے کو چولہے میں بھیجنے سے نہیں کتراتا تھا اور یہ بھتیجا بات بات پر کیس کرنے کی دھمکی دیتا تھا۔سلال کی تمام تر مجاہدانہ سختی ایک پل میں کافور ہوگئی۔اس نے ایک نظر ماحد کو دیکھا جس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی اور پھر نظریں جھکا کر نیمل کے قریب آ گیا۔البتہ آنے سے پہلے وہ لڑکیوں پر ایک تنبیہہ نظر ڈال آیا تھا۔

"وہ...دراصل یہ میری تصویریں بنا رہی تھیں..."اس نے کان کھجاتے ہوئے معصومیت سے صفائی دینی چاہی۔

نیمل نے اس کے ماتھے پر موجود نقاب کے ہلکے سے نشان کو بغور دیکھا پھر اس کا کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"تصویریں بنانے والوں سے نہیں سلال،تصویریں خراب کرنے والوں سے ڈرنا چاہیے۔
چلو چلتے ہیں رزلٹ شروع ہونے والا ہے۔تمہارے کیسز کا فیصلہ میں بعد میں ہوگا۔"

نیمل آگے بڑھی تو سلال خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا جبکہ ماحد نے سلال کی جانب جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کیوں بھئی مجاہد صاحب! کیس فائل کروں یا ابھی تھوڑا انتظار ہے؟"

سلال نے اسے گھور کر دیکھا مگر دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا۔وہ اسٹوڈنٹس نئی تھیں ورنہ پورا کالج جانتا تھا کہ سلال شبگیر اپنے مردانہ حقوق سے کس قدر واقف تھا اور کیس کی دھمکی دینا تو اسکا پرانا مشغلہ بن چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

سیمینار ہال کے بلند و بالا دروازے ابھی پوری طرح کھلے نہیں تھے کہ فضا میں ایک غیر مرئی تناؤ کی لہر دوڑ گئی۔نیمل،سلال اور ماحد کے ساتھ نپے تلے قدموں سے ہال کی جانب بڑھ رہی تھی جب دوسری سمت سے قدموں کی ایک باوقار چاپ سنائی دی۔پروفیسرز اور سینئر ڈاکٹرز کے جھرمٹ میں حق بزدار چلا آ رہا تھا۔سیاہ پینٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ڈریس شرٹ،جس کی آستینیں کلائیوں پر نفاست سے بند تھیں اور ماتھے پر سیٹ کیے ہوئے بال اس کی شخصیت کو ایک جادوئی رعب دے رہے تھے۔اسکی آنکھیں اس کی شرٹ کے ہم رنگ لگ رہی

تھیں۔وہ جو بھی نیلا رنگ پہنتا تھا چاہے گہرا یا ہلکا،اس کی آنکھیں ویسی لگنے لگتی تھیں۔ہال کے دہانے پر پہنچتے ہی اس کے قدم اچانک منجمد ہو گئے۔

سامنے سے نیمل آرہی تھی۔اس کے ایک جانب سلال تھا تو دوسری جانب ماحد...کالا کوٹ پہنے،سر اٹھائے،وہ مضبوط اور بے نیاز لگ رہی تھی۔پل بھر کے لیے نیمل کی نظریں حق کی نیلی آنکھوں سے ٹکرائیں۔وہ آنکھیں جو آج بھی سمندر کی طرح گہری اور پراسرار تھیں۔حق کی نظروں میں شناسائی کے کئی رنگ ابھرے،ایک لمحے کو جیسے وقت پیچھے کی سمت مڑا مگر اس کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگی رہی۔اس کے اچانک رکنے پر ہمراہ موجود ڈاکٹرز بھی ٹھٹک گئے مگر نیمل نے شناسائی کا کوئی تاثر دیے بغیر،سلال اور ماحد کے ساتھ ہال کے اندر قدم بڑھا دیے۔ وہ تینوں اس کے قریب سے اجنبیوں کی طرح گزر گئے۔

حق پل بھر کو وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔اس کے چہرے کی سفیدی پر اب ایک عجیب سی زردی چھا گئی تھی۔باقی ڈاکٹرز کے اندر داخل ہونے پر وہ کسی خیال سے جاگا تو سر جھٹک کر اندر قدم بڑھا دیئے۔تھوڑی دیر بعد،شیشے کے گنبد والا عالیشان سیمینار ہال روشنیوں میں نہا رہا تھا۔طلبا کی سرگوشیاں ہال کی وسعت میں گم ہو رہی تھیں۔اسٹیج پر موجود مہمانِ خصوصی کی نشستوں میں سے ایک پر ڈاکٹر حق بزدار براجمان تھا مگر اس کا ذہن وہاں موجود نہ تھا۔اس کی نظریں لاشعوری طور پر دوسری قطار میں بیٹھی اس لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں جس پر کالا کوٹ کسی وردی کی طرح جچ رہا تھا۔

صاف رنگت اور چھوٹی آنکھوں والی نیمل شبگیر ...جو اب حق بزدار کے لیے اجنبی بن چکی تھی۔کئی لمحے وہ خاموشی سے بیٹھا رہا پھر اس نے نامحسوس انداز میں اپنی جیب سے فون نکالا۔اسکرین روشن ہوئی تو وال پیپر پر سوئمنگ پول میں کامل کے ساتھ ہنستی ہوئی تصویر نظر آئی مگر حق کی انگلیاں وہاں نہ رکیں۔اس کی گلابی مائل پوریں اسکرین پر تیزی سے پھسلیں اور ایک خفیہ فولڈر پر جا کر ٹھہریں۔سیمینار ہال میں اب مائیک تھامے کھڑے ایک پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی مگر حق کا ذہن وہاں نہیں تھا۔فولڈر کھلا تو تصویروں کا ایک ڈھیر سامنے تھا۔اس نے اسکرول کیا اور پھر ایک ویڈیو پر اس کا انگوٹھا رک گیا۔ویڈیو پلے ہوئی تو ایک سولہ سالہ لڑکی اسکرین پر نمودار ہوئی۔سیاہ بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے،چہرے پر معصومیت اور آنکھوں میں وہ مخصوص چمک جو صرف خواب کو حقیقت میں بدلنے والوں کے پاس ہوتی ہے۔وہ ایک بڑا سا باکس تھامے کیمرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

Birthday Happy Henry!

وہ مسکرا کر بولی اور پھر قدم آگے بڑھائے۔کیمرہ باکس کے قریب ہوا تو اندر ایک خوبصورت کیک تھا جس پر کریم سے ایک اسٹیتھوسکوپ بنا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایک ہاتھ سے بنایا گیا برتھ ڈے کارڈ رکھا تھا۔ویڈیو میں حق کی اپنی آواز سنائی دی جواب دس سال بعد اسے کسی پرانی یادگار کی طرح لگ رہی تھی۔

"میرا نام حق ہے نیمل!تم مُجھے ہینری کیوں کہتی ہو؟"

" کیونکہ آپ کی آنکھیں Henry Cavill جیسی نیلی ہیں اور فیس کٹ بھی ملتا ہے۔"

" تمہیں ہینری کیول پسند ہے؟" وہ اب اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

"مُجھے بچپن میں سپرمین بہت پسند تھا۔" وہ پر اعتمادسی اب کارڈ کھولے دکھا رہی تھی۔ اسکے بچپن کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"تم ابھی بھی بچی ہی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے اب اس کارڈ کو ریکارڈ کر رہا تھا۔

"ایک دن میں بڑی ہو جاؤں گی۔"

" کیا تم تب بھی میرے لیے کیک لایا کرو گی؟" نیلی آنکھوں میں سوال ابھرا تو چھوٹی آنکھوں والی لڑکی نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ اب کیمرہ میں واضح تھا۔

" کون جانے؟ اگر آپ ہمیشہ ایسے ہی رہے تو ضرور..." وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"تم میری سالگرہ کے دن مُجھے کچھ نصیحت کرنا چاہو گی؟" وہ بہت کم بولتا تھا البتہ نیمل کے ساتھ سب سے زیادہ بول لیتا تھا۔

"ہمیشہ حق پر رہیے گا۔" الفاظ کم تھے مگر اثر بہت گہرا تھا۔

حق کے لبوں پر بھی ایک تلخ اور اداس مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ ہینری جسے وہ لڑکی اپنا دوست مانتی تھی، اب اس کی نظروں میں ایک مجرم سے کم نہ تھا۔ ویڈیو میں وہ لڑکی کتنی بے فکری سے ہنس رہی تھی اسے معلوم ہی نہ تھا کہ وقت کی گرد اس کے ان خوابوں کو کیسے دھندلا دے گی۔

ویڈیو ختم ہو گئی۔ حق نے سر اٹھا کر سامنے ہال میں بیٹھی نیمل کو دیکھا۔ فون کی اسکرین والی لڑکی اور سامنے بیٹھی اس ڈیفنس لائر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ معصومیت مر چکی تھی، وہ ہینری کا خطاب کہیں گم ہو چکا تھا اور اب صرف ایک سرد جنگ باقی تھی۔ حق کا دم گھٹنے لگا۔ ہال کی تپش اب اسے چبھ رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ پہلو بدلا اور فون کی اسکرین آف کر دی۔ اسٹیج پر ایک ڈاکٹر کی تقریر اب بھی جاری تھی مگر حق کے کانوں میں اب بھی وہی ایک جملہ گونج رہا تھا۔

"ہمیشہ حق پر رہیے گا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ اس سچائی سے بھاگنا چاہتا ہو جو اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

سیمینار ہال میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ ہال کے دائیں جانب نیمل، سلال اور ماحد اپنی نشستوں پر ساکت تھے جبکہ بائیں جانب بزدار خاندان کا وقار بنے عالیہ اور ثالث بیٹھے تھے۔ دونوں جانب جیت کا یقین بھی تھا اور ایک انجانا خوف بھی۔ عالیہ کے چہرے پر وہ مخصوص اعتماد تھا جو نسل در نسل بزداروں کا خاصہ رہا تھا جبکہ سلال کی نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر اس کے سینے میں دل کی دھڑکن ہال میں لگی گھڑی کی ٹک ٹک سے زیادہ تیز تھی۔ وائس چانسلر اور شعبہ امتحانات کے ہیڈ اسٹیج پر آئے۔ مائیک آن ہوا تو ہال میں موجود سینکڑوں میڈیکل اسٹوڈنٹس کے دلوں کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ یہ صرف ایک سال کا نہیں بلکہ یونیورسٹی کے سالانہ نتائج کا وہ اہم ترین دن تھا جس میں آخری سال کے پوزیشن ہولڈرز کو میڈلز دیے جانے تھے۔

"ڈیئر اسٹوڈنٹس! وہ گھڑی آ گئی ہے جس کا پورے میڈیکل کالج کو انتظار تھا۔ یہ صرف ایک کلاس کی نہیں بلکہ ہمارے پانچوں سالوں کے ان درخشندہ ستاروں کی فہرست ہے جنہوں نے اپنی محنت کا لوہا منوایا۔" پروفیسر نے گہری سانس لیتے ہوئے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ اسٹیج کے پیچھے لگی بڑی ڈیجیٹل اسکرین روشن ہوئی۔ ناموں کی فہرست سال بہ سال اوپر نیچے ہو رہی تھی اور طلبا کے سانس جیسے حلق میں اٹک گئے تھے۔

"سب سے پہلے... فرسٹ ایئر MBBS کا رزلٹ۔" پروفیسر کی آواز گونجی۔ اسکرین پر نام چمکے۔ پھر سیکنڈ ایئر اور تھرڈ ایئر کی باری آئی۔ اسکرین تیزی سے بدلی۔ ہر سال کی پوزیشنز سامنے آ رہی تھیں، ہال کا درجہ حرارت اور ہیجان بڑھ رہا تھا مگر سب کی نظریں چوتھے اور آخری سال پر ٹکی ہوئی تھیں جہاں اصل جنگ تھی۔

ان کے اشارے پر اسٹیج کے پیچھے لگی بڑی ڈیجیٹل اسکرین روشن ہوئی۔ ناموں کی فہرست اوپر نیچے ہو رہی تھی اور طلبا کے سانس جیسے حلق میں اٹک گئے تھے۔ چند لمحوں کے ہیجان کے بعد الفاظ ایک جگہ ٹھہر گئے اور ہال کے گنبد سے ٹکراتی ہوئی ایک آواز گونجی۔

پہلی پوزیشن: سلال شبگیر

دوسری پوزیشن: عالیہ بزدار

ایک لمحے کے لیے جیسے کائنات تھم گئی۔ سلال کے چہرے پر حیرت کے سائے لہرائے، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے بزداروں کے گڑھ میں رہ کر ایک بار پھر پہلی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ دوسری طرف عالیہ کا چہرہ کسی سفید کاغذ کی طرح بے رنگ ہو گیا۔ اسے لگا جیسے اس کے وجود سے روح کھینچ لی گئی ہو۔ وہ ایک بار پھر ایک شبگیر سے ہار گئی تھی؟

ہال میں دھیمی تالیوں کی گونج سنائی دی جو سلال کی محنت کا اعتراف تھیں۔ سلال نے بے ساختہ برابر میں بیٹھی نیمل کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں اور چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تو نیمل نے اس کے ہاتھ پر مضبوط گرفت کی جبکہ عالیہ کو اپنی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ہال میں موجود ہر آنکھ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ ثالث نے فوراً عالیہ کے لرزتے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا اور پانی کی بوتل کھول کر اس کی طرف بڑھائی۔

"عالیہ! خود کو سنبھالو، سب دیکھ رہے ہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں اسے حوصلہ دیا۔

عالیہ نے پانی کا ایک گھونٹ بھرا تو جیسے اسے ہوش آیا۔ وہ اب بھی اسکرین کو گھور رہی تھی جہاں اس کا نام دوسرے نمبر پر تھا۔ ایک ایسا نمبر جو بزداروں کی لغت میں شکست کے مترادف تھا۔ اس نے زبردستی اپنے لبوں پر ایک بے جان مسکراہٹ سجائی مگر اس کی آنکھوں کی آگ بتا رہی تھی کہ یہ ہار وہ کبھی نہیں بھولے گی۔ پانی کے چند گھونٹ بلا اس کے اندر جلتی آگ کو کیسے بجھا سکتے تھے؟

مگر تقریب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر نے مائیک پر دوبارہ گرفت مضبوط کی۔ اب ان کا لہجہ اور بھی زیادہ گمبھیر اور باوقار ہو گیا تھا۔

"اور اب... ہماری اس تقریب کا سب سے خاص، سب سے معتبر اور آخری رزلٹ۔ وہ کلاس جو اب اس کالج سے رخصت ہو کر باقاعدہ ڈاکٹر بن چکی ہے۔ فائنل ایئر (Final Year MBBS) کے گولڈ میڈلسٹ کا اعلان!"

ہال میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ فائنل ایئر کا رزلٹ کسی بھی میڈیکل یونیورسٹی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد اسٹوڈنٹ کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر کا لاحقہ اور بیسٹ گریجویٹ کا تاج سج جاتا ہے۔ اسکرین پر فائنل ایئر کے نمبرز تیزی سے اسکرول ہوئے اور پھر ایک شاندار اینیمیشن کے ساتھ گولڈ میڈل کے نیچے نام نمودار ہوا۔ تقریب جاری رہی۔ تقریروں کے ساتھ کامیابیوں کی بھی صدائیں گونجیں۔ ڈاکٹرز اور پروفیسرز نے حوصلہ بڑھایا۔ پھر مہمانِ خصوصی کی نشست سے حق اٹھا اور نہایت وقار کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر پہلے والا حق بزدار کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے مائیک تھاما اور اس کی گہری بھاری آواز ہال میں گونجی۔

"جیتنے والوں کو مبارکباد! آپ سب نے ثابت کیا کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔" اس کا لہجہ بالکل پروفیشنل تھا، جیسے اسے اپنی کزن کے دوسرے نمبر پر آنے سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

"بزدار فارماسیوٹیکل یعنی ہمارا ادارہ ہمیشہ سے اس بات کا حامی رہا ہے کہ میڈیسن کی دنیا میں تحقیق اور ایجادات ہی اصل کامیابی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسٹوڈنٹس صرف علاج تک محدود نہ رہیں بلکہ دوائیں بنانے کے عمل میں بھی آگے آئیں تاکہ ہم دنیا کو بتا سکیں کہ پاکستان اس فیلڈ میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔"

وہ وہاں بزدار فارما کی طرف سے آیا تھا۔ ہر سال وہاں سے کوئی نہ کوئی آتا تھا تاکہ اسٹوڈنٹس کو میڈیسن کے شعبے کی اہمیت بھی بتائی جائے۔ وہ ان کی ذہن سازی کرنے آتے تھے۔ انہیں فارما کا دورہ کرواتے تھے تاکہ ان کی دلچسپی برقرار رہے۔ انہیں نئے مواقع دیتے تھے۔ حق کی تقریر کے ساتھ ہی سیمینار کے اختتام کا اعلان ہوا۔ ہال میں شور بڑھ گیا۔ جو لوگ سلال کے دوست تھے وہ اسے مبارکباد دینے کے لیے دوڑے جبکہ باقی عالیہ کو تسلی دینے کے لیے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ حق اپنے پروٹوکول اور ڈاکٹروں کے ہجوم کے ہمراہ ہال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ ہال سے باہر نکلا تو پہلی بار نیمل کی شاکی اور گہری نگاہوں نے اس کے جاتے ہوئے وجود کو دیکھا۔ ایک پرانی یاد نے دستک دی مگر اس نے فوراً اپنا سر جھٹک دیا۔ وہ جانتی تھی کہ ماضی پیچھا نہیں چھوڑتا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب وہ سولہ سال کی معصوم لڑکی نہیں رہی جو ہینزی کی آنکھوں پر بھروسہ کرتی تھی۔

☆☆☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ بزدار پیلس کے بائیں حصے میں جہاں امجد بزدار کی دوسری فیملی رہائش پذیر تھی، فضا میں فضائی معطر اور مہنگے

پرفیومز کا ایک عجیب سا امتزاج بسا ہوا تھا۔نجف ہسپتال کی طویل ڈیوٹی کے بعد نیند پوری کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی نیچے لاؤنج میں آئی تھی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔تن پر سادہ سا سوتی جوڑا پہنے، بالوں کا ایک ڈھیلا سا جوڑا گردن کے پیچھے جھول رہا تھا۔اس کے چہرے کی زردی اور آنکھوں کے گرد ہلکے سائے اس کی تھکن کا پتہ دے رہے تھے مگر اس کی انگلیاں وقفے وقفے سے ایک کیس فائل کے صفحات پلٹ رہی تھیں۔اسی لمحے صدر دروازہ کھلا اور نیلوفر بیگم نشاط کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔نیلوفر بیگم جن کی آواز نے کبھی محفلوں میں جادو جگایا تھا آج بھی اپنی پرکشش شخصیت کو برقرار رکھے ہوئے تھیں۔انہوں نے جامنی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی، گلے میں موتیوں کا بیش قیمت سیٹ اور چہرے پر میک اپ کی ایسی تہیں تھیں کہ عمر کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔امجد بزدار کی دوسری بیوی بننے کا فیصلہ ان کے لیے محض ایک سمجھوتہ نہیں بلکہ ایک کامیاب بزنس ڈیل ثابت ہوا تھا۔ان کے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی وہاں صفائی کا کام کرتے ملازمین ان کے اشارے پہ ادھر ادھر نکل گئے۔

"تم گھر کب آئیں نجف؟" نیلوفر بیگم نے اپنا ہینڈ بیگ میز پر رکھتے ہوئے ایک اڑتی ہوئی نظر نجف پہ ڈالی۔

"صبح دس بجے لوٹ آئی تھی۔آپ تب غالباً سو رہی تھیں۔" نجف نے نظریں فائل سے ہٹائے بغیر مختصر جواب دیا۔

نشاط جو اپنے مارننگ شو کی ریکارڈنگ سے لوٹی تھی اور ابھی تک پوری طرح آن کیمرہ موڈ میں لگ رہی تھی۔وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔اس نے بیٹھنا گوارا نہیں کیا۔بس ابرو کے اشارے سے ہی نیلوفر بیگم کو بات کرنے کا کہا۔جنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے بیٹھنے اور پرسکون رہنے کا کہا۔وہ خود نجف سے بات کرنے والی تھیں۔

"نجف! وہ اس لڑکی والی فائل...تم نے اب تک اس کے پیپرز پر سائن کیوں نہیں کیے؟ تم جانتی ہو نہ نشاط کے لئے اسے شو پہ بلانا کس قدر اہم ہے؟"

نجف نے خاموشی سے فائل بند کی اور نشاط کی بجائے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"مام! صبا ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ کیمروں کی روشنی اور نشاط کے چبھتے ہوئے سوالوں کا سامنا کر سکے۔اسے ابھی میڈیکل ٹریٹمنٹ اور آرام کی ضرورت ہے، پبلسٹی کی نہیں اور یہ بات میں کئی بار بتا چکی ہوں۔" بات کے آخر میں اس نے ایک کھولتی نظر نشاط پر ڈالی جو اپنا گھر چھوڑ کر اکثر یہاں پائی جاتی تھی۔اپنی عمر سے دس سال بڑے آدمی سے، اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود وہ خوش نہیں تھی۔ اسکے شکوے ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔

"نشاط اسے ایک پلیٹ فارم دے رہی ہے، اسے فنڈز ملیں گے، بزدار فاؤنڈیشن کا نام ہوگا اور تم ایک معمولی ڈاکٹر کی طرح رکاوٹ بن رہی ہو؟" نیلوفر بیگم کو اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ایک عام سی لڑکی ہی تو تھی؟ آخر نجف اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھی۔

"میں ڈاکٹر ہوں اور صبا میری مریضہ ہے۔میرا فرض اس کی صحت ہے، فاؤنڈیشن یا کسی مارننگ شو کی ریٹنگ نہیں۔" نجف نے بڑے اطمینان سے مگر دوٹوک لہجے میں کہا۔

جہاں نشاط کا چہرہ لال ہوا تھا وہیں نیلوفر بیگم کی تیوری چڑھی۔ وہ نجف کو کچھ اور سخت سست سنانے ہی والی تھیں کہ اچانک ان کی نظر نجف کے کانوں پر پڑی۔ وہاں ڈائمنڈز یا ایمرالڈ کے بجائے، سونے کے چھوٹے سے پرانے طرز کے ٹاپس چمک رہے تھے۔ نیلوفر بیگم کا چہرہ پل بھر میں بدلا، جیسے انہوں نے کسی بہت ہی بدصورت چیز کو دیکھ لیا ہو۔

"یہ کیا پہنا ہوا ہے تم نے؟" انہوں نے بے ساختہ کراہت سے پوچھا۔

نجف نے بے اختیار اپنے کانوں کو چھوا۔ "ٹاپس ہیں... سونے کے۔"

"مُجھے پتا ہے سونے کے ہیں۔ مگر اتنے پرانے اور معمولی؟" نیلوفر بیگم کی آواز میں تلخی بڑھ گئی۔ "میں نے تمہیں پچھلے مہینے ڈائمنڈ کے گفٹ کیے تھے وہ کیوں نہیں پہنے؟" صبا کا کیس کہیں بیچ میں رہ گیا۔ نیلوفر بیگم کو وہ ٹاپس جیسے بچھو کی طرح لڑے تھے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔

"مُجھے یہ پسند ہیں، اس لیے پہن لیے۔ سادہ ہیں اور ڈیوٹی کے دوران الجھتے نہیں..."

اس نے اٹھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ وہ اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتی تھی اور نشاط کی موجودگی میں زیادہ دیر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔

"پسند ہیں؟ نجف تمہاری پسند دن بدن گرتی جا رہی ہے۔" نیلوفر بیگم نے ہاتھ پھیلا کر اسے ٹوکا۔ نجف نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی فائل اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی خاموشی اور یہ لاتعلقی نشاط کے لیے کسی توہین سے کم نہیں تھی۔

جب وہ اوپر کمرے میں غائب ہوگئی تو نشاط نے غصے سے اپنا پرس صوفے پر پٹخا اور دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دیکھا ماں آپ نے؟ یہ لڑکی اب بالکل بدل گئی ہے۔ اس کا دل اب اس گھر میں نہیں لگتا۔ مُجھے تو لگتا ہے اس کا دماغ ہسپتال کے مریضوں کی طرح بیمار ہو چکا ہے۔"

نیلوفر بیگم نے گہری سانس لی اور اپنی مشابہہ بیٹی کو دیکھا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو نشاط! اس نے موت قریب سے دیکھی ہے۔"

"آپ کو آج بھی اس کی زیادہ پرواہ ہے؟" نشاط تڑخی۔ اس کی گردن کی نسیں ابھر آئیں۔ میک اپ کی کئی تہیں بھی اس کی ناگواریت کو چھپا نہیں پائی تھیں۔

"مُجھے تم دونوں کی پرواہ ہے۔ سمجھیں تم؟" اس سارے وقت میں انہوں نے پہلی بار پیچھے ہوتے نرم صوفے سے پشت ٹکائی۔ تین چار گھنٹے مسلسل ایکٹیو رہنے سے ان کی کمر اکڑ گئی تھی۔

"اگر آپ کو میری پرواہ ہوتی تو نجف اب تک مان چکی ہوتی۔" نشاط نے پھر سے طنز کسا۔ نیلوفر بیگم جو پہلے ہی کسی بات پر پریشان تھیں نشاط کی اس بات پر جھنجھلا اٹھیں۔

"تمہارا شوہر واپس کب آ رہا ہے؟" انہوں نے اپنی بے زاریت چھپاتے پوچھا۔ ملازمہ ٹرالی میں مشروبات کے گلاس اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں لے آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور ملازمہ تھی۔ نیلوفر بیگم نے ایک ابرو سے اشارہ کیا اور وہ لڑکی فوراً ان کی جانب بڑھی۔ وہ صوفے کے پیچھے ان کی پشت پر کھڑے ہوتے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں دبانا شروع ہو چکی تھی جبکہ دوسری ملازمہ نے مشروب کو گلاس ان

دونوں ماں بیٹی کے سامنے رکھا۔
"مجھے نہیں معلوم... جب آنا ہوا آ جائے گا۔" نشاط مشروب کا گلاس لبوں سے لگاتے بے نیازی سے بولی۔ اسے جس چیز میں سب سے کم دلچسپی تھی وہ اسکا شوہر تھا۔
"دھیان رکھا کرو، وہ شوہر ہے تمہارا... کل کو کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو پھر پچھتاؤ گی۔"
انہوں نے اپنے پیر نازک سینڈل سے نکالتے سامنے میز پر ٹکائے۔
"میں اس شخص کی پہلی نہیں دوسری بیوی ہوں۔ اس سے بڑی اونچ نیچ کیا ہو سکتی ہے؟" نشاط کی کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ یہ تو حقیقت تھی وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔

"تم نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی..." نیلوفر بیگم نے کس قدر چباتے ہوئے کہا۔ نگاہیں نشاط کے چہرے پر جمی تھیں۔

"ہاں اگر آپ نے مجھ پر شادی کا دباؤ نہیں ڈالا ہوتا۔" نشاط نے ہاتھ میں پکڑا مشروب کا گلاس ٹیبل پر پٹخ دیا۔ آواز گونج گئی۔
"اور اگر میں ایسا نہ کرتی تو تم بھی نجف کی طرح، اس سقراط کا روگ لیے اسی گھر میں بیٹھی رہتیں۔ کم از کم اب اپنے گھر کی تو ہو۔" انہوں نے کس قدر اطمینان سے کہا جبکہ سقراط کے نام پر نشاط کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا جن کا مزاج وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔
" کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ وہ.. سق... سقراط... آپ اسکا طعنہ دے رہی ہیں مجھے؟" نشاط کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ "اور تم جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ!" اس نے اگلی نظر نیلوفر بیگم کے کندھے دباتی ملازمہ پر ڈالی تو ملازمہ خاموشی سے بنا کچھ کہے وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر نشاط نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔
"مام...." اس کے لہجے میں اب تک بے یقینی تھی۔
"ماں ہوں.. تمہاری بھی اور نجف کی بھی! اچھے سے جانتی ہوں۔" نیلوفر نے مشروب کا اگلا گھونٹ لیتے جس سکون سے کہا تھا نشاط مزید راکھ ہوئی۔
"یقین نہیں ہوتا آپ... آپ...." وہ شدت جذبات سے بول نہیں پا رہی تھی۔ اپنا والٹ اٹھایا اور جھٹکے سے اٹھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی نیلوفر بیگم نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے کنپٹی کو مسلا۔ اب کم از کم چار دن نشاط اپنے گھر رہنے والی تھی۔ پر فی الوقت انکا مسئلہ نشاط نہیں نجف تھی۔ جانے وہ شادی کیوں نہیں کر رہی تھی؟ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

شبگیر ہاؤس کے صحن میں آج کی رات روشنیوں اور قہقہوں کا سیلاب اترا ہوا تھا۔
سلال میڈیکل کے چوتھے سال بھی فرسٹ پوزیشن لے کر آیا تھا۔ یہ صرف ایک طالب علم کی کامیابی نہیں تھی، یہ ان تمام طعنوں اور طبقہ وارانہ جنگوں کا جواب تھا جو بزداروں کے سامنے اکثر شبگیروں کو جھیلنی پڑتی تھیں۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا نا کہ میرا بیٹا اس سال بھی جھنڈے گاڑ دے گا۔" سرمد صاحب نے فخر سے سلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آج ان کی آواز میں رعب کم بلکہ ایک فاتح باپ کی ممتا جھلک رہی تھی۔
"جیت گئے...جیت گئے..." چغلی خان نے اپنے پنجرے سے باہر نکل کر سلال کے سر کے اوپر ایک چکر کاٹا اور سیدھا سرمد صاحب کے کندھے پر جا بیٹھا۔ دادی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ابھری۔ وہ جب سے سلال کی بلائیں لیے جا رہی تھیں۔
"چغلی خان! آج تم جو بولو گے، تمہیں وہی ملے گا۔" سلال نے ہنستے ہوئے طوطے کو بادام پیش کیا۔ تبھی زہرہ بیگم کچن سے ہاتھ پونچھتے نکل آئیں۔
"ماں..." سلال انہیں دیکھتے ہی بے اختیار انکی جانب بڑھا اور دونوں بازو ان کے گرد پھیلا کر ان کے سر پہ ٹھوڑی ٹکاتے آنکھیں موندھ لیں۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ زہرہ بیگم میں سلال کی جان تھی۔
"یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔" وہ ان کے سر پہ بوسہ دیتے بولا۔
"میرے بچے اللہ تمہیں مزید کامیاب کرے۔ یہ سب تمہاری محنت ہے۔" زہرہ بیگم اب دونوں ہاتھوں میں اسکا چہرہ تھامے، اسکا ماتھا چوم رہی تھیں۔
"ہاں بھئی ہمارا تو کوئی ہاتھ ہی نہیں ہے۔ ہم تو بس مفت میں یہاں پڑے رہتے ہیں۔" دادی کا شکوہ بجا تھا۔ وہ اپنی ماں سے الگ ہوتا واپس آ کر دادی سے دوبارہ لپٹ گیا۔
"ارے نہیں دادی! آپ کو دیکھے بنا تو میری صبح نہیں ہوتی۔"
"ہاں سب جانتی ہوں میں..." دادی اور اس کے شکوے شکایات چلتے رہتے تھے۔ نوفہ اور تارہ اس کے لیے ایک بیگ لائیں تھیں جس میں اس کے لیے شرٹس تھیں۔
"پلیز اسے نامرہ سے چھپا کر رکھیے گا۔" نوفہ نے اس کے کان میں جھکتے سرگوشی کی جبکہ تارہ ان سب کو اپنے کیمرہ میں ریکارڈ کر رہی تھی۔
سقراط جو اب تک خاموش بیٹھا سلال کی جیت کا یہ چھوٹا سا جشن دیکھ رہا تھا، آہستہ سے اٹھا اور سلال کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سلال کی آنکھوں میں دیکھا...وہ آنکھیں جو صبح جلوس میں انقلابی تھیں اور اب مستقبل کے ایک کامیاب ڈاکٹر کی طرح چمک رہی تھیں۔ سقراط نے جیب سے ایک قلم نکالا، جس پر سونے کا پانی چڑھا تھا اور اس کی نوک پر ایک چھوٹا سا (ہاکی گیند کی شکل میں) یاقوت جڑا تھا۔

"یہ ابا نے مُجھے تب دیا تھا جب میں نے اپنی پہلی ہا کی لیگ جیتی تھی۔ آج یہ تمہارا ہوا ڈاکٹر صاحب! کیونکہ تم نے صرف پوزیشن نہیں لی، تم نے ہمارا مان رکھا ہے۔"

سلال کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ اس نے قلم کو تھاما اور سقراط کے گلے لگ گیا۔ سرمد صاحب نے کچھ فاصلے سے اپنے بھائی اور بیٹے کو گلے ملتے دیکھا تو ان کے چہرے کی سختی بھی پگھل گئی۔ برسوں بعد اس گھر کی فضا میں وہ تلخی نہیں تھی جو سقراط کی واپسی پر محسوس ہوئی تھی۔ نیمل نے کچن سے، ایک بڑی سی ٹرے میں کھیر لاتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"چاچو اب جذباتی ہونا بند کریں اور اس پوزیشن ہولڈر کے حصے کی کھیر بھی مُجھے کھانے دیں۔"

"خبردار نیمل آپی! آج میرا دن ہے۔" سلال نے فوراً خود کو سنبھالا اور سقراط سے الگ ہوتے کھیر کی طرف پلٹ گیا۔ اسے نیمل کے ہاتھ کی کھیر پسند تھی اور آج تو نیمل نے یہ اہتمام خاص اسی کے لیے کیا تھا۔

"میری کھیر کدھر ہے؟" حسب معمول نامرہ سب سے آخر میں آئی تھی۔ وہ سستی کی دکان کبھی وقت پر نہیں اٹھ سکتی تھی۔

"جو سلال کو گفٹ دے گا کھیر صرف اسے ملے گی۔" نیمل نے اس پر گہری نظر ڈالی تو نامرہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ اس نے تو کوئی گفٹ لیا ہی نہیں تھا مگر اگلے ہی پل اس کی نظر شاپنگ بیگ پر پڑی تو اس نے فٹافٹ اٹھا لیا۔

"یہ ایک شرٹ میری..." ہمیشہ کی طرح اس کی نیت خراب ہوگئی۔

"ہرگز نہیں! یہ صرف میری ہیں۔" سلال وہ بیگ اس سے جھپٹ چکا تھا۔

"اللہ توبہ! اتنی گندی نیت؟ ایسی نیت والے افراد ڈاکٹر نہیں بن پاتے۔"

"نامرہ..." زہرہ بیگم نے اسے ایک گھوری سے نوازہ جبکہ باقی سب نے اس کی بات پر کوئی ردعمل نہیں دیا۔

"بھئی واہ! آج تو چغلی خان بھی خاموش ہوگیا؟" نیمل کو اس کی اتنی خاموشی کسی صورت نہیں بھائی۔ یہ سنتے ہی طوطے نے اپنی گردن ٹیڑھی کی اور سلال کی جانب دیکھتے بولا۔

"سلال... سلال... سلال..."

پورے گھر میں ایک بار پھر خوشیوں کی لہر دوڑ گئی، اور دور آسمان پر چمکتے ستارے جیسے گواہی دے رہے تھے کہ ابھی تو یہ شروعات ہے۔ آج کی رات سلال کے نام تھی۔

☆☆☆☆☆

شہر کے دوسرے حصے میں بزدار پیلس کی اوپری منزل پر واقع عالیہ کا کمرہ اس وقت کسی میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ فرش پر قیمتی کتابیں بکھری پڑی تھیں، بیڈ کی چادر سلوٹوں کا شکار تھی اور اسٹڈی ٹیبل پر رکھا لیمپ اوندھا گرا اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ عالیہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی ہانپ رہی تھی، اس کے بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں شکست کی وہ سرخی تھی جو خون کے آنسوؤں سے زیادہ

تکلیف دہ ہوتی ہے۔اس کے لیے یہ صرف ایک رزلٹ نہیں تھا، یہ اس کی انا کا جنازہ تھا جو سلال شبگیر نے پورے کالج کے سامنے نکالا تھا۔ وہ ایک اچار یے سے ہار گئی تھی۔وہ جس کے نام کے ساتھ بزدار کا لاحقہ لگتا تھا، آج پھر دوسرے نمبر پر کھڑی تھی۔کمرے کا دروازہ ایک دم کھلا اور منیبہ بزدار (عالیہ کی ماں) بزدار اندر داخل ہوئیں۔کمرے کی حالت دیکھ کر ان کی ابروئیں تن گئیں، مگر فوراً خود پر قابو پا لیا۔انہوں نے گہرے سنہری رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور ان کے چہرے پر وہی مخصوص جاہ و جلال تھا جو بزدار خاندان کی خواتین کا خاصہ تھا۔

"یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے تم نے عالیہ؟" منیبہ کی آواز ٹھنڈی اور سپاٹ تھی۔

"مام...میں ہار گئی...وہ لڑکا، وہ سلال شبگیر مجھ سے پھر آگے نکل گیا۔" عالیہ چلائی، اس کی آواز میں ہسٹیریا کی سی کیفیت تھی۔"پورے ہال میں اس کے نام کے نعرے لگ رہے تھے اور میں...میں صرف تالیاں بجانے کے لیے وہاں کھڑی تھی؟"

عالیہ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔اسکا وجود کپکپا رہا تھا۔منیبہ بزدار دو قدم آگے بڑھیں اور عالیہ کے دونوں کندھے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

"بس کرو عالیہ! اپنی یہ حالت دیکھو۔کیا تم چاہتی ہو کہ نیچے ڈائننگ ہال میں سب کو یہ پتا چل جائے کہ عالیہ بزدار ایک معمولی سے رزلٹ پر ٹوٹ گئی ہے؟" ان کے لہجے میں دہکتی ہوئی سی آنچ تھی۔

"لیکن..." عالیہ نے خالی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"کوئی لیکن نہیں!" انہوں نے عالیہ کو ڈپٹا۔"ہارنا اتنا برا نہیں ہے عالیہ، جتنا ہار کر اپنی کمزوری کا اشتہار دینا برا ہے۔سمجھ رہی ہو؟" انہوں نے پھر سے اس کے کندھوں کو جھنجھوڑا۔

"نیچے تمہارے داجی (امجد بزدار) اور پورا خاندان انتظار کر رہا ہے۔اگر تم اس حالت میں نیچے گئیں تو وہ سمجھیں گے کہ دشمن نے تمہیں شکست دے دی ہے۔کیا تم سلال کو یہ جتانا چاہتی ہو کہ اس نے تمہیں اس حال تک پہنچا دیا ہے؟"

عالیہ ساکت ہو گئی۔اس کی ماں کے الفاظ کسی تازیانے کی طرح اسے لگے تھے۔

"جاؤ، فوراً اپنا چہرہ دھوؤ۔میک اپ ٹھیک کرو اور وہ سیاہ سوٹ پہنو جو میں نے تمہارے لیے خاص بنوایا تھا۔"

منیبہ بزدار نے اسے آئینے کے سامنے دھکیلا۔

"تمہارے چہرے پر شکست کا ملال نہیں بلکہ وہ فاتحانہ مسکراہٹ ہونی چاہیے جو یہ ثابت کرے کہ یہ پوزیشن تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ہم بزدار ہیں عالیہ! ہم رزلٹ کارڈز کے محتاج نہیں، ہم اپنی حیثیت کے مالک ہیں۔"

عالیہ نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔اس کی آنکھوں کا مسکارہ پھیل چکا تھا مگر منیبہ بیگم کی باتوں نے اس کے اندر کی آگ کو سرد کر کے اسے پتھر میں بدل دیا تھا۔اس نے اپنی پوری ہمت جمع کرتے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹنا شروع کیا۔

"گڈ!" منیبہ بیگم نے اسے سنبھلتے دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔"نیچے سب کے سامنے تم ایسے ملو گی جیسے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔تم کل سلال کو مبارکباد دو گی مگر ایسے جیسے ایک ملکہ اپنے کسی ادنیٰ ملازم کی کارکردگی پر اسے تھپکی دیتی ہے۔اسے احساس ہونا چاہیے کہ وہ جیت کر بھی

تمہارے برابر نہیں آ سکتا۔"

عالیہ نے سر ہلایا۔اس کے اندر کا ہیجان اب ایک ٹھنڈے انتقام میں بدل رہا تھا۔پچیس منٹ بعد، جب وہ منیبہ بیگم کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو چند منٹ پہلے اپنے کمرے میں چیزیں توڑ رہی تھی۔وہ اب ایک بزدار تھی۔خاموش، مغرور اور ناقابلِ تسخیر۔ڈائننگ ہال کے

دروازے پر پہنچ کر منیبہ بیگم نے اسے ایک آخری بار دیکھا اور پھر اس کی جانب جھک کر دھیرے سے سرگوشی کی۔

"یاد رکھنا عالیہ! بزدار کبھی روگ نہیں مناتے، وہ بدلے کی تیاری کرتے ہیں۔"

عالیہ نے گردن تانی، لبوں پر ایک مصنوعی مگر پر اعتماد مسکراہٹ سجائی اور ہال کے اندر قدم رکھ دیا جہاں روشنیوں کے نیچے پورا خاندان اس کا منتظر تھا۔بزدار پیلس کا وہ شاہانہ ڈائننگ ہال اس وقت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا۔دیواروں پر لگے بھاری فانوسوں کی روشنی نیچے رکھے کرسٹل کے برتنوں اور چاندی کے چمچوں سے ٹکرا کر پورے ہال کو ایک مصنوعی چمک دمک سے بھر رہی تھی۔دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جا چکے تھے مگر فضا میں موجود خاموش تناؤ کھانے کی اشتہا کو دبا رہا تھا۔ڈائننگ ٹیبل سے تھوڑا پہلے ایک دوسرے میز پر بڑا سا چاکلیٹ کیک رکھا تھا جس پر Congrats Alia لکھا تھا۔امجد بزدار جو اس نے آنے کا انتظار کر رہے تھے، اسے آتے دیکھ کر اس کی جانب بڑھے اور اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا۔عالیہ کو لگا جیسے وہ مزید منوں بوجھ تلے دب گئی ہو۔

"جیتنا اور ہارنا زندگی کا حصہ ہے بیٹا مگر ہم ہمیشہ اپنی شکست سے جیت کا راستہ نکالتے ہیں۔" امجد صاحب کی آواز میں فخر اور توقعات کا ایک بھاری بوجھ تھا۔"تم سیکنڈ آئی ہو یہ بھی ایک اعزاز ہے لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ میڈیکل کے آخری سال میں تم وہ تاریخ رقم کرو گی کہ پچھلے تمام رزلٹ دھندلا جائیں گے۔"

وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس اس پر مزید توقعات کا بوجھ لاد رہے تھے۔عالیہ نے سر جھکا کر صرف 'جی' کہا۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے کندھوں پر کسی نے وزنی پہاڑ رکھ دیا ہو۔یہ بزدار خاندان کا المیہ تھا۔یہاں بچوں کی کامیابی ان کا ذاتی فخر نہیں بلکہ خاندان کی ساکھ کا مسئلہ ہوتی تھی۔ان کی خوشیوں کا معیار ان کے گریڈز اور پوزیشنز سے طے ہوتا تھا اور اس دوڑ میں وہ اکثر اپنے بچپن اور معصومیت کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔

"یہ تمہارے لیے..." امجد صاحب نے ایک چھوٹا سا مخملی ڈبہ عالیہ کی طرف بڑھایا۔اندر کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔یقیناً کچھ بیش قیمتی ہوگا۔ نیلوفر بیگم بھی پیچھے نہ رہیں۔وہ سوتیلی دادی ہی سہی مگر دادی تو تھیں نا؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک مہنگا بریسلٹ عالیہ کی کلائی میں پہنایا۔

"میرا بچہ بہت محنت کرتا ہے..." انہوں نے عالیہ کے گال سے اپنا گال مس کرتے کہا۔اگرچہ امجد بزدار کی پہلی بیوی کی اولاد، نیلوفر بیگم کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے مگر وہ ایک ایسی عورت تھیں جو اپنا مقام بنانا اور اسے برقرار رکھنا خوب جانتی تھیں۔وہ ہمیشہ ایسی تقریبات میں اپنی سخاوت سے یہ ثابت کرتی تھیں کہ وہ اس گھر کی ملکہ ہیں۔باقی سب بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لائے تھے۔نجف بھی وہاں موجود تھی جو اپنی

باری کا انتظار کر رہی تھی۔ سرمئی سوٹ پہنے جس کے نیک لائن پر لگے موتی فانوس کی تیز روشنی میں دمک رہے تھے اور کانوں میں عام سے سونے کے ٹاپس پہنے ہوئے نجف عالیہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے سوجھے ہوئے پپوٹے دیکھ چکی تھی۔

"مُجھے تم پر فخر ہے!" اس نے عالیہ کے چہرے سے بالوں کی لٹ پیچھے کرتے محبت سے کہا۔ عالیہ نے جھوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے سر اٹھایا۔ اس نے بے ساختہ نجف کو دیکھا۔ وہ ایک قابل ڈاکٹر اور عالیہ ویسی ہی قابل ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اس کے ماں باپ نجف کو پسند نہیں کرتے تھے مگر وہ اچھی ڈاکٹر تھی یہ حقیقت تھی۔

"تھینک یو!" عالیہ بس اتنا ہی کہہ پائی اور نجف کے ہاتھ سے وہ چھوٹا سا مخملی ڈبہ لے لیا۔

اسی دوران اقبال کے دو چھوٹے بچے شور مچاتے ہوئے وہ شیشے کے بنے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پھولوں کے بکے تھے۔

"عالی آپی یہ آپ کے لیے..."

ان کی معصوم باتیں اس سنجیدہ ماحول میں ایک عجیب سا تضاد پیدا کر گئیں۔ پھر کیک کاٹا گیا۔ جشن منایا گیا۔ ثالث، بار بار عالیہ کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس کا موڈ ٹھیک کر سکے مگر عالیہ کی نظریں پلیٹ پر جمی تھیں۔ ثالث کی تمام تر نرمی اور ہمدردی وہ کام نہ کر سکی جو منیبہ بیگم کی ایک سخت ڈپٹ نے کر دیا تھا۔ عالیہ اب رو نہیں رہی تھی مگر اس کے اندر کی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ شمس بزدار اور منیبہ بیگم (عالیہ اور ثالث کے والدین) دونوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ سلوی اور حق وہاں نہیں تھے۔ آج شاید حق کی ڈیوٹی اور سلوی؟ وہ اب بزدار پیلس میں کم کم ہی نظر آتی تھی۔ اس شاہانہ ڈنر میں کیک کا ہر نوالہ عالیہ کے حلق میں زہر کی طرح اتر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جشن اس کی کامیابی کا نہیں بلکہ اس کی شکست پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش تھی تاکہ ان کی کلاس برقرار رہے۔

☆☆☆☆☆

شبگیر ہاؤس کا لاؤنج اس وقت کسی ڈیزائنر کے سٹوڈیو کا منظر پیش کر رہا تھا۔ فرش سے لے کر صوفوں تک ہر جگہ چمکتے بھڑکیلے کپڑے، زری کے کام والے دوپٹے، بنارسی تھان اور زیورات کے ڈبے بکھرے پڑے تھے۔ نیمل کی شادی کی تیاریوں نے گھر کی خاموشی کو ایک ایسی رونق میں بدل دیا تھا جس کا انتظار زہرہ بیگم
برسوں سے کر رہی تھیں۔ نیمل جو اس تمام ہنگامے کا مرکز تھی، کچن سے چائے کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے باوجود ایک آسودگی سی تھی۔ اپنی ماں اور بہنوں کو یوں چہکتے دیکھ کر اسے اپنا ہر فیصلہ درست معلوم ہو رہا تھا۔ سقراط وہاں موجود نہیں تھا البتہ سلال تھا۔ اس کے رزلٹ کے جشن کے بعد اب ساری توجہ نیمل کی شادی کی طرف مرکوز ہو چکی تھی۔ زہرہ بیگم اور دادی دونوں زیور کے ڈبے اٹھائیں کچھ ڈسکس کر رہی تھیں جبکہ کچھ فاصلے پر موجود اپنے کمرے میں بیٹھے سرمد صاحب مہمانوں کی لسٹ تیار کر رہے تھے۔ کل سب کو شادی کے کارڈ بھیجنے تھے۔ وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھے۔ جبکہ لاؤنج میں نیچے میز کے گرد بیٹھے

سلال نے شرارت سے ایک زرق برق پیلا دوپٹہ اٹھایا، اسے گردن کے گرد لپیٹا اور ماڈلز کی طرح واک کرتے ہوئے میز کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

" گرلز! سنو۔ تم لوگ جیسے کپڑے بنواؤ گی، میں بھی بالکل اسی رنگ کے بنواؤں گا۔ تھیم سے ہٹ کر میں نہیں چلنے والا۔" اس نے ابرو اچکا کر اعلان کیا۔

اس سے پہلے کہ نامرہ یا نیمل کچھ کہتیں، دادی جو ہاتھ میں زیور کا ڈبہ لیے اس کا معائنہ کر رہی تھیں، فوراً بول پڑیں۔

"ہرگز نہیں سلال! توبہ کرو... مرد بنو بیٹا، مرد!"

"دادی! اس میں مرد بننے والی کیا بات ہے؟ کیا اب میں اپنی بہن کی مہندی پر سبزی مائل کرتا نہیں پہن سکتا؟ یا سفید کرتے پر دھانی واسکٹ نہیں پہن سکتا؟"

"نہیں..." دادی نے سختی سے ٹوکا۔ "یہ دھانی، پیلے اور سبز رنگ لڑکیوں کے رنگ ہیں۔ تم سفید یا کالا پہنو، جیسے مرد پہنتے ہیں۔"

سلال ہنسا اور دادی پھر کے قریب جا کر ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"دادی! آپ کو پتا نہیں ہے؟ کہتے ہیں سات بہنوں کا بھائی بھی بہن ہی ہوتا ہے۔ میں اپنی بہنوں کے ساتھ ٹوننگ کروں گا تا کہ تصاویر میں ہم ایک ہی ٹیم لگیں۔"

وہ کہیں سے بھی جلوس کا حصہ بننے والا سلال نہیں لگ رہا تھا۔ دادی نے اسے گھورتے ہوئے تصحیح کی۔

" مگر تمہاری تو چار بہنیں ہیں۔ یہ سات کہاں سے آ گئیں؟"

سلال کی شرارت اب عروج پر تھی۔ "دیکھیں دادی، گننا شروع کریں۔ ایک نیمل آپی، ایک نامرہ، ایک نوفہ، ایک تارہ... ہو گئی چار؟ پانچویں آپ، چھٹی امی... اور ساتویں نجف خالہ! ہو گئیں نا سات خواتین؟ اب بتائیں، کیا میرا حق نہیں بنتا؟"

نجف کا نام سنتے ہی دادی کے ایک گلوبند کو جانچتے ہاتھ رکے اور ان کی تیوری چڑھ گئی۔ نجف کا ذکر ان کے لیے کسی بچھو کے ڈنک سے کم نہیں ہوتا مگر سلال جان بوجھ کر ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لیے انہیں چھیڑ رہا تھا۔ دادی نے گلوبند واپس ڈبے میں رکھ دیا۔ (زہرہ بیگم نے اپنی بیٹی کے لیے زیور تو اچھا بنا لیا تھا۔) نجف کے ذکر پر دادی کچھ سخت سست کہنا چاہتی تھیں مگر اپنی بہو کی وجہ سے (جو دل سے ان کی قدر کرتی تھیں) خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔ باہر خنکی تھی مگر لاؤنج کے اندر کپڑوں کی بحث اور انسانی جذبوں کی حدت نے کافی گرمائش پیدا کر رکھی تھی۔ صوفے کے نیچے قالین پر ٹیک لگائے بیٹھی نوفہ اور تارہ ایک ڈیزائن کیٹلاگ پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کی کھسر پھسر کب سے جاری تھی۔

اچانک ان کی دھیمی بحث نے شور کی صورت اختیار کر لی۔

"نہیں تارہ! یہ والا گلہ عجیب لگتا ہے۔ ہم تلہ ورک کروائیں گے۔" نوفہ نے انگلی رکھ کر کہا۔

"تمہیں فیشن کا 'ف' بھی نہیں پتا نوفہ! یہی ڈیزائن فیشن میں ہے اور یہی بنے گا۔" تارہ نے اپنی مخصوص دھونس جمانے والی آواز میں کہا۔ مہندی کے کپڑوں کو لے کر ان کی بحث شروع ہو چکی تھی۔

"تم دونوں چپ کرو! میں جو فائنل کروں گی وہی پہنا جائے گا۔" نامرہ نے بڑی بہن والا رعب ڈالا مگر نوفہ اور تارہ میں جتنی محبت تھی، اتنی ہی جلدی ان کی 'ورلڈ وار تھری' شروع ہو جاتی تھی۔

"نوفہ ٹھیک کہہ رہی ہے ہم روایتی تلہ ورک کے ساتھ چلیں گے۔" نامرہ نے ڈیزائن دیکھنے کے بعد بالآخر نوفہ کا ساتھ دیا۔

"ہاں تم بھی اس برائلر مرغی کا ساتھ دو..."

تارہ چڑ کر اٹھی اور میز پر رکھا اپنا کیمرہ اٹھایا۔ وہاں سے جانے کے لیے پلٹی مگر کپڑوں کے ایک تھان میں اسکا پاؤں الجھا، خود سنبھالنے کی کوشش میں کیمرہ ہاتھ سے چھوٹا اور کچھ فاصلے پر قالین سے ہٹ کر فرش پر جا گرا۔ ایک زوردار تھپ کی آواز ابھری۔

نوفہ، جواب تک تارہ کے برائلر مرغی کہنے پر پر سلگ رہی تھی فوراً چہک اٹھی۔

"بہت اچھا ہوا! تمہارا یہ منحوس کیمرہ گر گیا، جان چھٹی۔" وہ اس کے ہر چیز کو ریکارڈ کرنے کی عادت سے تنگ تھی۔

تارہ کے لیے اس کا کیمرہ محض ایک مشین نہیں، اس کی روح تھی۔ اس نے تڑپ کر کیمرہ اٹھایا، اسے چیک کیا اور پھر نوفہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔

"دکھاؤ مُجھے..." سلال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کیمرہ کیا۔ جبکہ تارہ چند لمحے خاموش رہی، جیسے اپنے ترکش سے سب سے زہریلا تیر نکال رہی ہو۔ پھر وہ نہایت سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اور بہت اچھا ہوا... اچھا ہوا کہ تمہارا وہ حشام مر گیا!"

لاؤنج میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ نوفہ کو اس اچانک حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ افسانوی کرداروں کی موت پر گھنٹوں ماتم کرتی تھی اور وہ حشام کی موت پر تین دن سوگ میں رہی تھی۔ اس کے لیے یہ تیر نشانے پر لگا تھا۔ نوفہ کا چہرہ پل بھر میں سفید پڑ گیا۔ اس کی چنی بنی آنکھوں میں پانی امڈ آیا۔ تارہ تو اپنا وار کر کے، کیمرہ سلال کے ہاتھ سے جھپٹتی ہوئی فاتحانہ انداز میں لاؤنج سے کمرے میں جا چکی تھی۔ سلال نے بے اختیار نوفہ کو دیکھا۔ جس کا ضبط ٹوٹ چکا تھا۔

"ایسے... ایسے کون کہتا ہے؟ تارہ اتنی بدتمیز کیسے ہو سکتی ہے؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"نوفہ... رونا مت..." سلال کے لیے کیمرہ پیچھے رہ گیا اسے اب نوفہ کی پڑ چکی تھی۔

"حشام... حشام..." وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو پڑی۔ سلال اسے ساتھ لگا چکا تھا مگر نوفہ جب روتی تھی تو اسے چپ کروانا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔

"بھائی...حشام مر گیا..." اسے حشام یاد آ چکا تھا۔

" کوئی نہیں بچے! صبح اس کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کرواتے ہیں۔" سلال نے پیار سے اسے پچکارہ جبکہ زہرہ بیگم اس کاروائی سے کچھ دیر پہلے ہی اپنے کمرے میں گئی تھیں تاکہ مہمانوں کی لسٹ دیکھ سکیں۔انہیں ویسے بھی بچوں کے ڈراموں سے اب فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ انکا روز کا کام تھا۔

نیمل نے اسے کندھے سے پکڑا، نامرہ نے اسے پانی کا گلاس دیا مگر نوفہ کی سسکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

" کوئی مُجھے بتائے گا کہ حشام کون ہے؟" دادی توہکا بکا تھیں۔

"دادی یہ ناول کا کردار ہے۔" نیمل نے فوراً جواب دیا۔نوفہ ابھی بھی ویسے ہی رو رہی تھی۔

"ارے نوفہ وہ تو ایک کتابی قصہ تھا نا؟ تم کیوں جان ہلکان کر رہی ہو؟" دادی نے حیرت سے پوچھا۔

"دادی! آپ کو نہیں پتا...حشام صرف قصہ نہیں تھا۔وہ...وہ کتنا اچھا تھا۔" نوفہ نے اب روتے ہوئے نیمل کی گود میں سر رکھ دیا۔"تارہ نے...تارہ نے...کتنی بے رحمی سے کہا کہ...اچھا ہوا وہ مر گیا۔"

سلال نے نوفہ کو نیمل کے حوالے کیا۔"میں اب تارہ سے بات نہیں کروں گی۔"

سلال نے توبہ کرنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"یا اللہ یہ کیسی بہنیں دی ہیں مُجھے؟ ایک کیمرے کے گرنے پر پورا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے اور دوسری ایک فرضی کردار کی موت پر سوگ منا رہی ہے۔"

نیمل نے سلال کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نوفہ کے بال سہلانے لگی۔لاؤنج کا وہ ہنگامہ، وہ رنگ برنگے کپڑے اور شادی کی تیاریاں اب ایک طرف دھری رہ گئی تھیں اور پورا خاندان ایک افسانوی کردار کی موت کا سوگ منانے والی حقیقی لڑکی کو چپ کروانے میں مصروف تھا۔ یہ شبگیر ہاؤس کا خاصہ تھا۔ یہاں لڑائیاں بھی شدید تھیں اور ان لڑائیوں کے پیچھے چھپی محبت بھی اتنی ہی گہری تھی۔

"اچھا نوفہ بتاؤ تمہیں اگلی کتاب کونسی چاہیے؟ میں صبح لے آؤں گا۔" اسے چپ کروانے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔نوفہ کتابوں کے ذکر پر فوراً اٹھ بیٹھی۔

"سچی؟" وہ رونا بھول چکی تھی۔

"ہاں اب بتاؤ جلدی اور رونا بند کرو ورنہ ایک بھی نہیں لاؤں گا۔"

نوفہ اب آنسو پونچھتے سلال کو کتابوں کی لسٹ بتا رہی تھی اور سلال اپنے فون میں محفوظ کر رہا تھا جبکہ نیمل نے کیتلی سے چائے کپ میں انڈیل کر دادی کو دی اور پھر دو کپ الگ نکالتے ہوئے سرمد صاحب اور زہرہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مہمانوں کی لسٹ میں اسے بھی اپنے چند کولیگز کے نام لکھوانے تھے۔جبکہ نامرہ اب تارہ کے کیمرہ کی عیادت کے لیے جا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

رات کے ٹھیک دو بجے، بزدار پیلس کی اوپری منزل پر پھیلی خاموشی کسی قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھی۔ راہداری کی مدہم پیلی روشنیاں فرش پر پالش ہوئے سنگِ مرمر کو چمکا رہی تھیں مگر اس چمک میں ایک عجیب سی وحشت تھی۔ سلویٰ نے نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کا ہینڈل گھمایا۔ کامل کو سلانا آسان کام نہیں تھا۔ اس مشقت کے بعد وہ تھک جاتی تھی اور اس وقت اسے سلا کر، واپس اپنے کمرے میں جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا، اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں منجمد ہو گئے۔ سامنے صوفے پر بیٹھے وجود کو دیکھ کر اس کا سانس ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

وہاں حق موجود تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ہسپتال سے واپس لوٹا تھا۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس حق بزدار کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی اس کی صبح ہوئی ہو۔ ایک ہاتھ میں میگزین اٹھائے دوسرے سے وہ گھونٹ گھونٹ کافی لے رہا تھا۔ وہ فی الوقت کافی پرسکون، حد سے زیادہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے باوجود ایک طمانیت تھی جو سلویٰ کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ اس کی شخصیت کا یہی خاصہ تھا۔ وہ جتنا اندر سے بپھرا ہوا ہوتا، باہر سے اتنا ہی برف کی طرح ٹھنڈا دکھائی دیتا۔ آہٹ پہ اس نے میگزین سے نظر اٹھا کر سلوی کو دیکھا۔ وہ نیلی آنکھیں سلوی کو اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئیں۔

"ہائی..." کافی کا گھونٹ بھرتا وہ بس یہی بولا۔ گھمبیر آواز گونج گئی۔

اسکا صرف 'ہائی' کہنا ہی سلویٰ کی دھڑکن بڑھا گیا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا، آنکھوں سے نیند کا ایک ایک قطرہ غائب ہو چکا تھا۔ دروازہ بند کرتے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ حق کی نائٹ ڈیوٹی کا سوچتے ہوئے وہ سکون سے سونے آئی تھی پر اب اسے دیکھ کر نیند کہاں آتی؟ بال باندھتے ہوئے اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

"میں صبح ڈیڈی کی جا رہی ہوں اور کامل کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

اسکا سراپہ قد آدم آئینے میں واضح ہوا۔ نیلے رنگ کے شب خوابی کے لباس میں اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ حق نے اس کی بات سن کر کوئی فوری ردعمل نہیں دیا۔ اس نے کافی کا مگ میز پر رکھا، اس کی حرکات وسکنات میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ سلویٰ کیا کہنے والی ہے۔

"ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ لہجہ ہموار تھا۔

سلویٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ حق ہمیشہ کی طرح کوئی اعتراض کرے گا مگر اس کا یہ سادہ سا جواب سلویٰ کو اندر تک کھٹک گیا۔

"ڈیڈ کا برتھ ڈے ہے..." اس نے اپنی بات کی وضاحت پیش کرنی چاہی حالانکہ سالگرہ دو دن بعد تھی مگر وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ہاتھوں پر بلاوجہ ہی موئسچرائزر لگاتے وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو کافی پرسکون بیٹھا تھا۔ بال نہ زیادہ گیلے تھے نہ زیادہ خشک... انہیں انگلیوں سے ہی جمایا گیا تھا۔ کشادہ پیشانی اور وجیہہ چہرہ... آہ وہ شخص اسکا ہو کر بھی اسکا نہیں تھا۔ اور اب؟ اب وہ سلوی کو چاہیے بھی

نہیں تھا۔اب اس سے چھٹکارا چاہیے تھا۔ اس کی بات سن کر حق اپنی جگہ سے اٹھا۔اس کا وجود صوفے سے الگ ہوا تو کمرے کی فضا یکدم بوجھل ہوگئی۔وہ بڑے سکون سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آنے لگا۔

"جانتا ہوں، دو دن بعد ہے۔"اس نے سلویٰ کے چہرے پر نظریں ٹکائیں۔"میں ضرور آؤں گا۔"وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ان کے بیچ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔جیسے سب ٹھیک ہو۔

یہ سن کر سلویٰ کے ماتھے پر تیوریاں ابھر آئیں۔حق بزدار اور مسٹر خان کی سالگرہ؟ یہ تضاد اس کی سمجھ سے باہر تھا۔وہ شادی کے بعد کبھی اس تقریب میں نہیں گیا تھا۔

"کیا مطلب؟"وہ پوچھے بنا نہیں رہ پائی۔

حق نے اپنے ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈالے اور اس کے بالکل سامنے آ کر رک گیا۔

ان کے درمیان فاصلہ اب چند انچ کا رہ گیا تھا۔

"تمہارے خیال میں، مُجھے انہیں کیا گفٹ دینا چاہیے؟ کوئی نئی امپورٹڈ گاڑی یا پھر کچھ اور؟ انہیں کیا پسند ہے؟"اس نے یہ بات اتنی معصومیت اور سکون سے پوچھی جیسے وہ واقعی ایک اچھے داماد کا فرض نبھانا چاہ رہا ہو۔مگر یہی وہ لمحہ تھا جہاں سلویٰ کا ضبط جواب دے گیا۔وہ تپ اٹھی۔اس کا خون کھولنے لگا۔وہ حق کی اس ظاہری بے فکری اور پر سکون انداز سے بری طرح زچ ہو چکی تھی۔وہ شخص جس کی رگوں میں بزداروں کا زہر دوڑ رہا تھا، وہ اس قدر پر سکون کیسے رہ سکتا تھا؟

"یہ ناٹک بند کریں..."سلویٰ کی آواز غصے سے لرز اٹھی۔اسکا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"کیسا ناٹک، سلوی"حق نے اپنا سر ہلکا سا خم کیا، جانے کتنے عرصے بعد اس نے سلوی کو اس کے نام سے پکاری تھا۔سلوی اپنی جگہ ساکت ہوئی۔وہ حق کو دیکھ رہی تھی۔وہ اس کے اس رویے کو ڈی کوڈ کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔حق کی یہ خاموشی اسے خوفزدہ کر دیتی تھی۔وہ اسے جتنا سمجھنے کی کوشش کرتی، وہ اتنا ہی ایک بند کتاب کی طرح پیچیدہ ہو جاتا۔اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔یوں لگا جیسے کمرے کی فضا سے آکسیجن ختم ہوگئی ہو۔وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔جبکہ حق اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔

"مُجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"اس نے اپنے لہجے کی کپکپاہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا اور مڑ کر دروازے کی جانب بڑھی۔

"مسٹر خان سے کہیے گا اس بار میں ضرور آؤں گا۔"عقب سے ابھرتی آواز پر سلوی ایک بار پھر رکی۔پچھلے چار سال اس نے شدت سے خواہش کی تھی کہ حق اس کے خاندان کی تقریب میں شرکت کرے اور اس

بار؟ وہ یہ نہیں چاہتی تھی مگر وہ شخص؟ ہمیشہ وہی کرتا تھا جو اسے اذیت دیتا تھا۔وہ بنا کوئی جواب دیے تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

"کامل کا خیال رکھنا۔"دروازے کھولتے آخری الفاظ سلوی کی سماعت سے ٹکرائے اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔آج پھر اسے یہاں نہیں سونا تھا۔آج پھر وہ کامل کے کمرے میں پناہ لینے والی تھی۔سلویٰ کے جاتے ہی کمرے کا بھاری دروازہ جب ایک دھیمے جھٹکے سے بند ہوا تو حق بزدار نے ایک طویل، گہرا سانس خارج کیا۔اس کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے سجی وہ پر سکون مسکراہٹ اب یکدم غائب ہو چکی تھی

اور اس کی جگہ ایک اذیت نے لے لی تھی۔ ایسی اذیت جسکا کوئی توڑ نہیں تھا۔ وہ ابھی صوفے کی طرف پلٹنے ہی والا تھا کہ اس کے ٹراؤزر کی سائیڈ پاکٹ میں ایک دھیمی سی تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فون نکالا۔ یہ اس کا عام استعمال کا اسمارٹ فون نہیں تھا بلکہ وہی پرانا نوکیا کا بلیک اینڈ وائٹ ہینڈسیٹ تھا جس کی چھوٹی سی اسکرین پر اس وقت کوئی نام یا ہندسہ نہیں بلکہ صرف پرائیویٹ نمبر چمک رہا تھا۔ گزشتہ ہونے والے ثالث کے حادثے کے بعد، یہ ان کی پہلی باقاعدہ کال تھی۔ ان پراسرار مہروں نے حق سے وعدہ کیا تھا کہ وہ متعلقہ معلومات ہر قیمت پر، اس تک پہنچا دیں گے۔ اور وعدے کے عین مطابق وہ پہنچ چکے تھے۔ اس نے کال ریسیو کی اور فون کان سے لگا لیا۔

وہ کچھ نہیں بولا، بس خاموشی سے دوسری طرف کی آواز کا منتظر رہا۔ کمرے میں اس کے اپنے سانس کی آواز بھی اب واضح ہو چکی تھی۔

" کہیے کیسا لگا ڈیلیوری کا طریقہ بزدار صاحب؟" دوسری طرف سے ایک بھاری اور سرد آواز ابھری۔ اس آواز میں نہ کوئی خوف تھا، نہ پچھتاوا۔

یہ سنتے حق کی آنکھیں سکڑیں۔ اس کا لہجہ برف سے زیادہ ٹھنڈا پڑا۔

"میں نے تم لوگوں کو ایک سیدھا سا کام سونپا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر یہ تماشہ کھڑا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" اس کی آواز دبی دبی تھی۔ وہ بھیڑیے جیسی آنکھیں برہم نظر آتی تھیں۔

"اس سے زیادہ محفوظ طریقہ کوئی نہیں تھا۔" دوسری طرف موجود شخص نے دھیمے سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "بتایا تھا کہ ہمارا کام کرنے کا اپنا ایک طریقہ ہے پر آپ کو ڈر تھا کہ کہیں ثبوت کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائیں اور ہم ثبوتوں کو مٹاتے نہیں، انہیں دفن کرتے ہیں۔ اب خود دیکھ لیجیے آپ نے کیسے خود ہی سارے ثبوت دفنا دیے۔ اپنے ہی کام سے مطمئن تو ہوں گے نا آپ؟"

"مُجھے تمہارے طریقوں سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن ایک بات دماغ میں بٹھا لو۔ اگر اس میں کچھ بھی جھوٹ نکلا تو یاد دیکھنا..." وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ کمرے کی فضا تن گئی۔

"یہ دنیا تم لوگوں پر ناحق ہو جائے گی۔"

دوسری طرف چند سیکنڈز کے لیے ایک گہری، خوفناک خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ لوگ جانتے تھے کہ صرف دھمکی نہیں تھی۔ حق کو دنیا ناحق کرنا آتی تھی۔

"ڈیٹا بالکل اصل ہے، بزدار صاحب! سو فیصد اصل!"

اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔ حق نے آہستہ سے فون کان سے ہٹایا اور اس کی اسکرین کو دیکھا جواب دوبارہ کالی ہو چکی تھی مگر اس کی آنکھیں اب تک جل رہی تھیں۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ باہر سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

یہی رات شبگیر ہاؤس پر بھی اتری تھی۔ گھر کے تمام افراد تقریباً تھکن سے چور، گہری نیند کی وادیوں میں اتر چکے تھے مگر اس کمرے میں ابھی

تک جاگتے ہوئے سانسوں کی دھیمی آوازیں گونج رہی تھیں۔نوفہ بستر پر اوندھے منہ، کمبل سر تک تانے لیٹی تھی۔وہ سوئی نہیں تھی بس دنیا سے اور خاص کر تارہ سے کٹ جانا چاہتی تھی۔کمرے کے دروازے پر ایک ہلکی سی چاپ ابھری۔تارہ اندر داخل ہوئی۔اس کی آنکھوں میں اب غصہ نہیں تھا بلکہ ایک گہری شرمندگی اور احساسِ گناہ جھلک رہا تھا۔وہ تکیے کے پاس آکر کافی دیر ساکت کھڑی رہی، جیسے سوچ رہی ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔نوفہ کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔تارہ نے دھیمے سے جھک کر اپنی شہادت کی انگلی سے نوفہ کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا مگر نوفہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔وہ بالکل پتھر کی مورت بنی رہی۔تارہ نے اصرار سے دوبارہ انگلی کا دباؤ بڑھایا تو نوفہ نے چڑ چڑاتے ہوئے کندھا ہلایا مگر رخ نہیں بدلا اور نہ اسے لیٹنے کے لیے جگہ دی۔

"سوگئی ہو؟" بالآخر تارہ نے بالکل رونی صورت بنا کر، انتہائی دھیمی اور لجاجت بھری آواز میں پوچھا۔

"تمہیں کیا؟ سوؤں یا مروں؟"

نوفہ کی آواز بھاری تھی۔اسے دکھ تھا کہ جس بہن کو وہ اپنی روح کا حصہ سمجھتی تھی۔اس نے اس کی سب سے بڑی کمزوری، اس کے دل کے سب سے نازک زخم پر اتنی بے رحمی سے وار کیا تھا۔تارہ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔اس نے کمبل کا ایک کونا تھوڑا سا ہٹایا۔نوفہ نے مزاحمت کے طور پر خود کو مزید سمیٹ لیا۔

"اچھا سوری..." تارہ کی آواز سنائی دی۔"تمہیں پتا ہے وہ کیمرہ میرے لیے کتنا اہم ہے۔" وہ شرمندہ تھی۔

نوفہ نے کچھ نہیں کہا مگر پھر تارہ کی خاموش معذرت کو محسوس کرتے ہوئے وہ بستر پر تھوڑی سی سرک گئی۔اس نے اپنا منہ اب بھی کمبل سے باہر نہیں نکالا تھا۔تارہ کے لیے یہی اشارہ کافی تھا۔وہ فوراً اس خالی جگہ پر لیٹ گئی۔لیٹتے ہی تارہ نے ہمیشہ کی طرح اپنی ایک ٹانگ نوفہ کے اوپر رکھ دی۔

"تم کتنی سوفٹ ہو نوفہ!" تارہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے لاڈ سے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"پیچھے ہٹو! فاصلہ رکھ کر لیٹو مجھ سے۔" نوفہ نے کمبل کے اندر ہی سے کسمسا کر اسے ہٹانے کی کوشش کی مگر تارہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔وہ جانتی تھی کہ نوفہ کا غصہ موم کا تھا، بس ذرا سی آنچ دینے کی دیر تھی۔نوفہ کسی سے ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔

"ویسے مُجھے یاد آیا..." تارہ نے ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے پینترا بدلا۔"مُجھے تم سے عنکبوت ڈسکس کرنا تھا۔تم نے جو اس دن کہانی سنائی تھی نا، اس کے مطابق میرے ذہن میں کچھ پوائنٹس کلیئر نہیں ہیں۔"

یہ تارہ کی طرف سے صلح کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔وہ جانتی تھی کہ نوفہ کو ناول اور ان کے کرداروں سے عشق تھا۔لڑائی بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی تو صلح کرنے کا اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں تھا۔ناول کا نام سنتے ہی نوفہ کا ادیبانہ تجسس جاگ اٹھا۔اس نے آہستہ سے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا اور رخ موڑ کر تارہ کو دیکھا۔دونوں کی نظریں ملیں تو تارہ نے معصومیت سے دانت نکال دیے۔نوفہ نے ایک گہرا سانس لیا، اس کا غصہ پگھلنے لگا تھا، اس نے تارہ کو سیدھے ہو کر لیٹنے کی جگہ دی اور اب دونوں کے سر ایک ہی تکیے پر تھے۔

"بتاؤ کیا سمجھ نہیں آیا؟" وہ ڈسکشن کے لیے تیار تھی۔یہ ان دونوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔ایک بڑے سائز کا بیڈ جس پہ دونوں ایک ساتھ سوتی

تھیں۔کمرہ نہ حد سے زیادہ صاف تھا اور نہ پھیلا ہوا۔اسٹڈی ٹیبل پر ان کے بیگز رکھے تھے اور ایک جانب چھوٹے سے شیلف میں نوفہ نے ذاتی کتابیں جوڑ رکھی تھیں۔(جو سلال کے پیسوں سے آتی تھیں کیونکہ وہ ذاتی بھائی تھا)

"روحی کس کی بیٹی ہے؟" تارہ نے سرگوشی میں پوچھا،اس کا ہاتھ اب نوفہ کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔اس کے اپنے بال چھوٹے تھے اور نوفہ کے بال اسے پسند تھے۔اس کے سوال پر نوفہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم آواز میں جواب دیا۔

"وہ مافیا کی بیٹی تھی جس سے منارڈائن نے شادی کی تھی،صرف مافیا بننے کے لیے۔"

"اچھا..." تارہ نے اچنبھے سے نوفہ کی طرف دیکھا۔"تو پھر کیا روحی اگلی ملکہ بنے گی؟اچھی یا بری؟"

اس سوال پر نوفہ کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔

"یہ تو اب پڑھنے والے پر منحصر ہے تارہ!سب کو اپنے مطابق پرسیو(Perceive) کرنا ہوگا کہ وہ کیا بنے گی؟بعض اوقات اندھیرے میں جنم لینے والے وجود روشنی کے محتاج نہیں ہوتے۔"

"ہوں..." تارہ نے ایک لمبی صوتی تان کھینچی۔

"اور فائیس؟کیا وہ کہانی کا اگلا ہیرو ہوگا؟"

"اگلی کہانی؟مجھے نہیں لگتا کوئی اگلی کہانی ہوگی۔"نوفہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیوں؟رائٹر نے تو کہا تھا کہ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں..."

"رائٹرز فراڈیے ہوتے ہیں!مجھے ان پر بھروسہ نہیں ہے۔"نوفہ کے منہ بگاڑ کر کہنے پر تارہ بےساختہ ہنس دی۔

"تو تمہیں لگتا ہے رائٹر نے فراڈ کیا ہے؟"

"ہر رائٹر کرتا ہے۔"نوفہ کافی سنجیدہ تھی۔"اگر رائٹر چاہے تو کردار زندہ رہ سکتا ہے۔اگر رائٹر چاہے تو سب کی ہیپی اینڈنگ بھی ہوسکتی ہے مگر نہیں...زندگی کی امید دلا کر موت کا فراڈ کر جاتے ہیں۔"

اب ان کی گفتگو مکمل طور پر رات کے پچھلے پہر کی سرگوشیوں میں بدل چکی تھی۔وہ رائٹرز کے فراڈ،ناول کے موڑ،اس کے کرداروں اور منار کی قسمت پر بات کرتی رہیں یہاں تک کہ نوفہ کے لہجے کا سارا دکھ تارہ کی محبت کی تپش میں پگھل کر ختم ہوگیا۔بہنوں کی لڑائی تو دھوپ چھاؤں جیسی ہوتی ہے جہاں غصہ جتنا شدید ہوتا ہے،صلح اتنی ہی گہری ہوتی ہے۔کچھ دیر بعد،تارہ کی طرف سے باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور صرف ایک دھیمی سی 'ہوں' سنائی دی۔نوفہ نے مڑ کر دیکھا،تارہ کی بوجھل آنکھیں موند چکی تھیں اور وہ پرسکون نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔نوفہ نے مسکرا کر کمبل کو اچھی طرح نوفہ کے کندھوں پر پھیلایا اور اسے خود سے اور قریب کرلیا۔اب اسے بھی سونا تھا۔

☆☆☆☆☆

اتوار کا دن شاپنگ مالز کے لیے ویسے ہی قیامت کا دن ہوتا ہے اور اگر اس مال میں شبگیر خاندان کی چار لڑکیاں بیک وقت دندناتی پھر رہی

ہوں تو رونق اور آفت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا۔ مال کے سینٹرل ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ شیشے کے چمکتے ہوئے آؤٹ لیٹس، برانڈز کی سیل کے بڑے بڑے ہارڈنگز اور ہوا میں تیرتی پاپ کارنز اور کافی کی خوشبو نے ماحول کو خاصا گرما رکھا تھا۔ نیمل، نامرہ، تارہ اور نوفہ کے ساتھ پچھلے چار گھنٹوں سے مال کے چکر کاٹ کاٹ کر تھکن سے چور ہو چکی تھی مگر اس کی بہنوں کو اس کے لیے کوئی لہنگا پسند نہیں آرہا تھا۔ اور وہ زہرہ بیگم سے وعدہ کر کے آئی تھی کہ آج شادی کا جوڑا لے کے آئے گی۔ ان کے ہاتھوں میں موجود شاپنگ بیگز کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اب انہیں اٹھانا انسانی بس کا کام نہیں رہا تھا، چنانچہ انہوں نے مال کی ایک بڑی سی کسٹمر ٹرالی پر قبضہ جما لیا تھا۔

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ نیمل ایک آؤٹ لیٹ میں گھسی ہوئی تھی جبکہ باقی تینوں نے مال کے کوریڈور میں ایک الگ ہی تماشہ کھڑا کر رکھا تھا۔

"نامرہ! خدا کے لیے تھوڑا تیز دھکا لگاؤ، میری بریکیں فیل ہو رہی ہیں۔"

ٹرالی کے اندر سامان کے ساتھ نوفہ آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی کیونکہ وہ چل چل کر تھک چکی تھی اور اب مزید چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ چنانچہ تارہ اور نامرہ نے اسے ٹرالی میں بٹھایا اور خود ٹرالی کو دھکا لگانا شروع کیا۔ نیمل ان سے آگے جا چکی تھی۔

نوفہ کے دائیں بائیں ڈھیروں شاپنگ بیگز اس طرح ٹھسے ہوئے تھے کہ صرف اس کا معصوم سا چہرہ باہر نظر آرہا تھا۔

"نوفہ، تم سچ میں شبگیر ہاؤس کا سب سے بڑا وزن ہو۔"

نامرہ نے ہانپتے ہوئے ٹرالی کے ہینڈل پر پورا زور لگایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ٹرالی کو آگے دھکیل رہی تھی جبکہ تارہ اب اپنا کیمرہ نکال چکی تھی۔

"شاباش میری لیلیٰ! بس تھوڑا سا اور..." تارہ نے ویڈیو بناتے ہوئے نامرہ کا حوصلہ بلند کیا۔

"تم کیمرہ اور منہ بند کر کے میری مدد کرو..." نامرہ نے غصے سے تارہ کو گھورا۔ تارہ نے فوراً ہنستے ہوئے اپنا ایک ہاتھ ہینڈل پر رکھا اور دونوں نے مل کر ٹرالی کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ ٹرالی نے یکدم رفتار پکڑی اور شیشے کے چمکتے ہوئے فرش پر سنسناتی ہوئی آگے بڑھی۔ نوفہ نے ڈر کے مارے شاپنگ بیگز کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہاں رش قدرے کم تھا اس لیے ان کی ٹرالی بھاگتی جا رہی تھی۔ عین اسی وقت ایک مہنگے اور پرتعیش واچ برانڈ کے آؤٹ لیٹ سے ایک باوقار شخص باہر نکلا۔

Yes, Dr. Hans, I want the reports by tomorrow morning!

وہ حق بزدار تھا۔ سیاہ رنگ کے ٹراؤزر اور گہرے سرمئی رنگ کے بلیزر میں وہ ہمیشہ کی طرح حد درجہ پرکشش اور غضبناک حد تک سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ایک کان سے فون لگا ہوا تھا اور وہ ہسپتال کے کسی جراحی کیس کے سلسلے میں نہایت سنجیدگی سے جرمنی کے کسی ڈاکٹر سے انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے فرش پر تھیں اور اس کی چال میں ٹھہراؤ تھا۔ اس نے ابھی جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک فضا میں ایک عجیب سی گھڑ گھڑاہٹ گونجی۔ گھڑ... گھڑ... گھڑ... حق نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھ پاتا، اس کی عقابی نظروں کے سامنے ایک لوہے کی بڑی سی ٹرالی کسی بے لگام بلڈوزر کی طرح دندناتی ہوئی سیدھی اس کی طرف آرہی تھی۔ اور اس ٹرالی کے

عین بیچوں بیچ نوفہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، بالکل کسی ڈری ہوئی بلی کی طرح بیٹھی تھی۔

”بریک لگاؤ! سامنے بندہ ہے! بریک لگاؤ!“ نوفہ کی دہائی سنائی دی۔

نامرہ اور تارہ کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر ٹرالی کو واپس کھینچنا مشکل لگ رہا تھا۔

”اومائی گاڈ! ہٹو! سامنے سے ہٹو!“ نامرہ نے پورے وزن کے ساتھ ٹرالی کو بائیں طرف موڑنے کی کوشش کی جبکہ تارہ نے اپنے جوتے فرش پر رگڑ کر ٹرالی کو روکنے کا دیسی طریقہ اپنایا۔ عین اسی پل حق نے اپنی شاندار ریفلیکسز کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل آخری سیکنڈ پر پیچھے قدم ہٹایا۔ ٹرالی اس کے مہنگے بلیزر کو چھوتی ہوئی، ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح اس کے بالکل سامنے سے گزر کر ایک زوردار چڑچڑاہٹ کے ساتھ رکی۔ شاپنگ بیگز کے اندر سے دو پرفیوم کے ڈبے اچھل کر باہر گرے۔ پورا کوریڈور ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گیا۔ حق نے ناگواریت سے فون کان سے ہٹایا۔ اس کی گہری آنکھیں غصے اور حیرت کے شدید امتزاج سے اب ان تینوں بہنوں پر جم چکی تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے سخت تھے کہ اگر نظروں سے گولی چل سکتی تو تینوں وہیں ڈھیر ہو جاتیں۔ دوسری طرف، ان تینوں کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ اس پاس سے چند گزرتے لوگ محظوظ ہوئے۔

جیسے ہی تارہ اور نامرہ کی نظریں حق کے تیکھے نقوش پر پڑیں، ان کے چہروں کا رنگ یکدم سفید ہو گیا۔ شرمندگی اور خوف کی ایک ایسی لہر ان کے وجود میں دوڑی کہ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ نوفہ نے فوراً ایک شاپنگ بیگ اٹھا کر اپنے چہرے کے سامنے کر لیا، جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ تارہ نے جلدی سے نامرہ کی جیکٹ کھینچی اور انتہائی دھیمی، مرتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”جلدی سے کچھ بولو...“

”وہ... السلام علیکم جی... ہم بس... ٹرالی کا توازن چیک کر رہے تھے...“

حق کے لیے ان چھوٹی آنکھوں والی لڑکیوں کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تارہ نے جب حق کی آنکھوں سے انگارے برستے دیکھے تو اس نے نامرہ کا ہاتھ پکڑا۔

”عزت سادات بچاؤ اور بھاگو!“

اس سے پہلے کہ حق اپنی زبان کھولتا، تارہ اور نامرہ نے بیک وقت ٹرالی کو پیچھے کی طرف گھمایا۔ نوفہ نے شاپنگ بیگ کے پیچھے سے ایک آنکھ کھول کر حق کو دیکھا اور جیسے ہی حق کی نظر اس پر پڑی، اس نے فوراً دوبارہ منہ چھپا لیا۔ تارہ اور نامرہ نے کسی اولمپک ایتھلیٹ کی طرح ٹرالی کو موڑا اور نیمل کو آؤٹ لیٹ کے اندر ہی چھوڑ کر، دوسری طرف ایسے بھاگیں جیسے ان کے پیچھے کوئی آدم خور شیر لگ گیا ہو۔

حق ان کے جاتے ہوئے وجود کو دیکھتا رہا۔ اس کے ماتھے کی رگیں تن چکی تھیں۔ اس نے اپنے دانتوں کو اس زور سے بھینچا کہ اس کے جبڑے کا ابھار واضح ہو گیا۔

”چینی جاہل سالے...“ اس کے لبوں سے شدید حقارت اور غصے سے چبائے ہوئے الفاظ نکلے۔ وہ ان کی اس نچلے طبقے کی اوچھی حرکتوں پر دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گیا۔ قدیر جواب تک خاموشی سے گفٹ بیگز اٹھائے حق کے پیچھے مورت بنا کھڑا تھا اور اس پورے ڈرامے کو بڑے

غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے جیسے ہی حق کے منہ سے 'چینی' کا لفظ سنا، اس کا دماغ فوراً متحرک ہو گیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور قدرے سنجیدگی سے تصحیح کی۔

"چینی نہیں سر... نیپالی!"

"شٹ اپ قدیر!" برجستہ جواب آیا۔

"سوری سر..." وہ واپس ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ مسٹر خان کی تقریب میں جانے کے لیے حق ڈھیروں گفٹس خریدنے آیا تھا۔ شاپنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب جیسے ہی واپس جانے کا وقت آیا، اس کے ساتھ یہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ صد شکر اس کے ریفلیکسز اچھے تھے ورنہ حق بزدار آج 'ٹرالی حادثے' کا شکار ہو جاتا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ مال سے باہر نکل چکا تھا۔

جبکہ دوسری جانب اسٹوڈیو کے اندر کا ماحول باہر کے ہجوم سے بالکل مختلف تھا۔ تینوں بہنیں جان بچا کر وہاں پہنچ چکی تھیں۔ شیر لیمپس کی مدہم پیلی روشنی، دیواروں پر لگے بڑے بڑے قد آور آئینے اور ہینگرز پر لٹکے زردوزی اور گوٹے کے کام سے چمکتے ہوئے بھاری برائیڈل لہنگے ایک الگ ہی سحر انگیز دنیا کا منظر پیش کر رہے تھے۔ وہاں اندر نیمل موجود تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے مختلف برانڈز اور ڈیزائنرز ٹرائی کر کر کے ہلکان ہو چکی تھی۔ اب تک وہ جو بھی جوڑا پہن کر ٹرائل روم سے باہر نکلتی، باہر بیٹھی تینوں جج صاحبان اس میں کوئی نہ کوئی کیڑا نکال دیتیں۔

"اس کپڑے کی کوالٹی اس قیمت کے حساب سے بالکل فارغ ہے، ریجیکٹ!" نامرہ اپنے کاروباری دماغ کے مطابق لہنگے ریجیکٹ کر رہی تھی۔

"آپی! یہ رنگ کیمرہ میں اچھا نہیں لگ رہا۔ بدلواسے!" تارہ کا اپنا غم تھا۔

"اس کا گھیر بہت کم ہے، ناول کی ہیروئن والا ٹچ نہیں آ رہا۔" نوفہ کی دھن الگ تھی۔ پچھلے دو گھنٹے انہوں نے ایسے ہی سینکڑوں لہنگے ریجیکٹ کیے تھے۔

لیکن اس بار جیسے ہی ٹرائل روم کا ریشمی پردہ ہٹا اور نیمل باہر نکلی، اسٹوڈیو میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ تینوں بہنوں کی زبانوں کو جیسے تالے لگ گئے۔ وہ گہرے سرخ اور مٹیالے سونے (Antique Gold) کے امتزاج کا ایک برائیڈل لہنگا تھا۔ اس کے بھاری گھیر پر ریشم اور دبکے کا اتنا نفیس اور باریک کام تھا کہ روشنی پڑنے پر وہ جگمگا اٹھتا تھا۔ نیمل اس جوڑے میں بالکل کسی قدیم ریاست کی شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت اس گہرے سرخ رنگ کے ساتھ مزید نکھر آئی تھی اور لباس کا کٹ اس کے سراپے پر اس طرح فٹ بیٹھا تھا جیسے وہ بنا ہی صرف اسی کے لیے ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور پھر اپنی بہنوں کی طرف مڑی۔

"او مائی گاڈ... نیمل آپی!" تارہ کے منہ سے بے اختیار نکلا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

نامرہ نے کھڑے ہو کر لہنگے کے کام کو قریب سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"چلو، شکر ہے میرے ابا کے پیسے اب حلال ہوں گے۔ یہ جوڑا واقعی انمول ہے۔"

بالآخر طویل جدوجہد کے بعد انہیں شادی کا وہ جادوئی جوڑا مل گیا تھا جس کی تلاش پچھلے کئی گھنٹوں سے جاری تھی۔ سیلز گرل نے جب نیمل کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھی تو فوراً کہا۔

"میم! یہ ہمارا لمیٹڈ ایڈیشن ہے، میں اسے فائنل کردوں؟" نیمل نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی بہنوں کو پسند تھا تو اسے بھی پسند تھا۔

ابھی وہ جوڑا پیک ہی ہو رہا تھا اور نامرہ بل کاؤنٹر پر کارڈ سویپ کروا رہی تھی کہ نیمل کے ہینڈ بیگ میں رکھا فون بج اٹھا۔ سکرین پر سلال کا نام چمک رہا تھا۔ وہ انہیں مال سے پک کرنے کے لیے باہر پارکنگ میں پہنچ چکا تھا۔ وہ انہیں چار گھنٹے پہلے چھوڑ گیا تھا اور اب چند کام نبٹا کر انہیں لینے پہنچ گیا تھا۔ مال کے ایگزٹ گیٹ سے باہر نکلتے ہی اتوار کی سنہری شام نے ان کا استقبال کیا۔ ان سب کے ہاتھوں میں اب اتنے شاپنگ بیگز تھے کہ وہ خود ان کے پیچھے چھپ چکی تھیں۔ سلال نے وہ سارے بیگ ڈگی میں رکھے۔ نیمل آگے کی سیٹ پر سلال کے برابر بیٹھ گئی جبکہ پچھلی سیٹ پر تارہ، نامرہ اور نوفہ کے درمیان 'قبضہ جمانے' کی جنگ شروع ہوگئی۔

"نوفہ! تم سیدھی ہو کر بیٹھو، تمہاری کہنی میری پسلی میں لگ رہی ہے۔" نامرہ نے چڑ کر کہا۔

"آپی، میں کیا کروں؟ تارہ نے آدھی سیٹ پر اپنا شاپنگ بیگ رکھے ہوا ہے۔" نوفہ نے بیچارگی سے جواب دیا۔ تارہ کے لیے اسکا جوڑا بہت اہم تھا۔ اس نے ڈگی میں رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ نامرہ کے کہنے پر اس نے بیگ اپنی گود میں رکھ لیا اور دوسری ٹانگ نوفہ کے اوپر پھیلا دی تاکہ کسی طرح ایڈجسٹ ہوسکے۔ گاڑی جیسے ہی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی اور سلال نے اسے مین روڈ پر ڈالا، پچھلی سیٹ کا پنڈورا باکس کھل گیا۔

"بھائی پتا ہے آج مال میں کیا ہوا؟" تارہ نے جوش سے آگے جھکتے ہوئے سلال کا کندھا ہلایا۔ "آج تو بس ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟ کوئی سیل لگی تھی اور تم لوگوں نے کسی کو کچل دیا؟" سلال نے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے آئینے میں تارہ کو دیکھا۔

"ارے نہیں بھائی! کچلنے ہی والے تھے، وہ بھی پتا ہے کس کو؟ آپ کے فیورٹ سرجن کو..." تارہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"کیا؟" اچانک گاڑی کے سامنے آنے والے کتے کو بچاتے ہوئے سلال نے بے ساختہ بریک لگائی، جس سے پچھلی سیٹ پر موجود تینوں ایک دوسرے کے اوپر جا گریں۔

"ڈاکٹر حق بزدار؟ وہ مال میں کیا کر رہے تھے؟ اور تم لوگوں نے کیا کیا؟"

چونکنے کی باری نیمل کی بھی تھی۔ کیا حق وہاں آیا تھا؟ اور پھر پانچ منٹ بعد، پوری کتھا سن کر سلال کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"آج تم لوگوں کے ہاتھوں ایک سرجن شہید ہوتے ہوتے بچ گیا۔"

"سرجن نہیں نیلا تھوتھا..." نامرہ نے تصحیح کی۔ دادی نے حق کی نیلی آنکھوں کی وجہ سے اسکا نام نیلا تھوتھا رکھا ہوا تھا۔

"کتنی بار ہے مال میں بچوں والی حرکتیں نہ کیا کرو۔" نیمل کو پتا نہیں کیوں مگر کوفت سی ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ حق بزدار کی دنیا ان کی دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ وہاں ان چھوٹی چھوٹی نادانیوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سلال نے ساتھ بیٹھی نیمل کے موڈ کو بھانپ لیا۔ اس نے مسکراہٹ

ضبط کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

"خیر جو بھی ہو، شکریہ ہے کہ تم لوگوں کی شاپنگ مکمل ہوگئی۔"

"ابھی کہاں...ابھی تو رہتی ہے۔" تارہ فوراً تنک کر بولی تو سلال نے نفی میں سر ہلایا۔ عورتوں کی شاپنگ بھلا کبھی مکمل ہو سکتی ہے؟ گاڑی اب شبگیر ہاؤس کی جانب جانے والے راستے پر مڑ چکی تھی۔ پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تینوں بہنیں اب تھکن سے چور ہو کر ایک دوسرے کے کندھوں پر سر ٹکائے سستا رہی تھیں جبکہ نیمل کسی گہری سوچ میں غرق نظر آتی تھی۔ سلال نے محسوس کیا مگر پوچھا نہیں۔ شاید یہ صحیح وقت نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

اینگ مال کے شور و غوغا دور اب شبگیر ہاؤس پر شام کے ملگجے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ رات کا کھانا بن رہا تھا۔ دادی اور زہرہ بیگم کو ساری شاپنگ دکھانے کے بعد نیمل نے کچن کا رخ کیا اور کانچ کا صاف ستھرا پیالہ اٹھایا جس میں وہ مال کے چائنیز آؤٹ لیٹ سے خاص طور پر پیک کروا کر لائی گئی گرم گرم ڈرم اسٹکس سجا چکی تھی۔ اس کے ساتھ گھر میں سوپ بنایا گیا تھا۔ سادہ سوٹ میں بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں باندھے وہ گرم شال اوڑھتی وہ اپنے گھر سے نکل کر گلی میں بائیں جانب بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ چار گھر چھوڑ کر ہی ایک عالیشان سی دو منزلہ کوٹھی ایستادہ تھی جس کے مرکزی لوہے کے سیاہ گیٹ پر پالش شدہ پیتل کی چمکتی ہوئی تختی لگی تھی۔ سکندر ہاؤس! دہائیوں پہلے جب شبگیر خاندان پاکستان شفٹ ہوا تھا تب سرمد صاحب کی پھوپھو اس خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ وہ تو آج زندہ نہیں تھیں مگر اولاد تھی اور یوں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس گھر کے افراد شبگیروں کو کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے مگر نیمل کے وہاں جانے کی ایک بڑی وجہ آصفہ سکندر تھیں۔ سقراط اور سرمد صاحب کی پھوپھو کی بیٹی جو اب بچوں کی پھوپھو لگتی تھیں۔ ان کی اپنی کوئی سگی بہن نہیں تھی اس لیے وہ سب آصفہ پھوپھو کو دل سے چاہ کرتے تھے۔ یہ گھر شبگیر ہاؤس کی نسبت کافی جدید، عالیشان اور نیا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کی تعمیرِ نو کی گئی ہو۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اس پوری لین میں سب سے قدیم گھر شبگیر ہاؤس ہی تھا جبکہ باقی پڑوسیوں نے وقت کے ساتھ اپنے گھروں کو جدید رنگ ڈھنگ دے دیے تھے۔ نیمل نے گھنٹی بجائی اور کچھ دیر بعد گیٹ کھلا گیا۔

"السلام علیکم چچی!" سامنے ہی ثریا بیگم کو کھڑے دیکھ کر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام نیمل! آؤ..." ثریا چچی نے قدرے حیرت سے جواب دیتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ چند دن بعد اس کی شادی تھی اور اسے یوں اپنے گھر آتے دیکھ کر ثریا چچی کو تھوڑی حیرت ہوئی۔ نیمل نے گیٹ سے اندر قدم رکھا۔ پورچ میں لگی قیمتی ٹائلز اور دیواروں پر بنے ماڈرن اسکانس لیمپ گواہی دے رہے تھے کہ یہاں پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ پورچ سے ہوتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی جہاں قیمتی چمڑے کے صوفے اور دیوار پر لگی بڑی اسکرین آسائش کا پتہ دے رہی تھی۔ نیمل نے ہاتھ میں پکڑا پیالہ میز پر رکھا اور ادھر ادھر دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

"پھوپھو کہاں ہیں؟" وہ خاص ان سے ہی ملنے آئی تھی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہیں شاید نماز پڑھ رہی ہوں گی۔" ثریا چچی نے پیالے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"آج ہم سب شادی کی شاپنگ کے لیے مال گئے تھے۔ واپسی پر مُجھے چائنیز شاپ نظر آئی تو یاد آیا کہ پھوپھو کو وہاں کا چائنیز بہت پسند ہے۔ بس اسی لیے سوچا کہ لیتی چلوں..."

وہ مستقبل کی ہونے والی روایتی شرمیلی دلہنوں کے برعکس، سر پر چادر اوڑھے خود یہاں چلی آئی تھی۔ اس کی آواز اتنی واضح اور کھنکتی ہوئی تھی کہ راہداری کے اس پار اپنے کمرے میں بیٹھی وردہ نے فوراً پہچان لی۔ وہ پاؤں میں چپل اڑستی ہوئی بھاگی چلی آئی۔

"واہ! آج تو بڑے لوگ ہمارے غریب خانے پر آئے ہیں۔" اس نے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی نیمل کو دیکھ کر دلی خوشی اور تپاک کا اظہار کرتے ہوئے اسکے گلے لگ گئی۔ نیمل کے لبوں پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ پھیلی۔

"تمہاری یاد آ رہی تھی تو سوچا مل آؤں۔"

دونوں لاؤنج سے نکل کر آصفہ پھوپھو کے پرسکون کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اندر کا ماحول لاؤنج کی نسبت بہت پرسکون تھا۔ سفید سنگِ مرمر کے فرش پر جائے نماز بچھی تھی اور اس پر بیٹھیں چاندی جیسے بالوں والی آصفہ پھوپھو کا چہرہ نیمل کو دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ انہوں نے تسبیح ایک طرف رکھی اور اٹھتے ہوئے اپنی باہیں کھول دیں۔

"آؤ، میری بچی!"

نیمل نے محبت سے انہیں گلے لگایا۔ پھوپھو نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا تھا۔ انہوں نے نیمل کے دمکتے ہوئے چہرے کو اپنے نرم ہاتھوں کے پیالے میں لیا، اس کی پیشانی چومی اور دعائیں دینے لگیں۔

"بہت بہت مبارک ہو نیمل! اللہ پاک تمہارے نصیب اچھے کرے۔ مٹی کو ہاتھ لگاؤ تو سونا ہو جائے۔"

سرمد صاحب اور زہرہ بیگم دو دن پہلے ہی خود یہاں آ کر شادی کا کارڈ دے کر جا چکے تھے۔ گلی کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ اب گنتی کے چند دن باقی تھے اور پھر شگبیر ہاؤس کی یہ مضبوط بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے گی۔

"بہت بہت شکریہ، پھوپھو!" نیمل نے ان کے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وردہ نے فوراً سے ڈرم اسٹکس کا پیالہ لا کر بیچ میں رکھا۔

"خوشبو اتنی لاجواب ہے کہ مجھ سے تو ضبط نہیں ہو رہا۔" اس کی بات پر پھوپھو اور نیمل دونوں مسکرائیں۔ اگلے پندرہ بیس منٹ ان تینوں کے درمیان شاپنگ، برائیڈل لہنگے اور شادی کی تیاریوں کے گرد گھومتے رہے۔ کچھ دیر بعد وردہ پیالے سمیٹتے ہوئے اٹھی۔

"اب اس چائنیز کے بعد دیسی چائے تو بنتی ہے۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وردہ کے کمرے سے باہر نکلتے ہی کمرے میں ایک دم گہرا سکون اتر آیا۔ پھوپھو صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے، گہری اور کچھ اداس نظروں

سے نیمل کے چہرے کو تکنے لگیں جیسے وہ اس کے نقوش میں ماضی کا کوئی گمشدہ ورق تلاش کر رہی ہوں۔ نیمل نے ان کی گہری نظروں کی تپش کو محسوس کیا تو ہولے سے مسکرا کر پوچھا۔

" کیا دیکھ رہی ہیں پھوپھو؟ میرے چہرے پر کچھ لگا ہے کیا؟" وہ ایک ٹھہراؤ سے مسکراتی تھی اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں مزید چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ آصفہ پھوپھو نے ایک ٹھنڈی، طویل آہ بھری۔ ان کے چہرے کی جھریاں جیسے کسی پرانے دکھ سے ابھر آئیں۔

"جب تم پیدا ہوئی تھیں نیمل تو بالکل ایک ننھی سی، ملائم گڑیا جیسی تھیں۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار گود میں لیا تھا نا تو اسی وقت میرے دل نے کہا تھا کہ تم ایک عظیم بیٹی بنو گی۔"

وہ رکیں۔ نیمل محبت سے انہیں دیکھتی رہی۔ وقت نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا ورنہ وہ خاندان کی سب سے ذہین لڑکی تھیں۔

" آج جب تمہاری شادی میں صرف چند دن رہ گئے ہیں تو دل کے کسی کونے میں یہ حسرت، یہ خواہش جاگتی ہے کہ...کاش! وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا...کاش ہمارے خاندانوں کے درمیان وہ تلخیاں نہ آتیں...تو میں آج تمہیں پرایا کرنے کی بجائے اپنی بہو بناتی۔ میرے حق کے لیے تمہیں سالوں پہلے مانگ لیتی۔ ہم ایک ہی گھر میں رہتے نیمل...کاش..."

ان کے منہ سے حق کا نام سن کر نیمل کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے گہرا، تاریک سایہ سا لہرایا۔ اس کے دل کی دھڑکن نے ترتیب بدلی۔ اندر کہیں اذیت گھل گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نفرت کی شدید لہر نے اسکے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا مگر وہ بھی نیمل سرمد شبگیر تھی۔ اپنے جذبات کو ضبط کی چادر میں چھپانے کا ہنر اسے بچپن ہی سے آتا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے اپنے چہرے پر ایک انتہائی مطمئن اور پیاری سی مسکراہٹ سجائی اور پھوپھو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

" آپ کا بیٹا شادی شدہ ہے پھوپھو..." اس نے نہایت نرمی اور پیار سے انہیں سمجھانے والے انداز میں کہا، " آپ کی بہو بہت خوبصورت ہے۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے اور ماشاءاللہ آپ کی بہو اور آپ کے بیٹے کی ایک بہترین، مکمل جوڑی ہے۔ اتنی خوبصورت اور ہنستی کھیلتی فیملی ہے آپ کی، پھر آپ دل میں ایسی خواہشیں رکھ کر خود کو اداس کیوں کرتی ہیں؟"

" بیٹے کے ساتھ رہنے کی خواہش نہیں جاتی نیمل! بیٹے کی نفرت نہیں سہی جاتی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ نیمل کا دل دکھا۔

"ایم سوری پھوپھو!" نیمل نے ہولے سے انکا ہاتھ دبایا۔ انہوں نے نیمل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بس اب دل سے یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہارے نصیب بہت، بہت اچھے کرے۔ تم اتنی اچھی ہو کہ جو تمہیں پائے گا، وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوگا۔"

ان کے دل سے نکلی دعاؤں پر نیمل نے دھیمے سے آمین کہا۔ باتوں کا یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وردہ ٹرے میں چائے کے ابلتے ہوئے کپ اور براؤنیز لیے اندر داخل ہوئی۔ پھوپھو نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وردہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ان کے جذبات سے واقف تھی۔

"لیں جناب! کڑک چائے حاضر ہے۔ اب پھوپھو اور نیمل کی سنجیدہ باتیں ختم ہوں اور چائے کا دور شروع ہو۔"

وردہ کی چہک پر کمرے کا بوجھل پن یکدم ہوا ہو گیا اور نیمل نے چائے کا گرم کپ تھامتے ہوئے ایک بار پھر خود کو اس حقیقت کے لیے تیار کر لیا کہ اب اس کا سفر کسی دوسرے راستے پر شروع ہونے والا تھا جہاں ماضی کی غلطیوں کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ابھی اس نے چائے کا پہلا گھونٹ ہی لیا گیا تھا کہ لاؤنج میں تیز اور نپے تلے قدموں کی چاپ ابھری۔ اگلے ہی لمحے لاؤنج کا رخ کرتے ہوئے کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے طالب نمودار ہوا۔ طالب (وردہ کا بڑا بھائی) چوبیس سال کا ایک خوش مزاج اور سنجیدہ نوجوان تھا، جس نے حال ہی میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نوآموز جرنلسٹ کی سی چمک اور چہرے پر ایک گہرا ٹھہراؤ تھا جو اس کی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ کندھے پر لٹکا ہوا چمڑے کا بیگ اور آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئیں، اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ ابھی ابھی فیلڈ سے واپس لوٹا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر نیمل پر پڑی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم ایک پل کے لیے ٹھٹھک گئے۔ اس کے چہرے پر سرخی اور احترام کا ایک ملا جلا تاثر ابھرا۔ وہ نیمل سے بچپن سے ہی انسپائر تھا اور وہ اس سے ہمیشہ ایک خاص حد اور بے پناہ ادب کے ساتھ ملتا تھا۔

السلام علیکم...“ طالب نے اپنی نظریں فوراً فرش کی طرف جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! آؤ طالب بیٹھو، چائے پیو!“ پھوپھو کے کہنے پر وہ اپنا بیگ باہر رکھ کر خاموشی سے اندر آ گیا۔

نیمل نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور روایتی بڑی کزن والے انداز میں پوچھا۔

” کہیے طالب صاحب! کیسی چل رہی ہے آپ کی جرنلزم؟ آج کل تو بڑے تیکھے آرٹیکلز لکھ رہے ہیں۔“

طالب نے نیمل کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے، میز پر دھرے چائے کے کپ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی کی سرخی دوڑ گئی۔ آج اتوار تھا لیکن وہ پھر بھی اپنی کسی تحقیق کے سلسلے میں خوار ہو کر آ رہا تھا۔

”جی بس کوشش کر رہا ہوں کہ سچ لکھ سکوں۔ فیلڈ کا کام تھوڑا مشکل ہے مگر مزہ آتا ہے۔“ وہ براہ راست نیمل کو دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔

”سچ لکھنا اور سچ کا سامنا کرنا، دونوں ہی بہت ہمت کا کام ہیں طالب۔ اللہ تمہیں اس فیلڈ میں بہت کامیاب کرے۔“ نیمل نے خلوصِ دل سے دعا دی۔

”بہت شکریہ!“ طالب کے لیے نیمل کے سامنے زیادہ دیر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”سارے دن دھوپ میں گھوم گھوم کر دیکھا رنگت کتنی کالی کر لی ہے۔ اس پر تو فائزہ بیوٹی کریم بھی اثر نہیں کرے گی۔“ وردہ نے طنزیہ کہا تو نیمل مسکرا دی۔

”مردوں کی بیوٹی کریمز کی ضرورت نہیں ہوتی وردہ! وقت انہیں حالات کی بھٹی میں جھونک کر کندن بنا دیتا ہے اور ایک کندن مرد ہمیشہ وجیہہ لگتا ہے۔“

نیمل کے جس انداز میں کہا تھا طالب کو اچھا لگا مگر اسے وہاں دیر بیٹھنا مناسب نہیں لگا۔

”میں ذرا فریش ہو لوں۔“ وہ معذرت کرتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلا، پھوپھو مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں بھی کچن کا چکر لگاؤں۔ ثریا اکیلی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی ہوگی۔ تم دونوں باتیں کرو۔“

پھوپھو کے جاتے ہی کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔اب وہاں صرف نیمل اور وردہ رہ گئی تھیں۔نیمل نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور کپ کو ٹرے میں رکھتے ہوئے اس کا رخ وردہ کی طرف ہوا۔

"آپی ذرا لہنگا دوبارہ دکھائیں۔" وردہ نے ایک بار پھر اسکا فون پکڑ لیا۔وہ گیلری کھولے انگوٹھے سے تصویریں سوائپ کر رہی تھی جب اچانک آنے والی تصویر پر اس کا انگوٹھا ٹھہر گیا۔چہرے پر سایہ سا لہرایا۔نیمل بغور اسکے تاثرات دیکھ رہی تھی اور جب اس نے اسکرین پر حارث کی تصویر دیکھی تو فوراً سمجھ گئی۔یہ حارث وہی لڑکا تھا جو کالج میں اسکا جونیئر تھا۔نیمل نے اس کی تصویر محفوظ کر لی تھی کہ کبھی کوئی مسئلہ ہو اس سے نبٹ سکے۔اس نے سوچا تھا کہ وہ وردہ سے بات کرے گی اور اب؟ اب اسے شاید وہ موقع مل گیا تھا۔

"وردہ کیا تم اسے جانتی ہو؟" نیمل نے دھیمی مگر وزنی آواز میں پکارا۔وردہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں؟ اسے؟ نن..."

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" نیمل نے اپنی چادر کو کندھوں پر درست کیا۔" کیا یہ لڑکا تمہیں پریشان کرتا ہے؟"

"نہیں۔اس نے مجھے پرپوز کیا تھا میں نے ریجیکٹ کر دیا۔" وردہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"تو کیا تم اس سے بات کرتی ہو؟" اس کی آواز دھیمی اور رازدانہ تھی۔ایک کزن،ایک رشتے دار ہونے کی حیثیت سے نیمل کو یہ اپنا فرض لگ رہا تھا کہ وہ وردہ کو سمجھائے۔وردہ نے جیسے ہی یہ بات سنی۔اس نے ناگواری سے اپنا رخ بدلا۔

"آپ ان فضول لوگوں کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئیں؟ میں نے کہا نا میں ریجیکٹ کر چکی ہوں پھر یہ سوال کیوں؟" وردہ تلخ ہوئی البتہ اندر ہی اندر وہ خوفزدہ ہو چکی تھی۔کیا نیمل جانتی تھی؟ اور وہ کیسے جانتی تھی؟ کیا وہ گھر میں بتا دے گی؟

نیمل نے ایک گہرا سانس لیا۔"یہ کالج میں میرا جونیئر رہ چکا ہے اور اس کی شہرت کچھ خاص اچھی نہیں ہے۔" وہ ٹھہر کر وردہ کو دیکھنے لگی جسکے تاثرات برہم تھے۔

"ریجیکٹ کرنے کے بعد بھی،حیلے بہانوں سے کام کیوں لینا وردہ؟ تم نے اسے منع تو کر دیا مگر پھر دوستی کے نام پر تعلق یا واسطہ کیوں رکھنا؟ ہر وہ شخص جو ہماری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے،ہم سے بات کرتا ہے،وہ ہمارا دوست نہیں ہوتا۔"

"دنیا بہت بدل گئی ہے۔آپی آپ تو ایسی دقیانوسی باتیں مت کریں۔اچھی نہیں لگتیں۔کیا اب ہم لڑکیاں دوستی کا مارجن بھی نہیں رکھتیں؟" وردہ نے اپنی صفائی میں یہی کیا۔

"دنیا لڑکیوں کے لیے کبھی نہیں بدلتی وردہ! دنیا لڑکیوں کو مارجن نہیں دیتی،تم بھی کسی کو مت دو۔"

نیمل کے یہ الفاظ اتنے وزنی تھے کہ وردہ کے پاس کہنے کو کوئی لفظ باقی نہیں رہا۔وہ بس خاموشی سے سر جھکائے نیمل کی بات سنتی رہی۔اسے اپنی غلطی کا اندازہ ہو رہا تھا پر شاید وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔لو بھلا کسی سے دوستی کا تعلق رکھنا بھی برا ہوتا ہے؟ کیا لڑکیاں اتنا سا مارجن بھی ڈیزرو نہیں کرتیں؟

"مجھے پتا ہے تم سمجھدار ہو پر پھر بھی سنبھل کر رہنا۔"

نیمل بیڈ سے اٹھی۔اس نے اپنی چادر کو سر پہ ڈالا۔وردہ نے اسے مزید بیٹھنے کا نہیں کہا۔اسکا دل بد دل ہو چکا تھا۔آخر یہ بات نیمل تک کیسے پہنچی؟ سوچ سوچ کر خون ابل رہا تھا۔وہ انیس بیس سال کی ایک کم عمر لڑکی تھی۔وہ عمر جس میں لڑکیوں کو سب کچھ 'ٹھیک' لگتا ہے۔وہ عمر جس میں لڑکیوں کو مارجن چاہیے ہوتا ہے۔نیمل اسے اور باقیوں کو خدا حافظ کہتی چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد کمرے میں پھیلی خاموشی وردہ کو کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔اس کا دل اندر سے بری طرح سلگ رہا تھا۔نیمل کی وہ نصیحتیں اس کی انا کو بری طرح چبھ گئی تھیں۔اس نے ایک جھٹکے سے میز پر رکھی بڑی ٹرے اٹھائی اور پیر پٹختی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔کچن میں ایک طرف پھوپھو چولہے کے پاس کھڑی ہانڈی کے لیے پیاز ٹماٹر کا مصالحہ بھون رہی تھیں جس کی خوشبو پورے کچن میں پھیلی ہوئی تھی تو دوسری طرف ثریا چچی سنک کے پاس کھڑی سبزیاں دھو رہی تھیں۔وردہ نے برتن سنک میں اتنے زور سے پٹخے کہ شیشے کے ٹکرانے کی تیز آواز گونجی۔اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

" کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟" پھوپھو نے چمچ ہلاتے پوچھا۔

"چلی گئی ہے محترمہ!" وردہ نے اپنے دوپٹے کا پلو کندھے پر ڈالتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔"اب اگلے گھر جا کر بھی ساس سسر کو ایسے ہی دن رات لیکچر دیا کرے گی۔" وردہ کا دل کانچ کا تھا۔پل میں میلا ہو جاتا اور پل میں چمکنے لگتا تھا۔

اس کے لہجے کی یہ تلخی کچن میں موجود دونوں عورتوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ثریا چچی نے،جن کے کان ایسی باتوں کے لیے ہمیشہ کھڑے رہتے تھے فوراً ہاتھ میں پکڑی چھری ایک طرف رکھی اور مڑ کر وردہ کے قریب آئیں۔

" کیا ہوا وردہ؟ کچھ کہا ہے کیا اس نے تمہیں؟" انہوں نے دبی آواز میں پوچھا جیسے کوئی بہت بڑا راز اگلوانا چاہ رہی ہوں۔وردہ کا دل اس وقت نیمل کے بارے میں بہت برا بولنے کا کر رہا تھا مگر وہ براہِ راست اپنی چوری کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی،اس لیے اس نے بڑی چالاکی سے بات کا رخ موڑ دیا۔اسے معلوم تھا کہ نیمل کے خلاف اپنی ماں کو کیسے چنگاری لگانی ہے،باقی کا پورا بارود سمیٹنا ثریا بیگم کا اپنا موروثی کام تھا۔

" کہنا کیا ہے امی!اپنی شادی کا جوڑا تو ایسے دکھا رہی تھیں جیسے دنیا میں پہلی بار کسی نے سرخ لہنگا دیکھا ہو۔غرور تو دیکھو ذرا محترمہ کا۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔پھوپھو نے حیرت سے اسے دیکھا۔جوڑا دیکھنے کا اسرار وردہ کا تھا۔

" کیا وہ خود لے کر آئی ہے اپنا جوڑا؟" ثریا چچی کے تیور یکدم بدل گئے۔"شادی سر پر ہے اور وہ خود بازاروں میں خوار ہو رہی ہے؟"

"اور کیا امی!ساری کی ساری بہنیں خود گئی تھیں اور اپنی پسند کا جوڑا لائی ہیں۔" وردہ نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

یہ سنتے ہی رخسار پھوپھو کے چہرے کی وہ شفیق سی جوت یکدم بجھ گئی۔انہوں نے چمچہ چلانا بند کر دیا اور ایک اداس سانس لیا۔وہ جانتی تھیں کہ اب یہاں سے شگبیر خاندان کی برائی کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہونے والا تھا جسے روکنا ان کے بس میں نہیں ہوگا۔

"لوسن لو بھائی!" ثریا چچی نے اپنے ہاتھ کمر پر رکھے اور کچن کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر زہر اگلنے لگیں۔"بہت آزادی دے رکھی ہے سرمد بھائی نے اپنی بیٹیوں کو۔ایک نہ آدھی،پوری چار بیٹیاں ہیں ان کی۔عقل مند باپ تو بیٹیوں کی شادیاں وقت پر کر کے سر سے بوجھ اتارتے ہیں،اور یہ سرمد میاں...انہوں نے اپنی ساری عمر کی کمائی ان لڑکیوں کی پڑھائی پر لگا دی۔اتنے مہنگے مہنگے بڑے بڑے اداروں سے پڑھانا،

یونیورسٹیوں کی خاک چھاننا اور پھر ہر طرح کی آزادی دینا... یہ کوئی شریف لوگوں کا کام ہے؟"

"سرمد بھائی کی بیٹیاں اس گلی کی سب سے قابل اور لائق لڑکیاں ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو پڑھانا کوئی گناہ نہیں ہے۔" پھوپھو نے احتجاج کیا۔

"آپ تو بس اپنے بھائی کی طرف داری ہی کریں گی۔ آپ کا گہرا رشتہ جو ہے۔" ثریا چچی نے وہیں انکا منہ بند کروا دیا۔

"اچھا بھلا چمکتا ہوا کاروبار ہے سرمد بھائی کا لیکن دیکھو... آج تک اپنا گھر نیا نہیں بنا سکے۔ سارا پیسہ بیٹیوں پر لٹا رہے ہیں، کتابوں اور ڈگریوں پر بہا رہے ہیں... کیا ملے گا اس سے؟ آخر کو پرایا دھن ہیں، دوسروں کے گھر جا کر روٹیاں ہی بیلنی ہیں نا! اس سے بہتر تھا کوئی چار پلاٹ خرید لیتے۔"

اسی دوران طالب فریش ہو کر باہر نکلا تو ماں کی آواز سنتے ہوئے کچن کے دروازے پر آ کر رک گیا۔

"لڑکیوں کو آزاد اور آوارہ بنا دیا۔ ہنہہ!"

طالب کا چہرہ سیکنڈوں میں سخت ہو گیا۔ اسے اپنی ماں کی یہ کم ظرفی اور حسد سے بھری باتیں اندر تک بری لگیں۔

"امی! بس کر دیں خدا کے لیے۔" طالب نے کچن کے اندر قدم رکھتے ہوئے بھاری لہجے میں کہا۔ "آپ کو ہر وقت شبگیر ہاؤس کے لوگوں میں کیڑے نکالنے کی کیا بیماری ہے؟ وہ اچھی لڑکیاں ہیں اچھی بیٹیاں ہیں، انہوں نے اپنی محنت سے اس مقام کو پایا ہے اور سرمد تایا نے اپنی بیٹیوں کو تعلیم دے کر کوئی جرم نہیں کیا۔"

"لو دیکھو ذرا بڑے صاحب کو... چوبیس کے ہوئے نہیں اور ماں کو سکھانے چلے ہیں۔" ثریا چچی نے طالب کو گھورا۔ "تم ان کی اتنی طرف داری مت کیا کرو میں تمہارے ارادے اچھے سے جانتی ہوں۔"

طالب کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ اس نے چور نظروں سے پھوپھو کی طرف دیکھا جنہوں نے طالب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اور کیا اچھی بیٹیاں ہیں؟ دس سال ہو گئے ماں دل کی مریض ہے اور بیٹیاں صبح نکلتی ہیں شام کو آتی ہیں۔ نہ ماں کا خیال ہے اور نہ گھر داری کا پتا ہے۔" برتنوں کو بلاوجہ پٹختے ہوئے وہ غصے سے پھنکار رہی تھیں۔

"درست کہا آپ نے۔ دس سالوں سے تائی دل کی مریض ہیں اور دس سالوں سے نیمل نے اپنے بہن بھائیوں کو ماں کی طرح پالا ہے۔ تایا تائی کو اپنے باقی بچوں کی اتنی خبر نہیں ہوتی جتنی نیمل رکھتی ہیں۔" وہ ضبط نہیں کر پایا۔

"طالب چپ کر جاؤ..." پھوپھو اسے خاموش کروانا چاہتی تھیں۔

"نہیں پھوپھو بولنے دیں۔ ہر وقت ہمارے گھر میں ان کی برائی چلتی رہتی ہے۔ وہ لوگ اپنی زندگی میں خوش ہیں۔ خوشحالی اور سکون میں ہم سے بہت آگے ہیں بس یہی بات ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔ روٹیاں بیلنے کے علاوہ اگر آپ نے اپنی بیٹی کو بھی تھوڑی تہذیب سکھائی ہوتی تو آج بھابھی تنگ آ کر اپنے میکے نہ بیٹھی ہوتیں۔"

وہ ایک طنزیہ نظر وردہ اور اپنی ماں پہ ڈال کر گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس ماحول میں سانس نہیں لے سکتا تھا۔ اسکی ماں اور بہن کی جھگڑالو مزاج نے گھر کی بہو کو ٹکنے نہیں دیا تھا۔ ثریا چچی کو اس کی یہ آخری بات نہایت بری لگی۔

"میں نے تھوڑی نکالا ہے اسے؟ اپنے اعمال کی بدولت بیٹھی ہے وہ اپنے میکے!"

"اچھا امی چھوڑیں..." وردہ کو اندازہ نہیں تھا بات اتنی بڑھ جائے گی۔

"نہیں کہہ دو تمہاری پھوپھو کو بھی اس گھر میں، میں نے ہی بٹھا رکھا ہے؟ انہیں اپنے شوہر کا قتل کرنے کا بھی میں نے ہی کہا تھا؟" وہ بولتے جا رہی تھیں اور آصفہ پھوپھو کا چہرہ اذیت اور اہانت سے سرخ پڑ گیا جبکہ وردہ نے بے ساختہ پھوپھو سے نظریں چرائیں۔ بات کسی بھی ہوتی تھی مگر آخر میں سارا ملبہ ہمیشہ آصفہ سکندر کے سر پہ گرتا تھا۔ آہ کاش انہوں نے اپنے شوہر کا قتل نہ کیا۔ کاش کوئی ٹائم مشین ہوتی تو وہ وقت کا پہیہ گھما دیتیں مگر کاش صرف کاش ہوتا ہے۔ کاش کب حقیقت بنتا ہے؟

☆☆☆☆☆

شہر کا مشہور 'دی فینکس اسپورٹس کلب' اپنی جدید ترین سہولیات اور شاندار انفراسٹرکچر کی وجہ سے پورے صوبے میں نامور تھا۔ یہ صرف ایک کلب نہیں بلکہ شہر کے مایہ ناز اور جنونی کھلاڑیوں کا مقتل تھا جہاں پنہاں صلاحیتوں کو تراشا جاتا تھا۔ شام کے وقت یہاں کا ماحول کسی کھیل کے میدان کا پیش خیمہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف جہاں مصنوعی روشنیوں میں نہائے ہوئے وسیع و عریض ٹریکس پر ایتھلیٹس پسینہ بہا رہے تھے وہیں دوسری طرف کلب کا سب سے مہنگا اور سحر انگیز حصہ تھا۔ دی آئس ارینا (Ice Arena)۔ یہاں فیلڈ ہاکی کے ساتھ ساتھ آئس ہاکی کا ایک بین الاقوامی معیار کا رنک (Rink) بنایا گیا تھا۔ اندھیرے ہال میں صرف سفید برفانی فرش پر پڑتی تیز فلڈ لائٹس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ رنک کے اندر ہوا کی دھیمی سی سنسناہٹ اور چاروں طرف نصب موٹے شیشوں کی دیواریں باہر کے شور کو اندر آنے سے روکتی تھیں۔ ہال کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے تھا مگر اندر موجود کھلاڑیوں کے تنتے ہوئے اعصاب اور جذبوں کی تپش ماحول کو گرمائے ہوئے تھی۔ برف کے اس چمکتے ہوئے میدان کے عین بیچوں بیچ ثالث موجود تھا۔ وہ جتنا شاندار فیلڈ ہاکی کا کھلاڑی تھا، آئس ہاکی کے میدان میں اس کا تال میل اس سے بھی کہیں زیادہ جادوئی تھا۔ اگر اسے اولمپکس میں نہ کھیلنا ہوتا تو وہ فیلڈ ہاکی کی بجائے آئس ہاکی کھیلتا۔ اب فیلڈ ہاکی اس کی مجبوری تھی مگر اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ بسا اوقات یہاں پایا جاتا تھا۔ سیاہ اور سرخ رنگ کی بھاری اسپورٹس کٹ، چہرے پر لگا مضبوط جالی دار ہیلمٹ، پیروں میں چمکتے ہوئے اسکیٹنگ بلیڈز اور ہاتھوں میں ہاکی اسٹک تھامے وہ اس وقت کسی گلیشیئر کا بے رحم شکاری لگ رہا تھا۔ اس کی ٹیم کے باقی کھلاڑی اور اس کے قریبی دوست رنک کے دائرے میں اپنی پوزیشنز سنبھالے ہوئے تھے مگر سب کی نظریں صرف ثالث پر تھیں۔ ثالث نے گہرا سانس لیا، اس کے ہیلمٹ کے نیچے سے نکلتی ہوئی بھاپ ہوا میں تحلیل ہوئی۔ اگلی ہی سیکنڈ، پک (Puck- آئس ہاکی کی سخت ربڑ کی ڈسک) جیسے ہی فرش پر گری، ثالث کے بلیڈز نے برف کو بے رحمی سے کاٹا۔ شرڑڑ کی ایک کان پھاڑتی آواز کے ساتھ وہ اتنی غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھا کہ دیکھنے والوں کی سانسیں رک گئیں۔ اس کی پھرتی اور توازن ناقابل یقین حد تک کلاسک تھا۔ وہ برف پر اسکیٹنگ نہیں کر رہا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں تیر رہا ہو۔ اس نے دائیں بائیں سے آتے ہوئے اپنے ہی دوستوں کو ایک سیکنڈ کے سویں حصے میں ڈوج (Dodge) کیا اور اسٹک کے ایک ہی زوردار ہٹ سے پک کو

سیدھا نیٹ کے اندر پہنچا دیا۔

"گول...!" دیکھنے والوں کے نعرے گونجے۔

اسی دوران، ارینا کے بالائی حصے میں بنے تماشائیوں کے گیلری نما برآمدے میں چند نئے چہرے نمودار ہوئے۔ یہ شہر کے دوسرے بڑے تعلیمی اسپورٹس ادارے (قادری کالج) کے اسٹوڈنٹس بلکہ ان کی ہاکی ٹیم کے کھلاڑی تھے جو خود یہاں اپنی پریکٹس کے لیے آئے تھے۔ ان سب کے آگے ٹیم کا کیپٹن زاویار کھڑا تھا۔ اس نے مضبوطی سے ریلنگ کو تھام رکھا تھا اور اس کی گہری نظریں رنک کے اندر دھول اڑاتے ثالث پر جمی ہوئی تھیں۔

"پھرتی دیکھ رہے ہو اس کی؟" زاویار کے برابر کھڑے اس کے وائس کیپٹن نے زہریلے لہجے میں سرگوشی کی جبکہ اس کی آنکھیں ثالث کی ناقابلِ یقین رفتار کا پیچھا کر رہی تھیں۔ "بھیڑیا ہے سالا بھیڑیا...! برف پر اس کے پیر ہی نہیں ٹکتے۔"

زاویار نے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔ اس کے چہرے پر تناؤ واضح تھا۔ "یہ فیلڈ پر جتنا خطرناک ہے، برف پر اس سے زیادہ کٹھن ہے۔ بزدار کالج کی ٹیم کو اگلی ہوم سیریز میں ہرانا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔"

"مُجھے اس وقت نئے کوچ (سقراط) کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔" پیچھے کھڑے ایک اور کھلاڑی نے اپنے بازو سینے پر باندھتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ "کوچ نے بالکل سچ کہا تھا کہ بزدار کالج کی ٹیم سے کھیلنا، کسی بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر ماچس جلانے جیسا ہے۔ ان کی رگوں میں ہاکی نہیں، کوئی پاگل پن دوڑتا ہے۔ خاص طور پر یہ ثالث بزدار... یہ بندہ کھیلتا نہیں ہے بلکہ سامنے والے کو نفسیاتی طور پر کچلتا ہے۔"

"نئے کوچ نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ یہ ہم شروع سے ہی جانتے ہیں کہ بزدار اسپورٹس کالج کی ٹیم کس قدر قابل ہے۔" وائس کیپٹن ابھی تک سقراط کے حق میں نہیں تھا۔

"پر مسئلہ ہمارا سابقہ کوچ رہے ہیں۔ وہ کمبخت ہمیں پرانی تکنیک سکھاتے رہتے تھے جبکہ ان کا کوچ انہیں انٹرنیشنل لیول پر ٹرین کر رہا ہے۔ مُجھے اپنے پرانے کوچ کی ان تھکی ہوئی پالیسیوں سے سخت نفرت تھی اور اب یہ نیا کرمنل کوچ رکھ لیا ہے۔ ہماری مینجمنٹ کو تو بس بجٹ بچانے کی فکر ہے۔" زاویار نے بھی ابھی تک سقراط کو قبول نہیں کیا تھا۔ اب تک وہ انہیں صرف رگڑ رہا تھا اور یہ رگڑا جوان خون کو پسند نہیں آ رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو زاویار لیکن اگر ہمیں اس بار ٹرافی اٹھانی ہے تو ثالث کا کوئی نہ کوئی توڑ ڈھونڈنا ہوگا۔ دیکھو اسے... وہ تو تھکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔" وائس کیپٹن نے نیچے اشارہ کیا۔

نیچے رنک میں ثالث نے اب اپنا ہیلمٹ اتارا تھا جس کے ساتھ ہی اس کے پسینے میں شرابور بال اس کی پیشانی پر بکھر گئے۔ اس کی عقابی آنکھیں اب اوپر گیلری کی طرف اٹھیں جہاں قادری کالج کی ٹیم کھڑی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر ابھرنے نہیں دیا بس اپنی ہاکی اسٹک کو ایک خاص انداز میں ہوا میں لہرایا۔

"اسے چھوڑو یہ بتاؤ آج کا پلان تیار ہے؟" زاویار نے رخ پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"سو فیصد... آج نہیں بچے گا وہ۔" وائس کیپٹن نے گارنٹی دی تو زاویار نے سر ہلا دیا۔

جبکہ نیچے ارینا کی یخ بستہ برف پر گھنٹوں پسینہ بہانے اور قادری کالج کی ٹیم پر اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھانے کے بعد، ثالث اب کافی پریکٹس کر چکا تھا۔ اس کے اعصاب اب تھکن سے چور ہو رہے تھے مگر چہرے پر سکون قائم تھا۔ یہ اس کے خون کا خاصہ تھا۔ دشمن کو کسی صورت اپنی کمزوری نہیں دے سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسپورٹس کلب کے بالائی حصے میں بنے جدید پینو رامک کیفے کے کاؤنٹر پر موجود تھا۔ یہ کیفے شیشے کی بڑی بڑی دیواروں کے ساتھ برآمدے سے جڑا تھا جہاں سے نیچے کا پورا اسپورٹس رنک صاف دکھائی دیتا تھا۔ ثالث نے اپنی بھاری کٹ اتار کر ایک طرف رکھی تھی اور اب وہ گہرے نیلے رنگ کی ٹریک شرٹ میں صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جبکہ اس کے تین دوست دائیں بائیں موجود تھے۔

"تین بلیک کافی اور ایک لاٹے (Latte) دینا۔" ثالث کے دوست نے کاؤنٹر پر آرڈر لکھوایا۔

اسی دوران، ثالث نے ٹراؤزر کی جیب سے اپنا فون نکالا۔ اس کے چہرے پر ایک مبہم سی سوچ ابھری۔ آج صبح اس نے زندگی میں ایک ایسا قدم اٹھایا تھا جو اس نے پچھلے چار سالوں میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے نامرہ کو میسج کیا تھا۔ وجہ بہت سادہ تھی کچھ انتہائی اہم اسٹڈی نوٹس جو اسے صرف نامرہ سے چاہئیں تھے۔ چار سال کے طویل عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے نامرہ کے نمبر پر کوئی پیغام بھیجا تھا اور اب پورے چار گھنٹے گزرنے کے بعد اس کا ریپلائی آیا تھا۔ ثالث نے اسکرین ان لاک کی اور نامرہ کی چیٹ ونڈو کھولی۔ وہاں ایک تیکھا جواب لکھا تھا جو صاف طور پر ثالث کا منہ چڑا رہا تھا۔

"معذرت مگر میں اپنی محنت سے بنائے گئے نوٹس کسی کو نہیں دیتی۔"

ثالث نے جیسے ہی وہ جواب پڑھا اس کے لبوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس کی گہری آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ کچھ روز قبل ہونے والے اس خوفناک حادثے کی وحشت ناک رات، وہ خون اور وہ دباؤ جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر ایک بھاری بوجھ بن کر سوار تھے، اب آہستہ آہستہ اس کے ذہن کے پردے سے محو ہو رہے تھے۔ زندگی کی اس تلخی کو بھولنے کے لیے، اسے نامرہ کی شکل میں ایک انتہائی دلچسپ اور چیلنجنگ چیز مل گئی تھی جو اس کے اندر کے شکاری کو دوبارہ بیدار کر رہی تھی۔

"اسکرین کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو۔ خیریت ہے ثالث؟" اس کے دوست ہارون نے کافی کے مگ میز پر رکھتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا۔ ثالث نے جھٹکے سے فون لاک کر کے میز پر اوندھا رکھ دیا مگر اس کے چہرے کی وہ مدھم مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔

"کچھ نہیں...بس ایسے ہی ایک ریل دیکھ لی تھی۔"

"ویسے تم نے قادری کالج کے زاویار کا چہرہ دیکھا تھا؟ جب تم نے آخری ہٹ ماری تو اس کا منہ ایسے کھلا تھا جیسے کسی نے اس کے منہ پر گرم کافی ڈال دی۔ اس بار ہوم سیریز میں ان کا کچومر نکالنا ہے۔" دوسرا دوست فوراً بول اٹھا۔ وہ سب مزید کچھ کہہ رہے تھے مگر ثالث نے کافی غیر حاضری سے کافی کا مگ اٹھایا اور شیشے کی دیوار سے باہر پھیلے اسپورٹس کلب کے مناظر کو دیکھنے لگا۔ شام کی تیز لیمپ لائٹس میں اب پورا کلب چمک رہا تھا اور باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہاکی کھیل وہ جیت جاتا مگر ایک ہاری ہوئی بازی کو اسے اپنے حق میں کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆

مسٹر خان کا بنگلہ اس وقت روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔مسٹر خان کی ساٹھویں سالگرہ کی یہ تقریب کسی جشن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ہال کے وسط میں لٹکے ہوئے کرسٹل کے عظیم الشان فانوس فرش پر پالش ہوئے اطالوی سنگِ مرمر کو چمکا رہے تھے، جہاں شہر کے بڑے بڑے بزنس مین، بیوروکریٹس اور ان کی بیگمات، اپنے قیمتی زرق برق لباسوں میں ملبوس، ہاتھوں میں جوس کے گلاس تھامے مٹر گشت کر رہے تھے۔ہال کے ایک متمول کارنر میں سلویٰ کھڑی تھی۔مہرون رنگ کے ایک انتہائی مہنگے جارجٹ کے میکسی سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی مگر اس کے چہرے پر پھیلا تناؤ اس کی اندرونی بے چینی کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔اس کی نظریں بار بار ہال کے مرکز میں مسٹر خان کے ساتھ کھڑے شخص پر جم جاتی تھیں۔

سرمئی پینٹ پر گہرے نیلے رنگ کی اونی اوورسائزڈ شرٹ پہنے آج حق اپنے روایتی حلیے سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔اس کے بال جیل سے سیٹ ہونے کی بجائے ماتھے پر، خشک خشک سے پیچھے کی جانب کیے گئے تھے۔وہ مسٹر خان سے مسکرا کر بات کر رہا تھا۔اسے دیکھ دیکھ کر سلویٰ کا حلق تک کڑوا ہو رہا تھا۔وہ سچ میں آ گیا تھا جبکہ سلویٰ کو لگا تھا وہ مزاق کر رہا تھا مگر حق اس سے مزاق کب کرتا تھا؟ حق کے آنے پر سلویٰ کا پورا وجود غیر آرام دہ ہو گیا۔وہ اس شخص کے اس حد سے زیادہ پرسکون انداز سے خوفزدہ ہونے لگی تھی۔جبکہ مسٹر خان نے جب شہر کے سب سے مایہ ناز چیف سرجن یعنی اپنے داماد کو اس ٹھاٹ باٹھ کے ساتھ اپنی تقریب میں دیکھا تو ان کا سینا فخر سے چوڑا ہو گیا۔حق کا آنا انہیں سچ مچ بہت اچھا لگا تھا۔

"تمہارے آنے سے اس محفل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔" مسٹر خان مان سے کہہ رہے تھے۔حق نے چند ہی منٹوں میں اپنی گفتگو اور اپنی جادوئی شخصیت سے مسٹر خان کے پورے حلقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔وہ محفل پر پوری طرح چھا چکا تھا۔اسی دوران، ہال کے وی آئی پی لاؤنج کے ایک پرسکون کونے سے ایک تالیاں بجاتی ہوئی دھیمی آواز ابھری۔حق کی نظریں گھومیں اور اس کے چہرے کی وہ سخت لکیریں یکدم ایسے پگھلیں جیسے برف پر سورج کی پہلی کرن پڑی ہو۔وہاں کامل موجود تھا۔کامل ڈاؤن سنڈروم کا شکار بچہ تھا۔اس وقت اپنی مخصوص معصوم آنکھوں اور گول مٹول چہرے کے ساتھ ایک چھوٹے سے وہیل چیئر نما خوبصورت اسٹول پر بیٹھا اپنے بابا کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔حق دو دن بعد اپنے جگر گوشے سے مل رہا تھا۔وہ ایک پل کے لیے بھول گیا کہ وہ کس محفل میں کھڑا تھا۔وہ سب کو وہیں چھوڑتے بڑے پروقار مگر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کامل کی طرف بڑھا۔اسکے انداز میں بے تابی تھی۔کامل کے سامنے پہنچتے ہی وہ فرش پر اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔شہر کا عظیم سرجن اس وقت اپنی انا کو اپنے بیٹے کے پیروں میں ڈھیر کر چکا تھا۔

"میرا بچہ..." اس کی آواز میں وہ محبت تھی جو دیدنی تھی۔اس نے کامل کو اپنی مضبوط بانہوں میں بھر کر اپنے سینے سے لگا لیا۔کامل نے اپنے ننھے ہاتھ حق کے چہرے پر رکھے اور اپنی مخصوص توتلی زبان میں کچھ کہنے کی کوشش کی جس پر حق کے لبوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ ابھری جو سلویٰ کو تب تب نظر آتی تھی جب جب حق، کامل کے ساتھ ہوتا تھا۔ حق نے کامل کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔اس نے کامل کے لیے ایک نہیں، بلکہ دو دو پروفیشنل آیا (Nannies) کا مستقل انتظام کر رکھا تھا جو اس وقت بھی سفید یونیفارم میں نہایت مستعدی سے کامل کے دائیں بائیں کھڑی تھیں اور جنہیں حق نے خاص طور پر ٹریننگ دلوائی تھی۔کامل اپنی توتلی زبان میں پا... پا کہتا اور پھر

اپنے دونوں ہاتھ حق کے چہرے پر رکھ دیتا۔حق کھل کر مسکراتا اور پھر کامل کا گول مٹول سا گال چوم لیتا۔حق کا اپنے بیٹے کے لیے یہ لاڈ اور یہ فکر کا انداز وہاں موجود ہر شخص کے دل کو چھو رہا تھا۔خاص طور پر خواتین اس کے یہ باپ والے روپ کو دیکھ کر مسمرائز ہو رہی تھیں۔البتہ کچھ کو افسوس ہو رہا تھا کہ اتنا مکمل باپ اور اتنی مکمل ماں! پھر بچہ ایسا کیوں تھا؟ مسٹر خان بھی حق کی کامل کے لیے والہانہ محبت دیکھ کر آج سمجھ چکے تھے کہ وہ کامل کو یہاں رہنے کیوں نہیں دیتا تھا؟ دوسری طرف سلویٰ کی تین چار امیر سہیلیوں کا گروپ جو کافی دیر سے حق کو مانیٹر کر رہا تھا،اب سلویٰ کے گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔

"او مائی گاڈ،سلویٰ! تمہارا ہسبینڈ تو سچ میں ایک پرفیکٹ مین ہے۔"اس کی دوست مائدہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔"اتنا ہینڈسم،اتنا بڑا سرجن اور دیکھو ذرا...اپنے بیٹے سے کتنی محبت کرتا ہے۔اپنے ڈاؤن سنڈروم بچے کو اتنی توجہ اور محبت دینا...سچ میں،حق جیسا باپ قسمت والوں کو ملتا ہے۔"

"ہاں کہ ورنہ ایسی ابنارمل اولاد ملنے پر مرد بیوی کے ساتھ ساتھ اولاد کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں۔"ایک دوسری لڑکی گویا ہوئی۔

"سلوی تم واقعی خوش نصیب ہو کہ حق اپنے ابنارمل بچے کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔وہ تم سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟"

سلویٰ اپنی سہیلیوں کی باتیں سن کر صرف ایک مصنوعی مسکراہٹ دے سکی مگر اندر سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔وہ دیکھ سکتی تھی کہ کس طرح حق ایک طرف ایک بہترین داماد،ایک آئیڈیل شوہر اور ایک مثالی باپ کا روپ دھارے پوری محفل کی واہ واہ سمیٹ رہا تھا جبکہ صرف وہ جانتی تھی کہ اس خوبصورت نقاب کے پیچھے کتنا سرد مزاج شخص چھپا ہوا تھا۔حق نے کامل کو دوبارہ آیا کی گود میں دیا،اس کے گال کو چوما اور جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس کی نظریں ہال کے اس پار کھڑی سلویٰ سے ٹکرائیں۔ان کی نظریں ملیں تو حق کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر قدم آگے دھرتا ہوا سلوی کی جانب بڑھا جو ایک دم چوکنا ہوگئی۔ اس کی سہیلیوں نے جب حق کو اس جانب آتے دیکھا تو چند پرشوق جملے بولتی ہوئے ہٹ گئیں۔

"ہائی..."وہ سلوی کے قریب آیا اور پھر پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔دودھیا رنگت اور تیکھے نقوش والی سلوی پر یہ رنگ جچ رہا تھا۔

"ہیلو..."وہ چہرہ دوسری جانب موڑتی بے رخی سے بولی۔البتہ تیوری چڑھ چکی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"شاید یہ پہلی بار تھا جب حق نے اس کی تعریف کی تھی۔سلوی نے چونک کر اسے دیکھا۔اس کی آنکھیں،ٹھاٹھیں مارتے سمندر جیسی تھیں۔جانے وہاں کتنے طوفان چھپے ہوئے تھے۔وہ ان آنکھوں میں زیادہ دیر نہیں دیکھ پائی۔اسی بے رخی سے چہرہ موڑ لیا۔

"شکریہ!"نہایت لیا دیا سا انداز۔

"فوٹو شوٹ ہو جائے؟"سوال سے زیادہ عرض تھی۔اس سے پہلے سلوی کچھ کہتی وہ ایک فوٹوگرافر کو اشارہ کرنا تھا اور پھر اگلے چند منٹوں بعد وہ دونوں کیمروں کی فلیش لائٹس میں ایک ساتھ کھڑے تھے۔بلاشبہ وہ ایک ساتھ بہت اچھے لگتے تھے مگر سوال یہ تھا کہ یہ ساتھ کب تک کا تھا؟

☆☆☆☆☆

رات کے گیارہ بج چکے تھے اور شبگیر ہاؤس کے در و دیوار پر سکون کی ایک دھیمی میٹھی سی چادر تن چکی تھی۔ گھر کا مرکز اس وقت دادی کا وہ مانوس اور کشادہ کمرہ تھا جس کے آدھے کھلے ہوئے دروازے سے لاؤنج کی روشنی اندر جھانک رہی تھی۔ لاؤنج میں سلال، نیمل اور زہرہ بیگم دھیمی آوازوں میں بات کرتے ہوئے جہیز کے سامان کو بڑے سلیقے سے کارٹنوں میں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ لسٹ بنا رہے تھے اور ان کی سرگوشیاں دادی کے کمرے تک صاف آ رہی تھیں۔ کنگ سائز کارٹنوں، چمکتی ہوئی کراکری کے ڈبوں، ریشمی کمبلوں اور برقی آلات کے انبار کے درمیان بیٹھے سلال نے ہاتھ میں پکڑا ٹیپ رولر ایک طرف رکھا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔

"آپی اتنے سامان کا کیا کریں گی آپ؟" سلال کو واقعتاً حیرت ہو رہی تھی۔

"یہی تو میں امی سے پچھلے کئی مہینوں سے پوچھ رہی ہوں آخر اتنا سامان کیوں؟ میں اسے کہاں سمیٹوں گی؟ امی آج کل کون اپنی بیٹیوں کو اتنا جہیز دیتا ہے؟" وہ واقعی کوفت کا شکار تھی۔ اسے دل میں ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے والدین نے اپنی محنت کی کمائی کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ان چیزوں پر خرچ کر دیا تھا جن کی شاید اسے کبھی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ آخر کیوں ہمارے معاشرے میں ایک لڑکی کی قیمت ان بے جان برتنوں اور کپڑوں سے لگائی جاتی ہے؟ زہرہ بیگم نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ سے کراکری کے خانے پہ ٹک کرتے ہوئے قدرے سکون سے کہا۔

"تم دونوں بچے ہو نا، اس لیے تمہیں دنیا داری کا پتا نہیں ہے۔ یہ کوئی فالتو سامان نہیں ہے نیمل ہر چیز تمہاری ضرورت کی ہے۔ مانا کہ آج کل کا زمانہ بدل گیا ہے لیکن ایک ماں کا دل تو نہیں بدلتا نا۔ میں اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے بھیج دوں؟ کل کو نئے گھر میں کسی چھوٹی سی چیز کی بھی ضرورت پڑ گئی تو میری بیٹی کسی کے سامنے ہاتھ تو نہیں پھیلائے گی نا۔ یہ سامان نہیں بلکہ میری بچی کے لیے میری دعائیں اور اس کی آسانی ہے۔"

"اماں میں خود کما لیتی ہوں اگر مُجھے ان ڈھیر برتنوں کی ضرورت پڑتی تو میں خود خرید لیتی۔" وہ اپنی الجھن کیسے بتاتی؟ اس نے زہرہ بیگم کو اتنا خوش بہت کم دیکھا تھا اور جس قدر پرجوشی سے وہ شادی کی تیاریاں کر رہی تھیں انہیں ٹوک کر انکا دل دکھانا، نیمل کو اچھا نہیں لگ رہا اور اچھا تو اسے یہ ڈھیروں سامان بھی نہیں لگ رہا تھا۔

سلال نے ایک بڑا سا ڈبہ آگے دھکیلتے ہوئے شرارت سے نیمل کی طرف دیکھا۔ اسکی بھوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"امی! جسے نیمل شبگیر مل جائے، کیا اسے سامان بھی چاہیے ہوگا؟ میری بہن خود ایک انمول ہیرا ہے، ان کے سامنے یہ فرنیچر اور برتن تو بالکل مٹی لگتے ہیں۔"

نیمل سلال کی محبت پر مسکرا دی مگر زہرہ بیگم کے چہرے پر یکدم ایک تپنے والا تاثر ابھرا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ میز پر پٹخی اور سلال کو گھورتے ہوئے بولیں۔

"اچھا؟ بہت باتیں آنے لگی ہیں تمہیں؟ تو کیا نیمل اپنے شوہر کو پتوں میں رکھ کر روٹی کھلائے گی؟"

سلال زہرہ بیگم کا سرخ چہرہ دیکھ کر سلال ہنس دیا۔ وہ فوراً اٹھا اور زہرہ بیگم کے گلے میں اپنی دونوں بانہیں ڈال لیں۔ انکی ناراضی مول نہیں

لے سکتا تھا۔

"ارے نہیں میری پیاری امی! میں تو بس آپ کا موڈ ٹھیک کر رہا تھا۔" سلال نے ان کے گال پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے لاڈ سے کہا۔ "لیکن سچی بات بتائیں امی... کیا شاہ زیب بھائی کے گھر میں برتن نہیں ہوں گے؟ وہ خود اچھے اور بڑے خاندان سے ہیں۔ ان کے گھر میں کیا ان چیزوں کی کمی ہوگی؟"

نیمل نے بھی سلال کی بات کی تائید میں فوراً سر ہلایا۔

"سلال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاہ زیب کے گھر میں ہر آسائش پہلے سے موجود ہے۔ یہ سب برتن اور بستر وہاں جا کر صرف اسٹور روم کی زینت بنیں گے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بابا نے اتنی بڑی رقم اس دکھاوے کی نذر کر دی۔ یہی پیسہ کل کو سلال، نامرہ اور باقیوں پڑھائی میں کام آتا۔"

"تم دونوں اب مجھے سکھاؤ گے؟" زہرہ بیگم نے سلال کے ساتھ ساتھ نیمل کو بھی گھوری سے نوازا تو وہ چپ ہو گئی اور سلال کو بھی چپ رہنے کا اشارہ کر دیا۔ لاؤنج میں اب ایک سنجیدہ اور جذباتی خاموشی چھا گئی تھی۔ نیمل نے زہرہ بیگم کے چہرے پر تھکن اور فکر کی لکیریں دیکھیں تو اس کا دل بھر آیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ یہ رواج اتنے گہرے جڑ پکڑ چکے تھے کہ انہیں ایک رات میں نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر زہرہ بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔

"اچھا ٹھیک ہے آپ پریشان مت ہوں۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ نے اور بابا نے میرے لیے جو کیا ہے، وہ ہماری بساط سے بڑھ کر ہے۔ اللہ آپ لوگوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔"

زہرہ بیگم بس پھیکا سا مسکرا دیں۔ اندر کہیں خوف تھا کہ ان کی ہیرے جیسی بیٹی کو اگلے گھر میں جانے کیسے رکھا جائے گا؟ یوں تو خاندان اچھا تھا۔ سب تہذیب یافتہ تھے۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد انہوں نے نیمل کا رشتہ یہاں کیا تھا لیکن ماؤں کے دل میں ایک خوف ہمیشہ رہتا ہے اور انہیں لگتا ہے لاکھوں کا جہیز شاید

ان کی بیٹی کی قدر میں اضافہ کر دے گا۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ معصوم ماں باپ! لسٹ مکمل ہو چکی تھی۔ سامان تقریباً پیک ہو چکا تھا۔ زہرہ بیگم اب کچھ دوسری چیزیں دیکھ رہی تھیں جبکہ کچھ فاصلے پر دادی کمرے کے اندر ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ دادی اپنے بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، ان کے چہرے کی جھریاں شفقت کا آئینہ دار تھیں۔ تارہ اور نوفہ دادی کے دائیں بائیں بستر میں گھسی ہوئی تھیں۔

ہفتے میں ایک دو دن وہ لازمی دادی کے کمرے میں سورج تھی اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی نوفہ نے دادی کا دامن تھام رکھا تھا۔

"دادی! پلیز نا... سونے سے پہلے کوئی ایک کہانی سنا دیں ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔" نوفہ نے دادی کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے لاڈ سے کہا۔ اسے کہانیاں پڑھنا تو پسند تھا کہ مگر دادی سے سننے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ اس سے پہلے دادی کچھ کہتیں، کمرے کا دروازہ پورا کھلا اور نامرہ اندر داخل ہوئی۔ مٹیالا سا ٹراؤزر شرٹ اور الجھے ہوئے بال... وہ یونہی کسی گم ہو چکی یادداشت والی چڑیل کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تانبے کی ایک انتہائی نایاب، پرانی پاکٹ واچ (جیب میں رکھنے والی گھڑی) تھی اور دوسرے ہاتھ میں باریک اسکریو ڈرائیور

اور چمٹی تھی۔ وہ کسی ماہر جوہری کی طرح عینک ناک پر ٹکائے صوفے پر آ بیٹھی۔ سب جانتے تھے کہ یہ گھڑی ٹھیک ہوتے ہی ُمیڈم چور بازار' نے اگلی صبح اسے کسی اونچے دام پر بیچ کر اپنا نیا بیوپار چمکانا تھا۔ نوفہ کی بات سنتے ہی نامرہ نے گھڑی کے پرزوں پر نظریں جمائے جمائے ہی ایک کرارا طنز اچھالا۔

"رہنے دو نوفہ! دادی کو پورے ستر سال میں صرف ایک ہی کہانی یاد ہوئی ہے اور وہ ہر بار وہی سناتی ہیں۔ دادی کا بس چلے تو یہ تاریخ کی کتابوں میں بھی وہی ایک قصہ لکھوا دیں۔"

"کون سا قصہ؟" تارہ نے کمبل سے منہ نکال کر دلچسپی سے پوچھا۔

وہی... ماہ نور اور وحشی درندہ!" نامرہ نے گھڑی کا ایک باریک پرزہ الگ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ دادی نے فوراً تڑپ کر نامرہ کو گھورا۔

"نالائق! اسے تاریخی ادب میں بیوٹی اینڈ دی بیسٹ کہتے ہیں۔ تم نے تو تاریخی کہانی کو کسی سستی فلم کا نام دے دیا ہے۔"

نامرہ نے گھڑی کے اندر دھیمی سی پھونک ماری اور مسکرا کر دوبارہ جواب دیا۔

"ہاں دادی! آپ کی اس بیوٹی اینڈ بیسٹ میں وہ وحشی درندہ بھی آخر میں آپ کی طرح دیسی گھی کے پراٹھے مانگنے لگتا ہے۔"

نامرہ نے ایک بار بک اسٹور پر بیوٹی اینڈ بیسٹ کا اردو ورژن دیکھ لیا تھا جو بدقسمتی سے ُماہ نور اور وحشی درندہ' کے نام سے تھا۔ تب سے وہ دادی کو اس نام سے چڑاتی تھی۔

"ویسے دادی آپ کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی ہے اور یہ اچھے اچھے لفظ بھی بول لیتی ہیں۔ آپ نے آخر کہاں تک پڑھ رکھا ہے؟" تارہ نے دادی کے بستر میں مزید اندر گھستے ہوئے اور ان کے نرم، جھریوں بھرے ہاتھ کو اپنے گال سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میری شادی وقت پر نہ ہوئی ہوتی نا... تو آج میں بھی ایک بڑی ڈاکٹر ہوتی! کاٹھمنڈو (نیپال کا دارالحکومت) کے اسکول میں میری عقل اور میری لکھائی کے چرچے پورے علاقے میں تھے۔ میری یادداشت ایسی تھی کہ استاد دنگ رہ جاتے تھے۔"

نامرہ نے چمٹی سے گھڑی کا ایک چھوٹا سا اسپرنگ سیدھا کرتے ہوئے ایک بار پھر چوٹ کی۔

"پر افسوس ہے دادی! آپ کو اس وقت پورے نیپال میں کوئی سیدھا سادھا، ہنس مکھ لڑکا نہیں ملا جو آپ نے ایک فلسطینی سے شادی کر لی؟ اور پھر یہاں پاکستان میں آ کر بس گئے۔ ہمیں بھی پھنسا دیا۔"

دادی نے نامرہ کو گھور کر دیکھا مگر ان کی آنکھوں میں ماضی کی خوبصورت، نم آلود چمک ابھری۔

"نیپالی نہیں تھے تو کیا ہوا، غیرت مند اور دل کے بہت سچے تھے اور اب تم لوگ بیچ میں مت بولو ورنہ میں بتی بجھا دوں گی۔"

"نہیں دادی ہمیں کہانی سننی ہے۔"

نوفہ اور تارہ فوراً سیدھی ہو کر لیٹ گئیں جبکہ نامرہ خاموشی سے اپنی گھڑی کے کانٹے سیٹ کرنے لگی مگر اس کے کان دادی کی طرف ہی تھے۔

دادی نے اپنی مخصوص سحر انگیز اور دھیمی آواز میں کہانی کا باقاعدہ آغاز کیا۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک بادشاہ تھا۔ جس کے محل میں دنیا کی ہر عیش و عشرت تھی، سونا، چاندی، ہیرے جواہرات... پر اس کا دل اتنا سخت،

مغرور اور بے رحم تھا کہ ایک رات ایک غریب جادوگرنی نے اس کے تکبر کی سزا کے طور پر اسے ایک بھیانک، وحشی درندے میں بدل دیا۔ اس کا پورا چہرہ خوفناک بالوں سے ڈھک گیا۔ اس کے ناخن خنجر جیسے ہوگئے اور وہ انسانوں کی بستی سے دور اپنے ویران محل میں قید ہو گیا۔ جادوگرنی نے اسے ایک جادوئی گلاب کا پھول دیا اور کہا کہ جب تک اس پھول کی آخری پتی گرے گی اگر کسی نے تمہاری اس بھیانک شکل کے باوجود تمہارے اندر کے انسان سے سچی محبت نہ کی تو تم ہمیشہ کے لیے اسی حال میں مر جاؤ گے۔"

"دادی... وہ کتنا اکیلا ہو گیا ہوگا نا؟" نوفہ نے دھیمے سے کہا، اس کے اندر کا قاری جاگ رہا تھا۔

"اکیلا تو تھا ہی پر وہ عبرت کا نشان تھا۔" دادی نے تسلسل جاری رکھا۔ "پھر سالوں بعد، اس کے محل کی حدود میں ایک غریب بوڑھا تاجر راستہ بھول کر داخل ہوا اور اس نے اپنی بیٹی کے لیے وہاں سے ایک گلاب کا پھول توڑ لیا۔ درندے نے غصے میں آ کر اس بوڑھے کو قید کر لیا۔ جب اس کی بیٹی ماہ نور کو پتا چلا تو وہ اپنے بوڑھے باپ کو چھڑانے کے لیے خود کو اس وحشی درندے کے حوالے کرنے چلی آئی۔ وہ اتنی حسین، اتنی معصوم اور اتنی صابر تھی کہ اس ویران اور اندھیرے محل کے در و دیوار بھی اسے دیکھ کر روشن ہو جاتے۔"

"یہ سراسر حماقت تھی۔" نامرہ نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے گھڑی کا پیچ کستے ہوئے کوفت کہا۔ "باپ کا قرض اتارنے کے لیے ایک لڑکی خود نے کو ایک جانور کے حوالے کر دیا؟ اجداد کے گناہوں کی سزا بیٹیاں کیوں بھگتیں؟"

دادی نے نامرہ کو گہری نظر سے دیکھا۔ "نامرہ! کچھ رشتے اور کچھ فیصلے سودے بازی سے بالاتر ہوتے ہیں۔"

"دادی! کیا ماہ نور کو اس درندے سے ڈر نہیں لگتا تھا؟" نوفہ نے پھر سرگوشی میں پوچھا۔

"ڈر تو لگتا تھا میری بچی!" دادی نے نوفہ کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، "مگر جب انسان کسی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے لگتا ہے تو اس کی بدصورتی آہستہ آہستہ اوجھل ہونے لگتی ہے اور اس کا اندر کا انسان سامنے آ جاتا ہے۔"

"ہاں اور ہمارے ہاں تو لڑکیاں خود ہی درندوں کے چنگل میں پھنسنے کا شوق رکھتی ہیں۔" نامرہ نے گھڑی کو کان سے لگا کر ٹک ٹک کی آواز سننے کی کوشش کرتے ہوئے طنز کیا۔

"اور پھر کیا ہوا دادی؟" تارہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پھر ایک وقت آیا جب ماہ نور کو اپنے بیمار باپ کی عیادت کے لیے واپس جانا پڑا۔" دادی کی آواز اب رات کے پچھلے پہر کی طرح مزید دھیمی ہوگئی۔ "درندے نے اسے جانے دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ جادوئی گلاب کی آخری پتی گرنے والی ہے۔ ماہ نور جب اپنے گھر پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا دل تو اسی ویران محل میں اس درندے کے پاس رہ گیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی، اپنے کپڑے سنبھالتی ہوئی واپس محل پہنچی۔ جب وہ محل کے باغ میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ وحشی درندہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور جادوئی گلاب کی آخری پتی بس گرنے ہی والی تھی۔"

کمرے میں اس وقت سانسوں کی آواز بھی واضح تھی۔ تارہ اور نوفہ دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر وہ کہانی کے سحر میں تھیں۔

"ماہ نور اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔" دادی نے کہانی کو اپنے اختتام کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "اس نے درندے کے اس

خوفناک، بالوں سے جڑے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور روتے ہوئے بولی پلیز مجھے چھوڑ کر مت جاؤ...میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، میں تم سے محبت کرتی ہوں! جیسے ہی اس کے آنسو درندے کے چہرے پر گرے اور محبت کا اعتراف ہوا...ایک زوردار جادوئی روشنی چمکی۔ جادو کا وہ بھیانک پس منظر یکدم غائب ہو گیا۔ درندے کی وہ وحشی شکل پگھل گئی اور وہ ایک انتہائی خوبصورت، دلکش اور مہربان بادشاہ کے روپ میں زندہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی شادی ہوگئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوش رہنے لگے۔"

"چلو شکر ہے کہانی کا ہیپی اینڈ تو ہوا۔" تارہ نے ایک لمبا سانس لیا اور اس کی آنکھیں موند لیں۔ نوفہ بھی دادی کا دامن تھامے پرسکون نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔

اسی لمحے نامرہ کے ہاتھوں میں موجود پرانی گھڑی سے ایک مدہم اور باقاعدہ ٹک ٹک کی آواز گونجی۔ گھڑی کے کانٹے اب بالکل درست ترتیب سے گھوم رہے تھے۔ نامرہ کے لبوں پر ایک فاتحانہ اور گہری مسکراہٹ ابھری۔ اس نے اسکریوڈرائیور اور چمٹی کو سمیٹ کر اپنے چھوٹے سے پاؤچ میں رکھا، گھڑی کو اپنے دوپٹے سے صاف کیا اور صوفے سے کھڑی ہوئی۔ اس نے بستر پر سوئی ہوئی اپنی دونوں معصوم بہنوں کو دیکھا، پھر دادی کی طرف رخ کر کے دھیمے سے بولی۔

"لو جناب! میڈم چور بازار کا مال تیار ہے۔ اب میں چلی سونے، صبح اس کا سودا کرنا ہے۔" وہ فخر سے کہتی دروازے کی جانب بڑھی۔

دروازے پر اچانک رک کر اس نے پلٹ کر دادی کو دیکھا۔

" کہانی تو ختم ہوگئی دادی...درندہ انسان بن گیا۔ پر کاش! حقیقی زندگی کی کہانیاں بھی اتنی ہی آسان ہوتیں۔"

وہ عجیب سے انداز میں کہتے کمرے سے باہر نکل گئی اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھی ہلکے سے بھیڑ دیا تاکہ باہر کی روشنی اندر نہ آئے۔

دادی نے کچھ دیر کمرے میں پھیلی خاموشی کو محسوس کیا۔ انہوں نے جھک کر تارہ اور نوفہ کے کندھوں پر کمبل کو اچھی طرح پھیلایا، ان کے ماتھے چومے اور پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیمپ کی مدہم ہوتی زرد روشنی میں ان کی نظریں کھڑکی سے باہر رات کے گہرے گھپ اندھیرے پر جم گئیں۔ ان کے چہرے پر انتہائی سنجیدہ اور اداس تبسم ابھرا۔ انہوں نے اپنے دل میں چھپے اس تلخ سچ کو (جو وہ ان سوتی ہوئی بچیوں کے سامنے نہیں بول سکتی تھیں) ایک سرد سرگوشی کی شکل میں باہر نکالا۔

" کہانیاں تو خوبصورت ہوتی ہی ہیں مگر یہ حقیقی دنیا ہے اور اس دنیا کا سچ یہ ہے کہ... ہر بیوٹی کو بیسٹ سے محبت نہیں ہوتی۔ اور کچھ درندے اتنے سفاک، اتنے چٹان جیسے سخت اور اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے سچی محبت کے آنسو بھی گریں تو وہ شہزادے نہیں بنتے بلکہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اس خوبصورتی کو بھی ہمیشہ کے لیے نگل جاتے ہیں۔"

بے ساختہ انہیں اپنی دوست لیلی یاد آئی۔ جانے لیلی کا کیا راز تھا۔ اس کے ساتھ ہی دادی نے لیمپ بجھا دیا اور پورا کمرہ ایک مدھم اندھیرے میں ڈوب گیا جہاں صرف ان دو معصوم بہنوں کے پرسکون سانسوں کی دھیمی آوازیں گونج رہی تھیں جبکہ دادی کا دل اداس ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ کنال روڈ پر پھیلا ہوا سنسنان اندھیرا اور سڑک کے دونوں اطراف کھڑے بوڑھے درختوں کے سائے ماحول کو مزید پر اسرار بنا رہے تھے۔ نہر کے پانی کی دھیمی سی سرسراہٹ کے علاوہ دور دور تک کسی گاڑی کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس خاموش شاہراہ پر سقراط اپنی آواز کرتی موٹر سائیکل پر سوار تھا جس کی ہیڈ لائٹ کی پیلی روشنی سڑک پر دور تک دائرہ بنا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا۔ قادری کالج کے اسٹوڈنٹس کے لیے وہ پچھلے چند دنوں میں ایک ڈراؤنا خواب بن چکا تھا۔ اس کے سخت ڈسپلن اور گراؤنڈ میں ناکوں چنے چبوانے کے سخت طریقے نے کچھ اسٹوڈنٹس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ اسے کالج سے نکالنے کے نئے طریقے سوچ رہے تھے۔ پلان بنا رہے تھے مگر ابھی تک کوئی پلان کامیاب نہیں ہوا تھا۔ سقراط کا ذہن بھی اسی وقت وہیں اٹکا تھا جب اچانک پیچھے سے تین تیز رفتار بائیکس کے انجن چنگھاڑے۔ سقراط نے آئینے میں دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز چمک اس کی آنکھوں میں چبھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا ان تینوں بائیکس نے ایک گھیرا بنا کر سقراط کو سڑک کے بائیں کنارے، درختوں کے جھنڈ کے پاس رکنے پر مجبور کر دیا۔ سقراط نے سکون سے بریک لگائی، بائیک کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور انجن بند کر دیا۔ فضا میں یکدم ایک بھاری خاموشی چھا گئی۔ موٹر سائیکلوں سے چھ لڑکے اترے۔ سب نے اپنے چہروں پر رومال باندھ رکھے تھے مگر ان کے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی فیلڈ ہاکی اسٹکس ان کے ارادوں کو صاف ظاہر کر رہی تھی۔ وہ رات کے اس پہر یہاں سقراط کی ایسی درگت بنانا چاہتے تھے کہ سقراط شبگیر ساری عمر یاد رکھے۔

"ہڈی پسلی ایک کرنی ہے آج..." ایک جوان گرجا۔ سقراط نے اپنا ہیلمٹ اتارا اور اسے بائیک کے ہینڈل پر ٹانگ دیا۔ اس کے چہرے پر نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی گھبراہٹ۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں میں ماہر کھلاڑی کی چمک ابھری۔ اس نے ان چھ لڑکوں کے کھڑے ہونے کے انداز، ان کی باڈی لینگویج اور ہاکی پکڑنے کے زاویے کو چند ہی لمحوں میں اسکین کر لیا۔

"ہاکی پکڑنے کا یہ طریقہ غلط ہے تمہارا..." سقراط نے بہت دھیمے اور سرد لہجے میں کہا۔ "رومال باندھنے سے قد کاٹھ اور پوزیشنز تبدیل نہیں ہوتیں نالائقو!" وہ انہیں پہچان گیا تھا۔

"شٹ اپ! مارو سالے کو!"

پہلے لڑکے نے پوری قوت سے ہاکی ہوا میں لہرائی اور سقراط کے سر پر وار کیا۔ لیکن سقراط گراؤنڈ کا آدمی تھا۔ اس کے ریفلیکسز تھے۔ وہ ایک انچ دائیں ہوا، ہاکی ہوا کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اسی لمحے اس نے آؤٹ سائیڈ پوزیشن سے اس لڑکے کی کلائی کو دبوچا اور ایک جھٹکے سے ہاکی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ کھیل اب الٹ چکا تھا۔ اب ہاکی سقراط کے ہاتھ میں تھی۔ اقی پانچ لڑکے ایک ساتھ اس پر جھپٹے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس شخص سے لڑ رہے تھے جس نے اپنی پوری زندگی ہاکی کی حرکات وسکنات (Physics of Motion) کو سمجھنے میں گزاری تھی۔ سقراط نے ہاکی کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔ جیسے ہی ایک لڑکا آگے بڑھا، اس نے ہاکی کا نچلا حصہ (Hook) اس کے ٹخنے میں پھنسایا اور ایک ہلکے سے جھٹکے سے اسے سڑک پر گرا دیا۔ دوسرا لڑکا جیسے ہی اوپر سے وار کرنے لگا، سقراط نے اپنی ہاکی کا مڈل

شافٹ اس کے پیٹ پر مارا، جس سے اس کی کراہ نکلی اور وہ دوہرا ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ باقی تینوں نے اسے گھیرنے کی کوشش کی مگر سقراط نے دائرے میں گھومتے ہوئے ہاکی کی ایسی کلاسک ہٹس ان کے گھٹنوں اور کلائیوں پر ماریں کہ ان کے ہاتھوں سے ہاکیاں چھوٹ کر دور جا گریں۔ سنسنان سڑک پر اب صرف لڑکوں کے کراہنے اور چیخنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ صرف تین منٹ کے اندر، وہ چھ کے چھ لڑکے سڑک کے کنارے مٹی میں ڈھیر ہو چکے تھے اور درد سے کراہ رہے تھے۔ سقراط نے ہاتھ میں پکڑی ہاکی کو زمین پر ٹکایا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس لڑکے کے چہرے سے رومال کھینچا جس نے سب سے پہلے بات کی تھی۔ وہ ان کی ٹیم کا مڈ فیلڈر تھا۔ لڑکا درد سے کراہتے ہوئے خوفزدہ آنکھوں سے سقراط کو دیکھنے لگا، جس کا وجود اس وقت اندھیرے میں اس پر چھایا ہوا تھا۔ سقراط نے ہاکی کو اس کے چہرے کے بالکل قریب کیا، اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

"تم لوگوں نے سوچا تھا کہ تم اپنے کوچ پر حملہ کرو گے اور کوچ کو پتا نہیں چلے گا؟ زاویار کی یہ گھٹیا چال میں گراؤنڈ میں ہی سمجھ گیا تھا۔ یاد رکھو، میں نے جس عمر میں ہاکی کھیلنا شروع کی تھی اس عمر میں تم لوگ ابھی چلنا سیکھ رہے تھے۔"

اس نے ہاکی کو ایک جھٹکے سے سڑک پر پھینکا۔ لڑکوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ان کے گھٹنوں پر لگنے والی چوٹوں نے انہیں منہ کے بل گرایا۔ سقراط پلٹتے ہوئے نے اپنی موٹر سائیکل کو کک ماری، انجن دوبارہ گرج اٹھا۔ بائیک پر بیٹھ کر اس نے ہینڈل گھمایا اور ان کراہتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھا۔

" کل صبح ٹھیک آٹھ بجے تم چھ کے چھ اور تمہارا کیپٹن زاویار، مُجھے کالج کے گراؤنڈ میں موجود ملنے چاہیئے۔ اگر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہوئی تو قادری کالج کی ٹیم تو دور کی بات ہے تم لوگ اس شہر کے کسی اسٹریٹ ٹورنامنٹ میں بھی کھیلنے کے قابل نہیں رہو گے۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایکسیلیٹر گھمایا اور اس کی موٹر سائیکل کنال روڈ کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی جبکہ پیچھے سڑک پر قادری کالج کے احمق اسٹوڈنٹس اپنی شکست اور سقراط کے خوف کے ملبے تلے دبے پڑے تھے۔

☆☆☆☆☆

سیشن کورٹ کی عمارت کے باہر آج تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ درجنوں کیمرے اور مائیک پکڑے رپورٹرز پسینے میں شرابور کھڑے تھے۔ آج اس مقدمے کا فیصلہ آنے والا تھا جس نے پچھلے چھ ماہ سے پورے شہر کی سیاست اور صحافت میں بھونچال برپا کر رکھا تھا۔ یہ مقدمہ تھا دانیال خان کا، جس پر ایم این اے کی بیٹی، آصمہ شاہ کے ریپ کا الزام تھا۔ اندر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج افتخار احمد کے کمرہ عدالت میں اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ کٹہرے میں دانیال خان کھڑا تھا۔ چھ ماہ کی قید، ذلت اور اندھے میڈیا ٹرائل نے اس چوبیس سالہ نوجوان کی کمر توڑ دی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے، کندھے جھکے ہوئے اور چہرے پر ایسی ویرانی تھی جو کسی بھی زندہ انسان کو مردہ دکھانے کے لیے کافی تھی۔

دوسری طرف استغاثہ کے بینچ پر نامور سرکاری وکیل وزیر ملک انتہائی رعونت اور طمانیت سے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی، پہلی صف میں

آصمہ شاہ اپنے گرد کالی چادر لپیٹے بیٹھی تھی۔اس کے ساتھ اس کے والد کے ذاتی گارڈز اور وکلاء کی ایک پوری فوج موجود تھی۔
ان سب کے مقابل دفاع کی کرسی پر نیمل شبگیر بیٹھی تھی۔اس کا کالا کوٹ،سفید بینڈ اور چہرے کا سکون کافی دیدنی تھا۔یہ کیس نیمل کے سینئر کا تھا جن کا دو ماہ پہلے ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور یوں یہ کیس نیمل کے پاس آ گیا۔وہ دفاع کرنے آئی تھی اور دفاع کرنا جانتی تھی۔
"باملاحظہ ہوشیار...."
جج افتخار احمد کمرے میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی سنبھالی۔انہوں نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور استغاثہ کو آخری دلائل شروع کرنے کا اشارہ کیا۔
"یور آنر! پراسیکیوٹر اپنی بھاری بھرکم فائل اٹھائے روسٹرم پر آئے۔"یہ کیس اس عدالت کے سامنے موجود اب تک کے سب سے سیدھے اور واضح مقدمات میں سے ایک ہے۔استغاثہ نے پچھلے چھ ماہ میں وہ تمام شواہد پیش کیے ہیں جو ملزم دانیال خان کو سزا کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔وقوعے کی رات،ملزم اور متاثرہ لڑکی ایک ہی ہوٹل کے کمرے میں موجود تھے۔ہمارے پاس ہوٹل کی سی سی ٹی وی فوٹیج ہے۔ہمارے پاس میڈیکل رپورٹس ہیں اور سب سے بڑھ کر...ہمارے پاس ڈی این اے رپورٹ اور ملزم کے فنگر پرنٹس موجود ہیں جو جائے وقوعہ سے ملے ہیں۔"
وزیر ملک نے کٹہرے میں کھڑے دانیال کی طرف اشارہ کیا۔"یہ شخص ایک درندہ ہے جس نے ایک شریف اور سیاسی گھرانے کی بیٹی کی عزت کو تار تار کیا۔ڈی این اے اور فنگر پرنٹس جھوٹ نہیں بولتے۔میری عدالت سے استدعا ہے کہ اس شخص کو قانون کے مطابق سخت ترین سزا دی جائے تاکہ معاشرے میں ایک مثال قائم ہو سکے۔"
کمرے میں موجود صحافیوں نے تیزی سے اپنے نوٹ پیڈز پر لکھنا شروع کر دیا۔یہ دلائل واقعی مضبوط تھے۔میڈیکل اور فورینسک شواہد کی موجودگی میں کسی بھی ملزم کا بچنا ناممکن ہوتا ہے۔آصمہ نے اپنی چادر کو مزید کھینچ لیا،اس کی آنکھیں زمین پر گڑی تھیں۔
جج افتخار احمد نے نیمل کی طرف دیکھا۔"دفاع آپ کے آخری دلائل؟"
نیمل اپنی جگہ سے اٹھی۔اس نے اپنی فائل نہیں اٹھائی بلکہ وہ خالی ہاتھ چلتی ہوئی روسٹرم پر آئی۔اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پورے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔
"یور آنر! میں فاضل پراسیکیوٹر کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ ڈی این اے جھوٹ نہیں بولتا،فنگر پرنٹس جھوٹ نہیں بولتے اور ہوٹل کی سی سی ٹی وی فوٹیج بھی جھوٹ نہیں بولتی۔"
پورے کمرے میں ایک سناٹا چھا گیا۔پراسیکیوٹر نے حیرت سے نیمل کو دیکھا۔وہ اپنے ہی موکل کے خلاف ثبوتوں کا اعتراف کر رہی تھی؟
"اب تک یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ دانیال نے ریپ نہیں کیا مگر آج میں اس عدالت کے سامنے یہ تسلیم کرتی ہوں کہ اس رات دانیال خان اسی ہوٹل کے کمرے میں موجود تھا۔میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ ان دونوں کے درمیان جسمانی تعلق قائم ہوا،جس کی وجہ سے ڈی این اے اور فنگر پرنٹس میچ ہوئے۔"

عدالت میں ایک کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ جج صاحب نے ہتھوڑا مار کر خاموشی کا اشارہ کیا۔

"تو پھر آپ کا دفاع کیا ہے؟" جج صاحب نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"دفاع یہ ہے، یور آنر..." نیمل نے اپنا لہجہ سخت کیا، "کہ جسمانی شواہد صرف ایک عمل کی موجودگی ثابت کرتے ہیں، اس عمل کے پیچھے چھپی رضامندی (Consent) یا جبر کا فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ ریپ نہیں تھا یور آنر! یہ تین سالہ پرانی محبت کی ایک ملاقات تھی جسے اگلے دن ایک خوفناک سیاسی سازش اور جھوٹی ایف آئی آر میں بدل دیا گیا۔"

پراسیکیوٹر فوراً کھڑے ہوئے۔ "آبجیکشن! وکیلِ صفائی بغیر کسی ثبوت کے متاثرہ لڑکی کی کردار کشی کر رہی ہیں!"

"یہ کردار کشی نہیں، حقیقت ہے۔ جس کے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔" نیمل نے اپنی ٹیم کے ایک رکن کو اشارہ کیا، جس نے ثبوتوں کی ایک بھاری فائل پیشکار کے حوالے کی۔

"یور آنر! یہ آصمہ شاہ کا پچھلے تین سال کا مواصلاتی ریکارڈ، واٹس ایپ ہسٹری اور ان دونوں کے درجنوں نجی دوروں کے فلائٹ اور ہوٹل ریکارڈز ہیں اور یہ وہ نمبر ہے جسے وہ چھپ کر استعمال کرتی رہی ہے۔ دانیال اور آصمہ شاہ پچھلے تین سال سے ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے۔ یہ بات ان کے چند قریبی دوست جانتے تھے مگر آصمہ کے والد اس بات سے مکمل طور پر بے خبر تھے۔ آصمہ اپنے والد کی جابرانہ سیاست اور طاقت کے کھیل سے گھٹن محسوس کرتی تھی اور دانیال اس کی واحد پناہ گاہ تھا۔ وقوعے کی رات وہ دونوں اپنی باہمی رضامندی سے ملے تھے۔ اس رات کا کوئی جبر، کوئی زبردستی ریکارڈ پر موجود نہیں ہے۔"

"اگر یہ باہمی رضامندی تھی۔" جج افتخار احمد نے سوال کیا، "تو پھر اگلے ہی دن آصمہ شاہ نے ریپ کا مقدمہ کیوں درج کروایا؟ اور دانیال پچھلے چھ ماہ سے، یہ سب کیوں چھپاتا رہا؟ اس نے یہ حقیقت پہلے دن عدالت کو کیوں نہیں بتائی؟"

نیمل نے دانیال کی طرف ایک دکھ بھری نظر ڈالی اور گویا کوئی۔

" کیونکہ یور آنر! وہ ایک عام سا نوجوان ہے اور اس کا سامنا اس ریاست کے طاقتور مافیا سے تھا۔ وہ اس لیے خاموش نہیں تھا کہ وہ گنہگار تھا بلکہ وہ اس لیے خاموش تھا کیونکہ وہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، اور سب سے بڑھ کر... وہ اس لڑکی کو بچانا چاہتا تھا جس سے وہ محبت کرتا تھا اور اسے آخری لمحے تک امید تھی کہ آصمہ کا ضمیر جاگے گا اور وہ اسے بچالے گی۔"

نیمل نے ایک فلیش ڈرائیو اور کچھ دستاویزات عدالت کے سامنے پیش کیں۔

"یور آنر! اس کیس کا آغاز اس رات ہوٹل کے کمرے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا آغاز آج سے سات ماہ قبل، آصمہ شاہ کے خاندانی فارم ہاؤس پر ہوا تھا۔ سات ماہ پہلے آصمہ دانیال کو اپنے نجی فارم ہاؤس لے گئی۔ وہاں اتفاقاً دانیال کو اس سیاسی خاندان کے چند غیر قانونی کاموں علم ہوگیا جن میں بیرونی ممالک سے غیر قانونی سیاسی فنڈنگ لینا۔ اپوزیشن کے اراکین کی بلیک میلنگ۔ ایک حق گو صحافی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کروانے (قتل) کا منصوبہ۔ اور آنے والے انتخابات میں دھاندلی کا مکمل بلو پرنٹ شامل تھے۔"

"یور آنر! یہ عدالت کا وقت ضائع کرنے اور کیس کو سیاسی رنگ دینے کی بھونڈی کوشش ہے۔" پراسیکیوٹر کی آواز سنائی دی۔

"یہ سیاسی رنگ نہیں اس کیس کی بنیاد ہے۔" نیمل اپنے موقف پر قائم رہی۔ "دانیال نے چھ ماہ اور دو ہفتے پہلے آصمہ سے اس بارے میں بات کی۔ آصمہ خوفزدہ ہوگئی اور اسے خاموش رہنے کا کہا۔ یہ ان کا پہلا بڑا جھگڑا تھا۔ دانیال نے آصمہ سے کہا کہ وہ سب جانتے ہوئے بھی خاموش نہیں رہ سکتا۔"

نیمل نے اپنی فائل کا اگلا صفحہ پلٹا۔ اب اس کا لہجہ ایک ماہر تفتیش کار جیسا تھا۔

"چھ ماہ پہلے آصمہ نے دانیال کو اپنے والد سے لایا اور اس کے والد کو شک ہوگیا کہ دانیال کچھ جانتا ہے چونکہ وہ ایک مڈل کلاس لڑکا تھا اور سیاسی خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا، اس لیے اسے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھا گیا۔ یہاں سے ایک بے گناہ کی نگرانی کا وہ بھیانک کھیل شروع ہوا جس نے اسے آج اس کٹہرے تک پہنچا دیا۔"

نیمل نے پیشکار کو ایک آڈیو اور لاگ فائل دی۔

"یور آنر! یہ آصمہ کے والد کے سیکیورٹی انچارج شیر زمان کے فون اور ٹریکنگ ڈیوائسز کا فرانزک تصدیق شدہ ریکارڈ ہے۔ شیر زمان کو دانیال پر نظر رکھنے کا حکم ملا۔ اس کی نقل و حرکت، اس کی ملاقاتیں اور اس کے فون کالز غیر قانونی طور پر ٹیپ کیے جانے لگے۔ جب دانیال کو خطرہ محسوس ہوا تو آج سے پانچ ماہ اور تین ہفتے پہلے، اس نے اپنے ایک دوست کو ایک ای میل لکھی جو اس فائل میں موجود ہے۔ اس نے لکھا کہ اگر میرے ساتھ کچھ ہوا تو میرے لیپ ٹاپ کا بیک اپ محفوظ رکھنا۔ ایک ریپسٹ جرم کرنے سے پہلے اپنے دوستوں کو ایسے ای میلز نہیں کرتا یور آنر!"

نیمل نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"پانچ ماہ اور دو ہفتے پہلے... آصمہ دانیال سے آخری بار ملتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتی ہے کہ ملک چھوڑ دو کیونکہ اس کے والد اسے مار دیں گے۔ دانیال انکار کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا مگر میں بھاگوں گا بھی نہیں اور پھر وہ رات آئی..." نیمل روسٹرم پر جھکی اور جج صاحب سے آنکھیں ملائیں۔

"آصمہ اور دانیال کی ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ آصمہ کے والد کو اس ملاقات کا علم ہوگیا۔ انہوں نے بیٹی پر دباؤ ڈالا، اسے ڈرایا اور اسے مجبور کیا کہ وہ دانیال کو ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹانے کے لیے ریپ کا جھوٹا مقدمہ درج کروائے ورنہ وہ دانیال کو جان سے مار ڈالیں گے۔ آصمہ اپنے والد کے دباؤ اور خوف کے سامنے ہار گئی۔ اس نے وہ ڈی این اے اور وہ فنگر پرنٹس جرم کے طور پر عدالت میں پیش کر دیا۔"

"یہ سب کہانیاں ہیں یور آنر! ایک باعزت شخص پر اس قدر گھناؤنے الزام لگانے کی سازش ہے۔ وکیلِ صفائی کے پاس ان الزامات کا کیا ثبوت ہے؟" پراسیکیوٹر نے آخری مزاحمت کی کوشش کی۔ آصمہ شاہ کے کیس میں اس کے والد نے جتنے جھوٹ گھڑ رکھے تھے اور جتنا کچھ پراسیکیوٹر سے چھپایا تھا یہ سب جاننے کے بعد پراسیکیوٹر جان چکا تھا کہ یہ کیس اب ان کے ہاتھ سے گیا۔

نیمل کے چہرے پر ایک دھیمی مسکراہٹ ابھری۔

" پچھلی سماعت کے دوران ایک شخص نے مجھ سے خفیہ طور پر رابطہ کیا۔ وہ شخص شیر زمان تھا۔ اس نے وہ تمام آڈیو ریکارڈنگز، وہ تمام ٹریکنگ لاگز مُجھے فراہم کیے جو ثابت کرتے ہیں کہ آصمہ کے والد نے اسے ریپ کی ایف آئی آر درج کروانے سے پہلے یہ ہدایت دی تھی کہ اس لڑکے کو ایسے کیس میں پھنساؤ کہ یہ زندگی بھر جیل سے باہر نہ آ سکے اور ہماری سیاست محفوظ رہے۔ یور آنر! پچھلی سماعتوں میں تاخیر کی وجہ یہی تھی کہ میں پنجاب فرانزک سائنس ایجنسی (PFSA) سے ان تمام آڈیوز کی فرانزک تصدیق کروا رہی تھی جواب مکمل ہو کر آپ کے سامنے پڑی ہے۔"

صحافی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ آصمہ کے والد کے وکلاء کے پسینے چھوٹ گئے۔ ان کے اپنے مہرے نے انہیں دھوکہ دے دیا تھا شاید اس میرے کا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ شیر زمان کو بلایا گیا اس کی گواہی سنی گئی۔ نیمل نے ثابت کر دیا تھا کہ دانیال نے ریپ نہیں کیا تھا بلکہ دانیال کو خاموش کروانے کے لیے ریپ کا جھوٹا لبادہ اوڑھا گیا تھا۔

"یور آنر! استغاثہ نے ثابت کیا کہ دانیال وہاں تھا۔ مگر استغاثہ یہ ثابت کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے کہ وہاں رضامندی نہیں تھی۔ دانیال پہلے اس لیے نہیں بولا کیونکہ وہ خوفزدہ تھا۔ اپنی فیملی کے لیے اور شاید اپنی محبت کے لیے بھی۔ میری استدعا ہے کہ اس بے گناہ کو رہا کیا جائے۔"

مزید بحث اور دیگر شواہد کے بعد جج افتخار احمد نے گہرا سانس لیا۔ انہوں نے فرانزک رپورٹس، ای میل کے پرنٹ آؤٹس اور شیر زمان کے مہیا کردہ لاگز کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ کورٹ روم میں گھڑی کی ٹک ٹک ہتھوڑے جیسی لگ رہی تھی۔ بالآخر جج نے اپنا قلم اٹھایا اور فیصلہ لکھنا شروع کیا۔

دس منٹ کی طویل خاموشی کے بعد انہوں نے اپنی عینک اتاری اور فیصلہ سنایا۔

"عدالت نے استغاثہ کے پیش کردہ جسمانی شواہد اور وکیلِ صفائی کے پیش کردہ مواصلاتی، ڈیجیٹل اور فرانزک آڈیو شواہد کا بغور جائزہ لیا ہے۔ یہ عدالت اس بات سے انکار نہیں کرتی کہ وقوعے کی رات ملزم اور مستغیثہ کے درمیان جسمانی تعلق قائم ہوا تھا۔ تاہم..." جج صاحب کی آواز بھاری ہوگئی۔

"استغاثہ یہ ثابت کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے کہ یہ تعلق مستغیثہ کی رضامندی کے بغیر قائم ہوا تھا۔ وکیلِ صفائی کی طرف سے پیش کردہ شواہد ایک طویل مدتی تعلق اور اس کیس کے پیچھے موجود ایک انتہائی مضبوط سیاسی محرک (Political Motive) کو ثابت کرتے ہیں۔ استغاثہ کے بیانیے میں موجود تضادات اور مستغیثہ کا وقوعے کے بعد کا رویہ اس کیس کو انتہائی مشکوک بناتا ہے۔ لہٰذا یہ عدالت ملزم دانیال خان کو زیرِ دفعہ 376 ت۔پ کے الزامات سے باعزت بری کرنے کا حکم سناتی ہے۔ ملزم کو فوراً رہا کیا جائے۔ تاہم عدالت کے سامنے پیش کیے گئے فرانزک آڈیو ریکارڈز، گواہ شیر زمان کے بیان اور دیگر دستاویزات بادی النظر میں اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ملزم کے خلاف جھوٹا مقدمہ درج کروانے، غیر قانونی نگرانی کروانے اور عدالتی عمل کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ لہٰذا عدالت اس فیصلے کی مصدقہ نقل پولیس کے اسپیشل انویسٹی گیشن یونٹ، ایف آئی اے اور الیکشن کمیشن کو ارسال کرنے کا حکم دیتی ہے تاکہ متعلقہ افراد کے خلاف

قانون کے مطابق تحقیقات کا آغاز کیا جا سکے۔"

ہتھوڑا بجا اور فیصلہ سنا کر جج صاحب اپنے چیمبر میں چلے گئے۔ کمرے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صحافی بریکنگ نیوز دینے کے لیے باہر کی طرف دوڑے۔ دانیال کٹہرے کی لکڑی پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ پراسیکیوٹر ملک اپنی فائلیں سمیٹ کر خاموشی سے نکل گئے۔ آصمہ شاہ اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اس نے ایک آخری آنسوؤں سے بھری شکستہ نظر دانیال پر ڈالی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنا ضمیر اور اپنا سکون ہمیشہ کے لیے اپنے باپ کی سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ جبکہ اسکے والد اور ان کی ٹیم میں افراتفری سی پھیل گئی تھی۔ آصمہ اپنے گارڈز کے حصار میں سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیمل نے اپنی فائلیں بیگ میں رکھیں۔ اس نے اپنا پہلا ذاتی اور سب سے بڑا ہائی پروفائل مقدمہ جیت لیا تھا۔ اس کا نام آج پورے شہر کے ٹی وی چینلز پر گونجنے والا تھا۔ دانیال اور اس کی ماں نے نیمل کو دعائیں دیں۔ سیشن کورٹ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے نیمل نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دانیال آزاد تو ہو گیا تھا مگر اس کی روح چھ ماہ کی ذلت اور محبت کی غداری تلے ہمیشہ کے لیے کچل دی گئی تھی۔ دوسری طرف آصمہ اپنے سونے کے پنجرے میں واپس جا چکی تھی جہاں اسے اب ساری زندگی گھٹ گھٹ کر مرنا تھا۔ عدالت کے اس کھیل میں ملزم بری ضرور ہوا تھا لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس المیے میں کوئی حقیقی فاتح نہیں تھا۔ سب ہار گئے تھے۔ اور یہی اس معاشرے اور اس کے نظامِ
انصاف کا سب سے بھیانک اور تلخ سچ تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر اس کے ذہن میں ایک چہرہ گھوم رہا تھا۔ سقراط شبگیر... جس نے دو سال سزا کاٹی تھی۔ ذلت اور رسوائی اسکا مقدر ٹھہری تھی۔ ریپ کیس کا الزام سہہ کر اور ساری ذلت سمیٹ کر وہ شخص آج بھی جینے کی کوشش کر رہا تھا۔ آہ کاش! تب کوئی نیمل شبگیر ہوتی جو سقراط شبگیر کو بچا پاتی۔ کاش!

☆☆☆☆☆

شہر کے ایک پُرشکوہ کاروباری علاقے کے پرسکون کونے میں واقع 'اینمل کیئر اینڈ پیٹ کلینک' کے اندر کی فضا باہر سے بالکل مختلف تھی۔ اندر ہلکی سی فینول، جانوروں کے شیمپو اور اینٹی سیپٹک لوشن کی ملی جلی بو تھی جسے کاؤنٹر پر رکھے لیونڈر کے برقی عطر دان نے کافی حد تک ایک مسحور کن خوشبو میں بدل دیا تھا۔ نجف نے کلینک کا پچھلا شیشے کا بھاری دروازہ دھکیلا تو اوپر لگی چھوٹی سی پیتل کی گھنٹی (ونڈ چارم) نے ایک مدھم سی جل ترنگ چھیڑی۔ بالوں کا جوڑا بنائے، گردن کے گرد اسکارف لپیٹے وہ تھکی تھکی سی مگر پروقار انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اس شہر میں اس کی واحد دوست ڈاکٹر سارہ تھی جس کا یہ کلینک تھا۔ ذہنی سوچوں سے تنگ آ کر وہ سارہ سے ملنے آ جاتی تھی یوں بھی ہسپتال نے اس کی زندگی سے سارے رنگ چرا لیے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر چاروں جانب دیکھا۔ دوسری جانب موجود ریسپشن بھی اس وقت خالی تھا۔ تبھی کلینک کے اندرونی چیمبر کا دروازہ کھلا اور سارہ باہر آئی۔ سبز رنگ کے سکربز (Scrubs) پہنے اور گلے میں اسٹیتھو سکوپ لٹکائے سارہ کے ہاتھوں میں اس وقت ایک چھوٹا سا سفید فلفی پرشین بلی کا بچہ تھا جس کی ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"ارے نجف تم؟" سارہ کی آنکھیں نجف اچانک سامنے دیکھ کر چمک اٹھیں۔ اس نے بلی کے بچے کو آہستہ سے اپنی اسسٹنٹ کے حوالے کیا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی نجف کی طرف بڑھی۔ "تم کیسے میرے غریب خانے پر تشریف لے آئی ہو؟" اس نے نجف کے بعد بازو پھیلاتے اسے قریب کیا۔

"تم اسے غریب خانہ کہتی ہو؟ بہت ناشکری ہو پھر تو..."
نجف نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی اور کلینک کے نرم چمڑے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ ایک طرف رکھا۔
"یقین نہیں ہو رہا کہ تم آئی ہو۔" سارہ اسٹھیٹو سکوپ اتارتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے نجف کو دیکھا۔ بالوں کو سختی سے باندھا گیا تھا۔ چہرہ شفاف تھا مگر آنکھوں کے گرد ہلکے حلقے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کئی راتوں سے نہ سوئی ہو۔ وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی مگر اب مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔
"انسانی مریض دیکھ دیکھ کر گھٹن ہو رہی تھی تو سوچا تمہارے پاس چلی آؤں۔ تمہارے ان بے زبان مریضوں کے بیچ بیٹھ کر شاید میرے دماغ کا شور کچھ کم ہو جائے۔" وہ نفاست سے مسکرائی۔ عنابی رنگ کا سوٹ اس پر جچ رہا تھا۔

"تم ٹھیک نہیں ہو۔ ہے نا؟"

سارہ گہری نظروں سے نجف کا جائزہ لے چکی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے پیچھے چھپے کرب کو پڑھ سکتی تھی۔ اس نے اسسٹنٹ کو دو کپ چائے لانے کا اشارہ کیا اور خود نجف کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" نجف کے صفائی دینے پر سارہ نے سر ہلا کر بات کا رخ بدل دیا۔
"تمہیں پتا ہے آج کلینک میں اتنی مچھ مچھ ہے کہ مُجھے خود اپنے لیے وقت نہیں مل رہا۔ ابھی صبح ایک جرمن شیفرڈ آیا تھا جس نے پورے کلینک کو سر پر اٹھا رکھا تھا اور اب یہ بلی... خیر تم سناؤ ہسپتال کے کیا حالات ہیں؟" سارہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ نجف اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اسے سن بھی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے سامنے رکھی میز کو گھور رہی تھی۔ گلاس ٹیبل میں اس کا ہلکا سا عکس ابھر رہا تھا۔ عنابی رنگ کا شرٹ ٹراؤزر جس پر کریم رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹے، گہرے شہد رنگوں بالوں کو ہم رنگ کلپ سے باندھے، نجف کو گلاس میں ابھرتا عکس اپنا نہیں کسی اور کا لگا۔
"کیا جھوٹی گواہیوں سے دل پھٹ جایا کرتے ہیں؟" اس نے جیسے سارہ کی بات سنی ہی نہیں۔

"مطلب؟" سارہ الجھی۔

"مُجھے یاد نہیں ہے سارہ مگر کافی عرصے سے اور میں یہ بھی نہیں جانتے کتنے عرصہ ہو گیا ہے مگر ایک جملہ ہے...ایک جملہ جس نے میرا سکون چھین لیا ہے۔" وہ کھوئی کھوئی سی کہہ رہی تھی۔ ساری سنجیدگی سے اسے سنتی رہی۔

"اور جھوٹی گواہیوں سے دل پھٹ جایا کرتے ہیں۔" نجف نے زیرلب دہرایا اور پھر چہرہ اٹھا کر سارہ کو دیکھا۔

" کچھ جملے بہت ظالم ہوتے ہیں سارہ... مُجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اردگرد کا پورا معاشرہ ہی ایک جھوٹی گواہی پر کھڑا ہے جہاں سچ دم توڑ رہا ہے۔"

اس سے پہلے سارہ کچھ کہتی، اسی لمحے اسسٹنٹ چائے کی ٹرے رکھ گئی۔ سارہ نے ایک کپ نجف کی طرف بڑھایا۔

" کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ کچھ چیزیں ہمارے ذہن میں پھنس جاتی ہیں اور پھر بے چین کیے رکھتی ہیں۔ تم خود کو ہلکان مت کرو۔"

چائے کا ایک گھونٹ لے کر سارہ عام لہجے میں کہا۔

"میں جاننا چاہتی ہوں۔" نجف نے دھیرے سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

" کیا؟"

"یہی کہ میرے اندر دھڑکتا دل کس کا ہے؟"

بھیانک سی خاموشی چھا گئی۔ سارہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ نجف نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا اور گلاس ڈور سے باہر دیکھنے لگی۔ موسم ابرآلود تھا۔ بہت عرصے بعد شہر میں بارش کا سماں ہوا تھا۔

"اسکی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک فضول خواہش ہے۔" سارہ نے اس کی تائید نہیں کی۔

"تم فطری بھی کہہ سکتی ہو۔ یہ فطری خواہش ہے۔"

سارہ نے دوسرا گھونٹ بھرا اور پھر گفتگوی کا رخ بدل دیا۔

"تم شادی کب کر رہی ہو؟"

نجف نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے لگاتے روک دیا اور چونک کر اسے دیکھا۔

"فی الوقت میں مزاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ خفا ہوئی۔

"یہ مزاق نہیں حقیقت ہے۔ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔" میری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں، میں ہنستی کھیلتی گھریلو اور پروفیشنل زندگی گزار رہی ہوں ور تم اب تک اسی ایک دائرے میں گھوم رہی ہو۔ آخر کب تک غیر شادی شدہ رہو گی؟ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھو اور سیٹل ہو جاؤ۔"

نجف نے منہ پھیر لیا۔ "مُجھے ان چکروں میں نہیں پڑنا سارہ! میں اپنی اس ادھار کی زندگی اور اپنے کام سے خوش ہوں۔" لیکن ساری جانتی تھی بات صرف اتنی نہیں تھی۔

سارہ نے آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھا پھر کپ میز پر رکھا، آگے کو جھکی اور نجف کے چہرے پر نظری جمائے ایک غیر متوقع سوال پوچھا۔

" کیا تم اب بھی سقراط کو پسند کرتی ہو؟ کیا تم اس کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی ہو؟"

سقراط کا نام سنتے ہی نجف کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا، ہاتھ میں پکڑا کپ ہلکا سا لرزا۔ یوں لگا جیسے کسی نے سقراط کا نام لے کر اس کے حلق میں زہر انڈیل دیا ہو۔

" کیا بکواس ہے یہ؟" نجف نے کپ کو میز پر اتنے زور سے پٹخا کہ چائے کی چند بوندیں باہر چھلک گئیں۔

"تم جانتی ہو مجھے اس شخص سے، اس کے نام سے اور ان لایعنی باتوں سے شدید چڑ ہے۔ تم ایسی بات کیسے کر سکتی ہو؟" وہ خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جبڑے بھنچ چکے تھے۔ سارہ کو پل بھر کے لیے افسوس ہو مگر وہ نجف کا یہ شدید ردعمل دیکھ کر ہولے سے مسکرادی۔ وہ نجف کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"اگر ایسا نہیں ہے نجف! اگر تم واقعی اس سے نفرت کرتی ہو یا وہ تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا...تو پھر تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟" سارہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ " آنٹی بتا رہی تھیں جب بھی کوئی تمہارے لیے رشتہ آتا ہے، تم کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے مسترد کر دیتی ہو۔ اگر تمہارے دل میں کوئی نہیں ہے تو وہ جگہ خالی کیوں نہیں ہوتی؟ تم کسی دوسرے انسان کو اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت کیوں نہیں دیتیں؟"

"دل؟ میرے پاس میرا دل ہے ہی کب؟ میرا دل بدلے ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔" اسکا لہجہ روکھا سا تھا۔

"دل بدل جانے سے کیا یادیں بدل جاتی ہیں؟"

نجف نے تڑپ کر سارہ کو طرف دیکھا۔ مسئلہ بھی تو سارا یہی تھا۔ کاش یادیں بدل جاتیں...کاش!

"سائنس کہتی ہے کہ دل صرف ایک پمپ ہے جس کا کام پورے جسم میں خون کی ترسیل کرنا ہے۔ جذبات، احساسات اور یادیں تو دماغ کا حصہ ہوتی ہیں۔ لیکن پھر ایسا کیوں ہے کہ جب یہ نیا دل میرے سینے میں دھڑکتا ہے تو مجھے ان چیزوں کا احساس ہوتا ہے جو دس سال پہلے ختم ہو چکی تھیں۔ مجھے وہ چہرے، وہ باتیں، وہ اداسی کیوں تڑپاتی ہے جو میری ہے ہی نہیں؟"

سارہ نے خاموشی سے اسے بولنے دیا۔

"دل بدل گیا، خون بدل گیا، میری زندگی بدل گئی..مگر کچھ یادیں اس نئے دل کے اندر ایسے جڑ پکڑ چکی ہیں جیسے وہ اس گوشت کے لوتھڑے کی اپنی جائیداد ہوں۔ کاش...کاش دنیا میں دماغ بدلنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا، سارہ! کاش کوئی ایسی سرجری ہوتی کہ انسان اپنے پرانے دماغ کو، اپنی یادوں کے اس پورے غلاظت کے ڈھیر کو نکال کر پھینک سکتا اور ایک بالکل نیا، کورا دماغ لے کر جی سکتا۔"

سارہ اپنی جگہ سے اٹھی اور نجف کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے نجف کا ہاتھ تھامتے ہوئے ہولے سے تھپتھپایا۔

" نجف، اسے سیلولر میموری کہتے ہیں۔ کچھ سائنسدانوں کا ماننا ہے کہ انسانی خلیات کے اندر بھی اپنی ایک یادداشت ہوتی ہے خصوصاً دل کے خلیات میں۔ لیکن تم ایک ڈاکٹر ہو۔ تمہیں ان وہموں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ جو گزر گیا، وہ گزر گیا۔"

" یہ وہم نہیں ہے سارہ، یہ میرا عذاب ہے۔" نجف نے اپنا ہاتھ ہولے سے اسکے ہاتھ سے نکال لیا۔ سارہ نے محسوس کیا مگر کہا کچھ نہیں۔

نجف واقعی بدل چکی تھی۔ دس سالوں میں دو حادثے اور دو صرف حادثوں نے نجف بزدار کو ایک بالکل ہی مختلف انسان بنادیا تھا۔ سارہ نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا۔

"ہسپتال میں آج کل کیا چل رہا ہے؟ میں نے وہ نرس کی نااہلی والی خبر دیکھی تھی۔ کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے کیا؟"

نجف نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اس کا چہرہ ایک دم پیشہ ورانہ حد تک سنجیدہ اور سخت ہو گیا۔

"ہاں... ایک بہت ہی ہولناک اور دل دہلا دینے والا کیس آیا تھا۔ ایک بیس سالہ لڑکی ہے جو بدقسمتی سے ایک انتہائی وحشیانہ جنسی تشدد کا شکار ہوئی ہے۔" نجف کی آواز میں ایک گہرا کرب تھا زہر کی طرح پھیلا ہوا۔ "اس کا پورا جسم تو زخمی ہے کہ مگر اس کا ذہن... اس کا ذہن اس وقت مکمل طور پر ایک اندھیری کوٹھڑی میں قید ہو چکا ہے۔ وہ شدید صدمے میں ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے اس نے ایک لفظ نہیں بولا۔ وہ صرف دیوار کو گھورتی رہتی ہے اور اگر کوئی میل نرس یا ڈاکٹر اس کے قریب جاتا ہے تو وہ خوف سے چیخنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر ماہر نفسیات کئی گھنٹوں سے اس کے ساتھ بیٹھی رہیں، اس کے اندر کے اس لاک کو توڑنے کی کوشش کرتی رہی ہیں مگر اس کا خوف اتنا گہرا ہے کہ ان کی تمام تھراپیز ناکام ہو رہی ہیں۔"

سارہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یا اللہ! عورتوں کے ساتھ یہ درندگی کب ختم ہوگی؟ ان درندوں کو سخت سزا کیوں نہیں ملتی؟"

"سزا تو تب ملے گی نا جب نظام انصاف ٹھیک ہوگا۔" نجف نے تلخی سے کہا۔

"اور اس المیے پر مستزاد یہ کہ آج کل کی میڈیا انڈسٹری اس انسانی درد کو بھی ایک تماشہ بنانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ نشاط پچھلے کئی دن سے گھر کے چکر لگا رہی ہے، ہسپتال بھی آئی تھی۔ اس نے صباء کی ماں کو پیسے کا لالچ بھی دیا، وہ صباء کو اپنے اگلے لائیو شو پر بلانا چاہتی ہے۔"

"ایک ایسی لڑکی کو جو ابھی اس صدمے سے باہر بھی نہیں آئی وہ اسے ٹی وی پر لا کر اس کا تماشہ بنانا چاہتی ہے؟" سارہ کو افسوس ہوا۔ نجف نے گہری سانس لی۔

"نشاط کا کہنا ہے کہ وہ صباء کو انصاف دلانا چاہتی ہے۔ وہ اسے ایک مظلوم کی آواز بنا کر پیش کرے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے صباء کے درد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے شو کے لیے ریٹنگز چاہئیں، اسے وہ سنسنی چاہیے جو اس کے چینل کو نمبرون بنا سکے۔"

"اور تم نے کیا فیصلہ کیا؟" سارہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے نجف کی بے چینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا پریشر، خاندان کا پریشر ہوگا ہے۔ جو انسان سے ایسے ایسے کام کروالیتا جس کا وہ سوچتا بھی نہیں ہے۔

"میں اسے میڈیا کے گدھوں کے سامنے نوچنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی۔"

سارہ نے نجف کی طرف انتہائی فخر اور محبت سے دیکھا۔

"تم ایک بہترین ڈاکٹر ہو نجف! تمہارا دل چاہے تمہارا اپنا ہے یا کسی اور کا... یہ بہت خوبصورت اور مضبوط ہے۔ تم صباء کو بچا لوگی، مُجھے تم پر

پورا یقین ہے۔"
نجف نے سارہ کی بات پر ایک گہرا اور پرسکون سانس لیا۔کلینک کے اندرونی چیمبر سے اسسٹنٹ نے دوبارہ سارہ کو آواز دی،شاید کسی نئے مریض کی آمد تھی۔نرس والی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔
"تم جاؤ سارہ، اپنا کام کرو..." نجف صوفے سے کھڑی ہوئی اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔"تم سے بات کرکے میرے دماغ کا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا ہے۔"
"اور شادی کا کیا فیصلہ ہے؟" سارہ نے اٹھتے ہوئے ایک بار پھر شرارت سے پوچھا۔
نجف نے مسکرا کر اسے الوداعی گھوری سے نوازا اور کلینک کے شیشے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
"میں تمہیں فون کروں گی۔ہم جلد کہیں باہر ملیں گے۔" عقب سے سارہ کی آواز ابھری تو نجف نے سر اثبات میں ہلا دیا۔جب وہ باہر نکلی تو بارش سے پہلے کی ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔سردی کا احساس ہوا۔فی الوقت اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔
جب اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک آخری نظر کلینک پر ڈالی تو اسکا دل اب ایک نئی جاندار تھاپ پر دھڑک رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ کہانیاں جو بھی ہوں زندگی کو آگے بڑھنا ہی ہوتا ہے۔اگلے ہی لمحے اس کی گاڑی شاہراہ پر بھاگتی چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

بزدار پیلس کی اوپری منزل پر واقع عالیہ بزدار کا کمرہ آج غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔کھڑکی کا پردہ ہلکا سا سرکا ہوا تھا۔باقی دھیرے دھیرے شام اتر رہی تھی۔عالیہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال خشک کر رہی تھی۔وہ کچھ دیر پہلے سو کر اٹھی تھی اور اب فریش ہونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔اس نے ایک سادہ مگر نفیس سا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔سیاہ آنکھیں بوجھل سی تھیں۔بالوں کو تقریباً آدھا خشک کرنے کے بعد وہ پلٹی اور اس کی نظر میز پہ دھرے ٹیبلٹ پہ پڑی جس کی اسکرین بجھی ہوئی تھی۔اس نے بے دھیانی
میں ٹیب اٹھایا اور جیسے اسکی اسکرین آن ہوئی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔وہاں بے چینی ابھر
آئی۔اسکرین پر اسکا رزلٹ چمک رہا تھا۔اس نے ٹیبلٹ کو رزلٹ والے دن ایسے ہی رکھ چھوڑا تھا۔
صرف چند نمبروں کا فرق!اس کے اور سلال کے درمیان صرف چند نمبروں کا فرق تھا۔یہ فرق اتنا کم تھا کہ اگر کوئی عام طالب علم ہوتا تو پورے میڈیکل کالج میں سیکنڈ پوزیشن آنے کی خوشی میں مٹھائیاں بانٹ رہا ہوتا اور دوستوں کو پارٹیاں دے رہا ہوتا۔مگر عالیہ عام طالب علموں میں سے نہیں تھی۔وہ بزدار اپنے خاندان کی روایتوں اور اپنے باپ کی سخت گیر طبیعت کے تحت صرف ایک ہی ہندسہ پہچانتی تھی اور وہ تھا نمبر ون۔ اس کے لیے پوزیشن ہولڈرز کی فہرست میں دوسرے نمبر پر اپنا نام دیکھنا کسی اعزاز کے بجائے ایک مستقل چبھن بن چکا تھا۔
اس نے ٹیبلٹ واپس پھینک دیا اور کھڑکی کی جانب چلی آئی۔اس نے نیچے وسیع و عریض لان کی طرف دیکھ دیکھا جہاں فوارے کا پانی بے فکری سے اچھل رہا تھا۔اس کا سفید لیب کوٹ کرسی کی پشت پر لاپرواہی سے پڑا تھا اور اسٹڈی ٹیبل پر بکھری گائیٹن، رابنز اور بیلی اینڈ لو کی

ضخیم کتابیں، رنگ برنگے ہائی لائٹرز اور راتوں کو جاگ کر بنائے گئے نوٹس چلا چلا کر بتا رہے تھے کہ اس لڑکی نے گزشتہ پورے سال اپنی زندگی کا ایک ایک پل کس قدر محنت کی نذر کیا تھا۔ اور اس سب کا حاصل کیا تھا؟ صرف دوسری پوزیشن! اسی لمحے کمرے کے بھاری دروازے پر ایک جاندار مگر شائستہ دستک ہوئی۔ عالیہ نے لان سے نظریں ہٹائے بغیر بوجھل آواز میں کہا۔

"آ جاؤ..."

دروازہ کھلا اور ثالث اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا، گہرے سیاہ رنگ کا نفیس اور مخملی گفٹ باکس تھا۔ عالیہ نے جیسے ہی گردن گھما کر دیکھا تو ثالث کو دیکھ کر اسے اچھا لگا۔

"کیا یہ تم ہو؟"

"نہیں میں کوئی اور ہوں۔" ثالث مسکرا کر آگے بڑھا۔ عالیہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"ہاؤ فنی!"

"مجھے معلوم ہے۔" ثالث آہستگی سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔ "یہ لو۔" اس نے ڈبہ عالیہ کی طرف بڑھا دیا۔ عالیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کس خوشی میں؟"

"پوزیشن لینے کی خوشی میں۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"دوسری۔" عالیہ نے لفظ دوسری پر خاص زور دیا۔ لہجہ تلخ تھا۔

ثالث نے ایک لمحہ اسے دیکھا۔

"ہاں، دوسری۔ سینکڑوں میڈیکل سٹوڈنٹس میں دوسری۔"

عالیہ خاموش رہی۔ ثالث نے خود ہی ڈبہ کھول دیا۔ اندر ایک نفیس سلور پین تھا۔

عالیہ نے بے ساختہ اسے اٹھا لیا۔ وہ واقعی نفیس تھا۔

"خوبصورت ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"خود کی تعریف مت کرو۔"

"میں پین کی بات کر رہا تھا۔"

اس بار عالیہ ہنس دی۔ کمرے کا بوجھل ماحول کچھ ہلکا ہو گیا۔ ثالث گرنے والے انداز میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

عالیہ نے پین کو میز پر رکھا اور خود بھی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم ناراض ہو؟" ثالث نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔" عالیہ نے نظریں چرائیں۔

"تم ہو۔"

"ثالث، میں کہہ رہی ہوں نا کہ میں ناراض نہیں ہوں۔" اسکا چہرہ سرخ پڑا۔

"عالیہ! تمہارے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ تم جھوٹ بہت برا بولتی ہو۔"

عالیہ نے زچ ہوکر اپنی آنکھیں گھمائیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"میں ناراض نہیں ہوں ثالث، میں صرف سوچ رہی تھی کہ اگر..."

"اگر تم اس دن پریکٹیکل اور وائیوا کے دوران اس طرح پینک نہ ہوتیں تو؟" ثالث نے اس کی بات اچک لی۔ وہ ایک کہنی پر سر ٹکائے نیم دراز تھا۔ ہلکی نم آنکھوں والی عالیہ اس کے بیٹھی تھی۔ وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی جسے اٹھنے بیٹھنے اور پہننے اوڑھنے کی تمیز منیبہ بیگم نے بچپن سے ہی سکھا رکھی تھی۔ عالیہ خاموش رہی جیسے کسی نے اس کے دکھتے ہوئے زخم پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔ عالیہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ فائنل پریکٹیکل امتحانات سے ٹھیک دو دن پہلے اس پر ایک عجیب سا پرفیکشنزم کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ اسے فرسٹ آنا تھا اور اس آخری مرحلے پر اس کا اعصابی نظام اس دباؤ کو برداشت نہیں کر پایا۔ امتحانات کے ان نازک دنوں میں وہ مسلسل تین راتیں جاگتی رہی تھی۔ کیفین کے بے تحاشا استعمال اور اعصابی تناؤ کی وجہ سے جس دن اس کا فائنل پریکٹیکل اور وائیوا تھا، اس کا دماغ مکمل طور پر جواب دے چکا تھا۔ وائیوا روم کے باہر کھڑے کھڑے اسے اچانک چکر آ گئے تھے، اس کی نظریں دھندلا گئیں اور اس کا بی پی خطرناک حد تک ڈراپ ہو گیا۔ پروفیسرز نے اسے آرام کرنے کا کہا مگر اس حالت میں جب وہ وائیوا ٹیبل پر بیٹھی تو وہ ان چند بنیادی کلینیکل سوالات کے جوابات بھی اس روانی سے نہ دے سکی جو اس کا خاصہ تھے۔ وہ ایک اہم کلینیکل اسیسمنٹ میں چند نمبر گنوا بیٹھی اور وہی چار نمبر آج فائنل ایگریگیٹ میں اس کی پہلی پوزیشن کا خون کر چکے تھے۔ عالیہ نے سر جھکا کر اپنی گود میں رکھے دونوں ہاتھ آپس مسل رہی تھی۔ پھر اس نہایت دھیمی اور ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مُجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا چاہیے تھا، میں اتنی کمزور کیسے پڑ گئی؟"

"نہیں..." ثالث فوراً بولا۔ "تم انسان ہو عالیہ!۔"

"میں نے تیاری پوری نہیں کی تھی۔"

"تم تین دن مسلسل جاگتی رہیں..."

"سلال نے تو سب کچھ کرلیا۔"

"سلال شبگیر ایک اچھا طالب علم ہے۔"

ثالث نے سکون سے جواب دیا۔ "اور تم بھی!"

عالیہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ثالث اٹھ بیٹھا اور سنجیدگی سے بولا۔

"سنو...تم دونوں کے درمیان فرق صرف چند نمبروں کا ہے۔" وہ رکا۔" مگر تمہیں معلوم ہے اصل فرق کیا ہے؟"

" کیا؟" وہ الجھی۔

"سلال نے فرسٹ پوزیشن لی ہے نا؟"

عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ثالث مسکرایا۔

"اور تم اگلے دس سالوں میں ایک بہترین ڈاکٹر کہلاؤ گی۔ڈاکٹر عالیہ بزدار!"

عالیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میڈیسن میں لوگ تمہارا رزلٹ نہیں پوچھتے۔"اس نے آہستگی سے بات جاری رکھی۔

"وہ پوچھتے ہیں کہ مریض تمہارے پاس کیوں آتے ہیں۔وہاں وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ میں کتنی شفا ہے،تمہارا اخلاق کیسا ہے اور مریض تندرست ہوکر تمہارے پاس سے کیوں جا رہے ہیں۔اصل پوزیشن وہاں بنتی ہے۔"

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی مگر یہ خاموشی اب تلخ یا بوجھل نہیں تھی بلکہ حد درجہ پرسکون اور مرہم جیسی تھی۔عالیہ نے ایک نظر میز پر رکھے پین کو دیکھا،جس پر اس کا نام چمک رہا تھا۔اس نے پین اٹھا لیا۔

"ثالث!تم مجھ سے پورے ایک سال چھوٹے ہو۔"

"ریکارڈ کے مطابق تو جی،ایسا ہی ہے۔" ثالث نے معصومیت سے گردن ہلائی۔

"پھر تم کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے پچاس سال کے بوڑھے کیوں لگتے ہو؟ یہ اتنی فلاسفی لاتے کہاں سے ہو؟"

ثالث زور سے ہنسا۔"بس کیا کریں یہ بزدار خاندان کا خاندانی نقص ہے،ہم پیدا ہی میچور ہوتے ہیں۔"

اس بار عالیہ بھی ہنس دی۔پچھلے کئی دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ دل سے ہنس رہی تھی۔اس کا چہرہ اب بالکل پرسکون ہو چکا تھا اور دوسری پوزیشن کا وہ جن بھوت اس کے سر سے افی الوقت تر گیا۔ثالث بیڈ سے

اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی شرٹ کو درست کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔جیسے ہی اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا،وہ اچانک رکا اور مڑ کر عالیہ کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھا۔

"اور ہاں ڈاکٹر صاحبہ!"

عالیہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ثالث نے اپنے چہرے پر دنیا بھر کی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"اگلی بار جب امتحان کے خوف سے وائیوا روم کے باہر غش کھا کر گرنا ہو نا تو مہربانی فرما کر پہلے کچھ کھا پی لینا۔"

"ثالث..." عالیہ نے میز پر رکھا ہوا ایک نوٹ پیڈ اٹھا کر اسے دے مارا جسے وہ مہارت سے کیچ کر چکا تھا۔

"میں بالکل سنجیدہ ہوں،خالی پیٹ پوزیشنیں نہیں آتیں۔" وہ نوٹ پیڈ لیے میز کی طرف آیا۔

"تم نکلو میرے کمرے سے ابھی کے ابھی!" وہ خفگی سے بولی۔

"جی بہتر ڈاکٹر صاحبہ! اپنا خیال رکھیے گا۔" ثالث نے نوٹ پیڈ واپس میز پر رکھتے ہوئے ایک ادائے تعظیم کے ساتھ الوداعی سلام کیا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور پیچھے عالیہ مسکرائے بنا نہیں رہ پائی۔ اسے پل بھر کو وہ دن یاد آیا جب وہ بے ہوش ہوئی تھی۔ کیا ہوا تھا اس دن؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی اور پھر ایک مبہم سا چہرہ اس کے تصور کے پردے پر لہرایا۔

"عالیہ آر یو اوکے؟" سلال اس پر جھکا اسکا گال تھپتھپا رہا تھا۔ عالیہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیا سلال واقعی؟" اسے حیرت ہوئی۔ آخر اس نے پہلے کیوں نہیں سوچا تھا؟ "نہیں یہ میرا وہم ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔ وہ اس دن کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆

شبگیر ہاؤس کا اوپری پورشن ایک کمرہ اس وقت روشن تھا۔ کمرے کی دیواریں ہلکے Ivory کے رنگ کی تھیں جن پر میڈیکل سائنس کے معلوماتی چارٹس اور ہمالیہ کے پہاڑوں کی چند بلیک اینڈ وائٹ تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک بڑے سے میز پر اس وقت Bailey & Love's Short Practice of Surgery کی ضخیم کتاب کھلی ہوئی تھی جس کے صفحات پر مارکر کے نیلے اور پیلے نشانات سلال کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ سلال اس وقت پڑھائی میں غرق نظر آتا تھا۔ پہلی پوزیشن حاصل کرنے کا خمار اس کے چہرے پر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بجائے وہ ایک محنتی طالب علم کی طرح آنے والے فائنل ایر کے چیلنجز کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی تھی اور کتابوں کے نئے اور پرانے کاغذوں کی ملی جلی بو رچی ہوئی تھی۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ بغیر کسی آواز کے کھلا۔ سقراط اپنے مخصوص نیم لاپرواحلیے میں کھڑا تھا۔ اس کے گھنے بال آدھے جوڑے میں قید تھے جبکہ آدھے پیچھے گردن کو چھو رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا اور جیسے ہی اس نے سلال کے کمرے کا دروازہ نیم کھلا دیکھا تو اس جانب آ گیا۔

"ابھی تو تم فرسٹ آئے ہو۔ اتنی جلدی پھر پڑھائی شروع؟"

سقراط کی رعب دار مگر دھیمی آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور وہ دروازے کی ٹیک لگائے سلال کو دیکھ رہا تھا۔ سلال نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا چاچو یار! بنا آہٹ کیے کیسے آجاتے ہیں آپ؟ چور لگتے ہیں۔"

سقراط آہستگی سے چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آیا اور میز کے کونے پر ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھنے کے روایتی اصولوں سے آزاد تھا۔

"مُجھے لگا تھا پوزیشن ہولڈر ابھی تک جیت کا جشن منا رہا ہو گا مگر یہاں تو بساط دوبارہ بچھی ہوئی ہے۔"

"چاچو! کامیابی کے بعد کام چوری اچھی نہیں ہوتی۔ اور پھر میری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ یہاں ہر روز پڑھنا لازمی ہے۔"

سقراط نے گہری نظروں سے سلال کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مگر فخر سے بھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"عام طور پر لوگ ایک پوزیشن کے بعد مہینوں اس کا ڈھول پیٹتے ہیں اور ایک تم ہو کہ رزلٹ آئے چند دن نہیں ہوئے اور سرجری کی کتابیں

کھول کر بیٹھ گئے۔"

"ڈھول پیٹنے سے علم نہیں بڑھتا چاچو!" سلال نے مسکرا کر جواب دیا۔"اور پھر پوزیشن تو عارضی ہوتی ہے۔اصل چیز وہ مہارت ہے جو کل کو کسی مریض کی جان بچانے کے کام آئے۔اگر میں نے آج صرف آرام کیا تو کل وارڈ میں کسی سینئر کے سوال کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔"

سقراط نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔سلال نے میز پر رکھا پانی کا گلاس سقراط کی طرف بڑھایا جسے سقراط نے خاموشی سے قبول کر لیا۔سلال نے ماحول کو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بتائیں...آپ کے کالج کا کیا حال ہے؟ آپ کی کوچنگ کیسی چل رہی ہے؟"

سقراط نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے ایک ڈرامائی سانس خارج کیا۔اس کی آنکھوں میں جاندار اور چیلیجنگ چمک ابھر آئی۔

"ہاکی ٹیم کو قابو کرنا آسان نہیں ہے۔" سقراط نے اپنی جیکٹ کی آستین کو تھوڑا اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔" کالج کے وہ لڑکے کھلاڑی کم اور آوارہ گرد زیادہ ہیں۔ ہر ایک کے اندر اپنی ایک الگ انا ہے،کوئی کسی
کے قابو میں نہیں آتا۔جب میں نے پہلے دن گراؤنڈ میں قدم رکھا تو وہ مُجھے کوئی ڈنڈا پیر استاد سمجھ کر نظر انداز کر رہے تھے بلکہ کر رہے ہیں۔"

"پھر؟ آپ نے انہیں کیسے سنبھالا؟" سلال نے دلچسپی سے پوچھا۔وہ جانتا تھا کہ سقراط کے پاس ہر مسئلے کا ایک انوکھا اور نفسیاتی حل ہوتا تھا۔گھنٹہ بھر پہلے اسٹوڈنٹس کی ہوئی درگت کو یاد کرتے سقراط دھیمے سے مسکرایا۔

"میں نے پہلے دن کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کی،نہ ہی ڈسپلن کا درس دیا۔میں نے صرف ہاکی اٹھائی اور ان کے سب سے بہترین اسٹرائیکر کو چیلنج کر دیا۔میں نے کہا اگر تم مجھ سے بال چھین لو تو جو تم کہو گے میں مانوں گا ورنہ گراؤنڈ کے چکر..."

"اور پھر؟" سلال کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"پھر کیا ہونا تھا...انہوں نے پندرہ منٹ تک پورا زور لگا لیا مگر گیند میرے قابو سے باہر نہیں گئی۔"

" کیا چاچو بچوں پہ ظلم کر رہے ہیں..." سلال مصنوعی تاسف سے بولا۔(کیا کہنے اُن معصوم بچوں کے جو کوچ پہ ہی حملہ کرتے ہوں۔)

"ٹیم کو قابو کرنا مشکل ضرور ہے مگر میں انہیں سیدھا کر لوں گا۔وہ جتنے سرکش ہیں، مُجھے انہیں موڑنے میں اتنا ہی مزہ آ رہا ہے۔جب تک ان کی انا نہیں ٹوٹے گی تب تک ان کا اصل ٹیلنٹ باہر نہیں نکلے گا۔"

"یعنی عظیم بننے کے لیے ٹوٹنا پڑتا ہے؟" سلال نے سوالیہ نظروں سے سقراط کو دیکھا۔وہ غور سے اس کے چہرے ایک ایک نقش کو دیکھ رہا تھا۔شاید وہ اپنا دس سال بعد خاکہ بنا رہا تھا۔کیا وہ دس سال بعد واقعی سقراط شبگیر جیسا دکھتا؟

" کسی حد تک..."

"مُجھے پورا یقین ہے۔آپ کی نگرانی میں وہ ٹیم اس سال ٹرافی ضرور جیتے گی۔" سلال نے دل سے کہا۔سقراط میز سے تھوڑا پیچھے ہٹا اور سلال

کے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا۔

"ٹرافی تو وہ جیت ہی جائیں گے سلال لیکن تمہاری یہ جو فائنل ایئر کی ٹرافی ہے نا، یہ سب سے اہم ہے۔تمہارے حریف اس بار اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہیں نیچے کھینچنے کی کوشش کریں گے۔"

حریف کا نام سنتے ہی سلال کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے گہری سنجیدگی ابھری مگر اس نے بڑے وقار سے سر ہلایا۔

"وہ ایک بہترین مد مقابل ہے چاچو! اور ایک اچھے حریف کی موجودگی ہی آپ کو کبھی سست پڑنے نہیں دیتی۔ میں اپنے حریف کا پورا احترام کرتا ہوں مگر میں اپنی پوزیشن کا دفاع کرنا بھی جانتا ہوں۔" وہ کچھ زیادہ ہی مثبت انسان تھا۔سقراط نے کوفت سے آنکھیں گھمائیں۔ چچ چچ چچ مزہ نہیں آیا۔

"تمہاری اچھائی دیکھ کر یقین نہیں ہوتا کہ تم سقراط شبگیر کے بھتیجے ہو۔"

سلال بے ساختہ ہنس دیا۔

"لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ میں آپکا ہی بھتیجا ہوں۔"

سقراط نے ایک نظر گہری اس پر ڈالی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا، دروازہ اسی طرح بغیر کسی آواز کے بند ہو گیا۔سلال نے ایک گہرا سانس لیا۔سقراط سے ہونے والی اس مختصر گفتگو نے اسے کافی فریش کر دیا تھا۔اس نے سرجری کی کتاب پر دوبارہ نظریں جمائیں اور شبگیر ہاؤس کا وہ بالائی پورشن ایک بار پھر عزم اور رات کے گہرے سکوت کے سحر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆☆☆

بزدار پیلس کی اوپری منزل پر واقع امجد بزدار کا شاہی بیڈروم اپنی تزئین و آرائش میں ان کے جلال کا عکاس تھا۔کمرے میں بڑا سا بیڈ، گہرے مخملی پردے اور مدہم لائٹس ایک شاہانہ مگر بھاری فضا پیدا کر رہے تھے۔امجد بزدار اس وقت بیڈ کے سرہانے لگے بھاری کشنز سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔پچھتر کی دہائی میں ہونے کے باوجود انہوں نے خود کو کافی سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ان کے ہاتھ میں انٹرنیشنل میڈیکل میگزین کا تازہ شمارہ تھا جس کے صفحات وہ بڑی باقاعدگی سے پلٹ رہے تھے۔بیڈ کے دائیں جانب موجود اطالوی شیشے کے بنے بڑے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نیلوفر بیگم کھڑی تھیں۔وہ امجد بزدار سے عمر میں پورے بیس سال چھوٹی تھیں اور اس وقت شب خوابی کے ریشمی لباس میں آئینے کے سامنے رکھی مہنگی بوتلوں سے لوشن نکال کر اپنے گورے ہاتھوں اور انگلیوں کو آہستہ آہستہ موئسچرائز کر رہی تھیں۔ان کی نظریں لوشن لگانے کے بہانے کن انکھیوں سے آئینے میں نظر آتے امجد بزدار کے عکس پر جمی ہوئی تھیں۔وہ ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ہاسپٹل میں کچھ ہوا ہے کیا؟" نیلوفر بیگم کی دھیمی مگر گہری آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔امجد بزدار نے میگزین سے نظریں ہٹائے بغیر

نہایت آرام سے اگلا صفحہ پلٹا اور پوچھا۔

"نہیں... کچھ ہونا تھا؟"

"نہیں..." نیلوفر بیگم نے اپنے بائیں کلائی میں پہنے نازک مگر قیمتی کنگن کو تھوڑا اوپر سرکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں آج کل سب بہت مصروف رہتے ہیں۔حق بھی کم ہی نظر آتا ہے اور نجف بھی۔"

"ہسپتال کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔"

اس جملے کے بعد کمرے میں کچھ دیر کے لیے ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔نیلوفر بیگم نے لوشن کی بوتل بند کی اور اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا۔

" گھر میں سب ٹھیک ہے؟" اس بار پوچھنے کی باری امجد بزدار کی تھی۔ان کی باریک بین نظریں میگزین پر تھیں مگر آواز میں گرفت سی تھی۔

اس اچانک سوال پر نیلوفر بیگم کی دل کی دھڑکن یکدم تیز ہوئی۔انہوں نے آئینے کے سامنے سے قدم ہٹائے اور خود کو پرسکون ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب؟"

امجد بزدار نے اب میگزین کو تھوڑا نیچے کیا اور اپنی گہری نظریں نیلوفر بیگم کے چہرے پر جما دیں۔"مطلب یہ کہ نشاط کافی دنوں سے رات کے کھانے پر نظر نہیں آئی اور نجف تو ہسپتال کے علاوہ کہیں نظر ہی نہیں آتی۔"

امجد بزدار اگرچہ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے گھر میں کم کم ہی ہوتے تھے مگر ان کا مشاہدہ اور اپنے بچوں پر نظر رکھنے کا انداز کافی گہرا اور ہولناک حد تک درست تھا۔گھر کا کوئی بھی پتا ان کی مرضی یا علم کے بغیر نہیں ہل سکتا تھا۔

نیلوفر بیگم نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔وہ سمجھ گئیں کہ اب بات چھپانا ممکن نہیں ہے۔وہ آہستگی سے چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آئیں اور اس کے ایک کونے پر ٹک گئیں۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ نشاط اپنے نئے لائیو شو کے لیے کسی جنسی تشدد کی شکار لڑکی،صباء کو بلانا چاہتی ہے۔" نیلوفر نے دھیمے لہجے میں اپنی جڑواں بیٹیوں کا تنازعہ کھولا۔"جبکہ نجف اس کی سخت مخالفت کر رہی ہے اور کسی صورت اس میڈیا ٹرائل کی اجازت نہیں دے رہی۔دونوں اسی بات پر اڑی ہوئی ہیں۔"

امجد بزدار نے ایک لمحہ نیلوفر کو دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے میگزین بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ان کے چہرے پر شدید سنجیدگی اور ناگواری ابھر آئی۔

"نشاط آج بھی بے وقوف ہے۔" وہ انتہائی سرد اور نپے تلے لہجے میں گویا ہوئے۔ "وہ ریٹنگز کے چکر میں یہ بھول رہی ہے کہ وہ کس خاندان کی بیٹی ہے۔ ہمارے ہی ہسپتال کے کیس کو سڑک پر لا کر تماشہ بنانا ہماری ساکھ کے لیے بھی اچھا نہیں ہے۔"

"میں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" نیلوفر بیگم نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا، "مگر آپ تو جانتے ہیں وہ اپنے فیصلوں میں کتنی ضدی ہے۔ اور دوسری طرف نجف بھی تو ضد لگا کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ تو اب بات بھی نہیں کرتی۔ سچ کہوں تو امجد... نجف بہت بدل گئی ہے۔ مُجھے اب اس لڑکی کی سمجھ ہی نہیں آتی۔"

امجد بزدار کے چہرے کے عضلات سخت ہوئے۔ انہوں نے نیلوفر کی طرف دیکھا اور ان کی آواز میں ایسی سرد پن تھا کہ نیلوفر کو کمرے کا درجہ حرارت گرتا ہوا محسوس ہوا۔

"اس کا دل بدلا ہے نیلوفر! اس کا بدل جانا فطری ہے۔"

وہ یہ سن کر چند لمحوں کے لیے لاجواب ہوگئیں مگر پھر ہمت کر کے گویا ہوئیں۔

"میں مانتی ہوں امجد..." انہوں نے بلاوجہ بیڈ کی چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے دھیمے سے کہا، "دل بدلنے سے انسان کی صحت بدلتی ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی دوسری روح بن گئی ہو۔ وہ ہم میں رہ کر بھی ہم جیسی نہیں رہی۔ مُجھے ڈر ہے کہ ان دونوں بہنوں کی یہ سرد جنگ کسی نئے تنازعے کو جنم نہ دے دے۔"

امجد بزدار نے اپنے مضبوط ہاتھ کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیا اور حتمی انداز میں بولے۔

"اس خاندان میں کسی تنازعے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نشاط کو بولو کہ اپنے شو کے لیے کوئی اور سنسنی خیز موضوع ڈھونڈے۔ نجف اپنے میڈیکل اتھکس کے مطابق ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ایک ڈاکٹر کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ لیکن..." وہ رکے اور ان کی آنکھیں مزید گہری ہوگئیں، "نجف کو بھی اپنی اس حد سے بڑھی ہوئی خاموشی اور گوشہ نشینی کو ختم کرنا ہوگا۔ وہ اس گھر کی بیٹی ہے، کوئی مہمان نہیں جو ہر وقت اپنے کمرے میں مقید رہے۔"

"میں کل ہی ان دونوں سے علیحدگی میں بات کرتی ہوں۔" نیلوفر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کیونکہ امجد بزدار کا فیصلہ ہمیشہ ان کے لیے آخری لکیر ہوتا تھا۔

"صرف بات نہیں کرنی نیلوفر! انہیں یاد دلانا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔" امجد بزدار نے بیڈ کا لیمپ آف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ زرد روشنی بجھتے ہی کمرے میں نائٹ بلب کا نیلا اور گہرا سایہ پھیل گیا۔ "بزدار خاندان کی بیٹیاں سڑکوں پر تماشہ بنتی ہیں اور نہ ہی کمزور پڑ کر کمروں میں چھپتی ہیں۔ اب سو جاؤ،
کل مُجھے صبح جلدی ایک اہم میٹنگ کے لیے نکلنا ہے۔"

نیلوفر بیگم خاموشی سے بیڈ کی دوسری طرف لیٹ گئیں مگر نیلے اندھیرے میں کھلی ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ نجف اور نشاط کا یہ ٹکراؤ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔آخر یہ کس مصیبت میں ڈال دیا تھا انہوں نے؟

☆☆☆☆☆

پچھلے دو دن سے ہونے والی ہلکی ہلکی بارش نے شہر کی سڑکوں پر ایک خنک سی اداسی بچھا دی تھی۔موسم مزید سرد ہو گیا تھا۔سڑک پر ٹریفک معمول سے کم تھی اور گاڑیوں کے ٹائروں سے اڑنے والی پانی کی پھواریں ایک عجیب سا ردھم پیدا کر رہی تھیں۔نجف اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی، ونڈ سکرین پر چلتے وائپرز کو بے خیالی سے دیکھ رہی تھی۔وہ ہمیشہ کی طرح محتاط اور دھیان سے ڈرائیو کر رہی تھی۔اس کا چہرہ پرسکون تھا اور گاڑی میں ہلکی سی دھن چل رہی تھی۔وہ ہاسپٹل جا رہی تھی۔

گاڑی ایک سنسان اور قدرے اندھیرے موڑ کے قریب پہنچی۔اچانک سڑک کے بائیں کنارے سے ایک آوارہ کتا بارش سے بچنے کے لیے بدحواسی میں بھاگتا ہوا عین گاڑی کے سامنے آ گیا۔نجف کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں،اس کے اندر اٹھنے والے اضطراب نے اسے بریک پر زور سے پاؤں مارنے اور اسٹیئرنگ وہیل کو دائیں جانب پوری طاقت سے گھمانے پر مجبور کر دیا۔گاڑی کے ٹائر گیلی سڑک پر خوفناک آواز کے ساتھ رگڑ کھا کر پھسلے۔گاڑی نے کتے کو تو بچا لیا مگر موڑ کے بالکل دوسری طرف سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار اور بھاری موٹر سائیکل سیدھی گاڑی کے بونٹ اور سائیڈ فینڈر سے آ ٹکرائی۔یوں کہنا جائز ہو گا کہ گاڑی موٹر سائیکل سے بے طرح ٹکرائی تھی۔لوہے کے آپس میں ٹکرانے کی ہولناک آواز،شیشے کے ٹوٹنے کی جھنکار اور رگڑ کھاتی ہوئی موٹر سائیکل کی چنگاریاں...یہ سب ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں ہوا۔موٹر سائیکل سوار ٹکرانے کی شدت سے ہوا میں اچھلا اور کچھ فاصلے پر جا کر گیلی سڑک پر گرا جبکہ موٹر سائیکل رگڑ کھاتی ہوئی دور جا کر رک گئی۔نجف کی گاڑی کا انجن بند ہو چکا تھا۔وہ ڈرائیونگ سیٹ پر جم سی گئی تھی۔اس کا سانس سینے میں اٹک گیا تھا اور اس کا وہ دل اس کے اپنے سینے کی پسلیاں توڑنے پر تیار تھا۔وہ بھاگی نہیں تھی مگر صدمے نے اسے چند سیکنڈز کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا تھا؟وہ گاڑی سے اترنا چاہتی تھی مگر جیسے ٹانگیں جواب دے گئیں۔اس نے ایک شخص کو اپنی گاڑی سے اڑا دیا تھا۔اردگرد سے گزرنے والی چند موٹر سائیکل سوار اور راہگیر فوراً رک گئے۔لوگ بھاگ کر اس موٹر سائیکل سوار کی طرف جا رہے تھے جو گیلی سڑک پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"ارے اٹھاؤ اسے!"

لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر نجف شاک کی حالت میں اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے پکڑے،ہونٹ بھینچے باہر دیکھ رہی تھی۔چند افراد اس کی گاڑی کی طرف بھی بڑھے۔

"چھوڑو مجھے...میں ٹھیک ہوں۔"

ہجوم کو ہٹاتا ہوا وہ شخص خود ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کی لیدر جیکٹ کندھے سے پھٹ چکی تھی اور ماتھے پر ایک گہرا کٹ لگا تھا جہاں سے خون بہہ کر بارش کے پانی کے ساتھ اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔ ہاتھ زخمی ہوئے تھے اور گھٹنے بھی۔

"وہ دیکھو گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔" اس شخص کی سماعت سے کسی کی آواز ٹکرائی۔ اپنی روٹی ہوئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر وہ شخص غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ جبڑے بھینچے لنگڑاتا ہوا بھاری قدموں سے نجف کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ لوگ اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کی آنکھوں کی وحشت دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔

نجف کی نظر اپنی جانب قدم بڑھاتے شخص پر پڑی اور اسکا سانس پل بھر کے لیے رک سا گیا۔ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی سی ابر آئی۔

"سقراط شبگیر ..." اس کی تمام حسیات چلا اٹھیں۔ ہاں وہ وہی تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی؟ وہ اس شخص کو مر کر بھی نہیں بھول سکتی تھی۔

"باہر نکلو.... "وہ ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے پاس پہنچا۔ وہ اندر بیٹھے شخص کو باہر نکلنے کا کہہ رہا تھا۔ بارش اچانک تیز ہو گئی۔ سقراط کا سر چکرا رہا اور گلاس ونڈو پہ بہتا پانی اسے اندر بیٹھے شخص کو دیکھنے سے بچا رہا تھا۔ اس نے کئی بار دستک دی۔ دو چار لوگ مزید آ گئے مگر اندر بیٹھی نجف جیسے سن تھی۔ سقراط نے بند شیشے کو توڑنے اور اندر بیٹھے لاپرواہ ڈرائیور کا گریبان پکڑنے کے لیے پوری طاقت سے اپنا مکا ہوا میں بلند کیا۔ نجف جواب تک خوف سے شیشے کے پار دیکھ رہی تھی اس نے بٹن دبایا اور گاڑی کا شیشہ نیچے ہوتا چلا گیا۔ اور پھر... سقراط کی نظر اندر بیٹھے وجود پر پڑی۔ اس کا ہوا میں بلند ہوتا ہوا مکا یکدم وہیں کا وہیں معلق ہو گیا۔ چہرہ جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا، ایک ہی پل میں فق پڑ گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ اردگرد کھڑے لوگوں کا شور، گاڑیوں کے ہارن، ہوا کی سائیں سائیں... سب غائب ہو گیا۔ اس لمحے کائنات کی ہر آواز دم توڑ گئی، سوائے ایک آواز کے۔

ٹپ... ٹپ... ٹپ....

یہ سقراط کی پیشانی سے ٹپکنے والے خون کی آواز تھی جو بارش کے قطروں کے ساتھ مل کر گاڑی کے ادھ کھلے شیشے پر گر رہا تھا۔ سقراط کی آنکھیں جو چند لمحے پہلے جسمانی تکلیف اور غصے سے جل رہی تھیں اب ایک گہری اور ناقابلِ بیان اذیت سے جل اٹھیں۔ وہ نجف کو دیکھ رہا تھا اور نجف ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ٹکرائیں اور یوں لگا جیسے کائنات ٹھہر سی گئی ہو۔ ماضی کے فلیش بیک تصور کے پردے پر تیزی سے ابھرنے لگے۔ سقراط کے چہرے پر پھیلا کرب اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کے جسم کے زخم اس زخم کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے جو اس گاڑی کے اندر بیٹھی عورت نے اسے کبھی دیا تھا جبکہ نجف کے چہرہ جیسے سپاٹ تھا۔ دوسری جانب موجود لوگ اب گاڑی پر ہاتھ مار کر اسے باہر نکلنے کا کہہ رہے تھے۔ سقراط نے اپنا ہوا میں معلق ہاتھ آہستہ سے نیچے کیا۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا۔

"جانے دو اسے..." سقراط نے ہجوم کی طرف دیکھے بغیر تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی گاڑی کا دروازہ کھلا اور نجف باہر نکل آئی۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ وہ ایک پروفیشنل اور سنجیدہ ڈاکٹر کی طرح کھڑی تھی، اس نے چہرے پر اجنبیت کا ایک ایسا دبیز پردہ ڈال لیا تھا جیسے وہ سقراط کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

"مُجھے بے حد افسوس ہے وہ اچانک ایک جانور سامنے آ گیا تھا..." نجف نے انتہائی رسمی اور نپے تلے انداز میں کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر ہوں، پلیز مُجھے آپ کو چیک کرنے دیں، آپ کے ماتھے سے بہت خون بہہ رہا ہے۔"

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا مگر سقراط نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اپنا ہاتھ اٹھا کر کے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خود مزید ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے جبڑے سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور مٹھیوں میں غصہ اور دکھ ایک ساتھ قید تھا۔ اس نے مڑ کر نجف کی آنکھوں میں نہیں دیکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے دیکھ لیا تو وہ ضبط نہیں کر پائے گا جبکہ بارش کے قطرے اب نجف سے بالوں سے بہتے اس کی پلکوں پر ٹھہر چکے تھے۔

"یہاں سے جائیے بزدار صاحب..." سقراط کی آواز سرد اور کاٹ دار تھی۔ وہ رخ موڑ چکا تھا۔ "ورنہ آپ پر ایک غریب کو کچلنے کا بھاری کیس ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس نے ہجوم کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور اپنی ٹوٹی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف لنگڑاتے ہوئے بڑھ گیا۔ نجف چند لمحے ساکت کھڑی اس کی چوڑی پشت کو دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کا نیا دل اس کے سینے میں کسی پرانے دکھ کی طرح دھڑک رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو بکھرنے نہیں دیا۔ چند لمحے وہ کھڑی رہی۔ لوگ اب پیچھے ہٹ رہے تھے پھر وہ خاموشی سے واپس مڑی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی آہستہ آہستہ اس موڑ سے دور ہونے لگی۔ نجف نے سڑک پر نظریں جمائے رکھنے کی کوشش کی مگر اس کی نظریں بے اختیار بار بار گاڑی کے بیک ویو مرر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شیشے کے اس دھندلے، بارش سے بھیگے عکس میں سقراط ابھی تک اسی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ ہجوم چھٹ چکا تھا۔ اس کی موٹر سائیکل گری ہوئی تھی اور وہ اپنی لیدر جیکٹ کی پھٹی ہوئی آستین سے اپنے ماتھے سے بہنے والے خون کو پونچھ رہا تھا۔ نجف نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سی اذیت تیرنے لگی۔ بارش تیز ہو چکی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ بارش سڑک پر گرے اس خون کو تو دھو سکتی تھی لیکن اس اذیت کو نہیں جو آج اس دردناک ملاقات نے دونوں کے درمیان پھر سے زندہ کر دی تھی۔

☆☆☆☆☆

باہر سرما کی بارش نے شبگیر ہاؤس کے در و دیوار کو ایک خنک اور دلفریب حصار میں لے رکھا تھا مگر اندر لاؤنج کا ماحول اس وقت کسی سیشن کورٹ سے کم نہیں تھا۔

آج شبگیر ہاؤس میں باقاعدہ عدالت لگی ہوئی تھی۔ سلال شبگیر آج جج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ لاؤنج کی سب سے بڑی اور آرام دہ کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ماتھے پر ہلکی سی شکن ڈالے انتہائی سنجیدگی سے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دادی اور سرمد صاحب کی تازہ ترین رپورٹس تھیں جو کسی فیل ہونے والے طالب علم کے رزلٹ کارڈ سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کے عین سامنے میز پر جج کے ہتھوڑے کی جگہ

کچن کا ایک بڑا سا اسٹیل کا سالن والا چمچہ رکھا ہوا تھا جسکے قریب ہی چغلی خان بیٹھا تھا۔ دائیں جانب والے صوفے پر کٹہرے کے مجرم کی طرح سرمد صاحب بیٹھے تھے اوران کے سر پر استغاثہ کی وکیل بن کر تارہ کھڑی تھی۔ جبکہ بائیں جانب والے صوفے پر دادی جان اپنی شال اوڑھے بیٹھی تھیں اوران کے دفاع کے بجائے ان پر فردِ جرم عائد کرنے کے لیے نوفہ ان کے سر پر کھڑی تھی۔ سلال نے گلا کھنکارا، میڈیکل رپورٹس کو میز پر رکھا اور سالن والا چمچ اٹھا کر میز پر دو بار مارا۔

"آرڈر! آرڈر!"

سلال کی اس حرکت پر سرمد صاحب نے منہ بنایا جبکہ دادی نے خفگی سے پوتے کو گھورا۔ چغلی خان کے پر پھڑ پھڑائے۔

"جی تو استغاثہ..." سلال نے اپنی (مصنوعی) عینک کو ناک پر درست کرتے ہوئے تارہ کی طرف دیکھا۔ "پہلے مجرم کے خلاف کیا چارجز ہیں؟"

تارہ نے فوراً ایک پیشہ ور وکیل کی طرح ہاتھ باندھے اور سرمد صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ "یور آنر! یہ جو بظاہر معصوم نظر آنے والے شخص یہاں بیٹھے ہیں، یہ رات کے اندھیرے میں فریج سے چوری چھپے گلاب جامن کھاتے پائے گئے ہیں۔ اور تو اور واک کے نام پر گھر سے نکلتے ہیں اور چوک والے کیبن سے دوستوں کے ساتھ مل کر چائے اور بسکٹ اڑا کر آجاتے ہیں۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے جج صاحب! یہ بچی مُجھے پھنسا رہی ہے!" سرمد صاحب نے تڑپ کر صفائی پیش کرنی چاہی۔

"آرڈر ان دا کورٹ، سرمد صاحب!" سلال نے چمچہ دوبارہ میز پر مارا اور ان کی رپورٹ ہاتھ میں اٹھالی۔ "آپ کے یہ بلڈ ٹیسٹ کے نتائج گواہی دے رہے ہیں کہ استغاثہ بالکل سچ بول رہی ہے۔ آپ کی شوگر بارڈر لائن کراس کر چکی ہے اور کولیسٹرول تو ایسے اڑان بھر رہا ہے جیسے کسی راکٹ پہ سوار ہو۔"

سلال نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر ایک ڈاکٹر والے ناصحانہ انداز میں بولا۔

"ساتھ والے بیگ انکل کو دیکھ لیں۔ ان کی عمر آپ سے زیادہ ہے مگر مجال ہے جو صبح چھ بجے ان کی جاگنگ مس ہو جائے۔ وہ بارش میں بھی چھتری لے کر چہل قدمی کر رہے ہوتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ ناشتے میں پائے طلب کر رہے ہوتے ہیں۔"

سرمد صاحب نے خفگی سے منہ موڑا۔ "بیگ صاحب ریٹائرڈ اور ویلے آدمی ہیں۔ انہیں کوئی کام نہیں سوائے سڑکیں ناپنے کے۔ میرے سر پر کاروبار کی ٹینشن ہے، اس لیے شوگر بڑھ جاتی ہے۔ اس میں گلاب جامنوں کا کوئی قصور نہیں۔"

سلال نے نفی میں سر ہلایا اور پھر دادی کی طرف رخ کیا۔ "جی نوفہ بی بی! آپ کی ملزمہ کا کیا حال ہے؟"

نوفہ نے فوراً دادی کے تکیے کے نیچے سے برآمد ہونے والی ریوڑیوں کی ایک چھوٹی سی تھیلی میز پر ثبوت کے طور پر پیش کر دی۔ دادی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ واللہ اب وہ ان ناگنوں کو اپنے کمرے میں کبھی نہیں سلائیں گی۔

"یوآنر یہ دیکھیں! ان کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کر رہا ہے، جوڑوں کے درد سے یہ ہائے ہائے کرتی ہیں مگر پرہیز کے نام پر زیرو ہیں۔"

سلال نے دادی کی رپورٹ دیکھتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

"دادی آپ کا یورک ایسڈ اور بی پی دونوں خطرناک حد تک بڑھے ہوئے ہیں اور وٹامن ڈی تو جیسے جسم سے غائب ہی ہو گیا ہے۔ پوری چھت خالی پڑی ہے، اللہ کی دھوپ بالکل مفت مل رہی ہے مگر مجال ہے جو آپ سردیوں میں یا صبح کے وقت خود کو دھوپ لگوائیں؟ سارا دن کمرے میں بیٹھ کر ہڈیاں تو کڑکڑائیں گی نا۔"

"میرے گھٹنے میں اتنی جان کہاں کہ میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جاؤں؟ اور یہ ریوڑیاں تو میں نے چیونٹیوں کو ڈالنے کے لیے رکھی تھیں۔" دادی نے فوراً اپنا دفاع کیا۔

"تکیے کے نیچے چیونٹیاں پال رہی ہیں آپ دادی؟" سلال نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا تو لاؤنج میں تارہ اور نوفہ کی ہنسی گونج اٹھی۔

"دادی جھوٹی! دادی جھوٹی!" چغلی خان جو کب سے اپنی زبان قابو کیے خاموشی سے ساری کاروائی دیکھ رہا تھا فوراً بڑبڑایا۔ دادی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ کمبخت ایک طوطا بھی اپنا نہیں تھا۔ سرمد صاحب کو جب لگا کہ شکنجہ سخت ہو رہا ہے تو وہ فوراً اپنے دفاع کے لیے بول اٹھے۔

"یہ عدالت یکطرفہ فیصلہ کر رہی ہے۔ جج صاحب یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ہمیں اپنا وکیل کرنے کی اجازت دی جائے!"

سرمد صاحب نے گردن گھما کر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا اور باقاعدہ دہائی دی۔

" گھر کی ڈیفنس لائر! ذرا باہر آ کر اپنے باپ اور اپنی دادی کو ان ظالم بچوں سے بچاؤ!"

باہر بارش کی چھم چھم ابھی تک جاری تھی جبکہ کچن کے اندر ماحول انتہائی خوشگوار اور گرم تھا۔ کچن کے کاؤنٹر کے پاس چولہے پر کڑاہی چڑھی تھی، جس میں گرم تیل کے اندر میٹھے پکوڑے (گلگلے) تلے جا رہے تھے۔ گڑ، سونف اور الائچی کی میٹھی اور اشتہا انگیز خوشبو پورے گھر میں پھیل چکی تھی۔ نیمل اس وقت چمٹے سے پکوڑوں کی سائیڈ پلٹ رہی تھیں جبکہ ان کے بالکل پاس ایک اونچے لکڑی کے اسٹول پر زہرہ بیگم بیٹھی محبت سے اسے یہ کام کرتے دیکھ رہی تھیں۔ سرمد صاحب کی دہائی جب کچن تک پہنچی تو نیمل نے ایک ہاتھ کمر پر رکھا اور کچن کے دروازے سے ہی اونچی آواز میں اعلان کر دیا۔

"میں کسی کی وکالت نہیں کر رہی! آپ دونوں ماں بیٹا اپنا اپنا کیا خود بھگتیں۔ جب میں کہتی ہوں کہ احتیاط کریں تب تو کوئی میری سنتا نہیں ہے، اب ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں تو انہیں اپنی صفائیاں پیش کریں۔ میں میٹھے پکوڑے بنا رہی ہوں اور وہ صرف ان لوگوں کو ملیں گے جن کی رپورٹس ٹھیک آئی ہیں۔"

زہرہ بیگم نے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے ہی لقمہ دیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے نیمل! سرمد صاحب آپ کو تو بالکل نہیں ملیں گے یہ پکوڑے۔"

نیمل کے اس دوٹوک انکار پر سرمد صاحب اور دادی کے چہروں پر مایوسی چھا گئی۔ سلال نے اپنی ہنسی بمشکل ضبط کی اور اپنے چہرے پر دوبارہ

ایک سخت گیر جج کا تاثر طاری کرلیا۔اس نے سالن والا چمچ آخری بار میز پر مارا۔

"چونکہ ملزمان کے پاس صفائی میں پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا اور ان کے جرائم رپورٹس کی صورت میں ثابت ہو چکے ہیں،اس لیے یہ عدالت اور یہ ڈاکٹر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔"

سلال نے ایک کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھا اور اسے تارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"آج سے اس گھر کا ڈائٹ پلان تبدیل۔سرمد صاحب صبح ٹھیک چھ بجے جاگنگ کے لیے جائیں گے اور ان کی رات کی مٹھائیوں کا کوٹہ مکمل طور پر ضبط کیا جاتا ہے۔

کمالہ بیگم (دادی) کو روزانہ صبح پندرہ منٹ کے لیے چھت پر کرسی ڈال کر دھوپ میں بٹھایا جائے گا اور انہیں ہلدی والا دودھ پلایا جائے گا۔ اگر سیڑھیاں چڑھنے میں مسئلہ ہے تو سقراط شبگیر انہیں سہارا دے کر لے جائیں گے۔"

"یہ کیسی سزا ہے؟ مُجھے بالکل منظور نہیں ہے۔" سرمد صاحب نے احتجاج کیا۔

"یہ سزا نہیں، پاپا! یہ نسخہ ہے۔" سلال نے مسکراتے ہوئے اپنی عینک اتاری۔ "اور اس پر آج سے ہی سختی سے عمل ہوگا۔ورنہ اگلی پیشی سیدھا ہسپتال کے وارڈ میں ہوگی۔"

تارہ اور نوفہ نے تالیاں بجا کر اس فیصلے کا استقبال کیا جبکہ دادی اور سرمد صاحب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

"سزا مل گئی...سزا...مل...گئی۔" چغلی خان جوش سے چلا اٹھا۔عدالت برخاست ہو چکی تھی۔باہر برستی بارش کچن کی کھڑکی کے شیشوں پر ایک مدہم موسیقی پیدا کر رہی تھی۔نیمل نے کڑاہی سے پکوڑوں کا آخری پور نکال کر چھلنی میں رکھا تو اسے اپنی پشت پر ماں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس نے مسکرا کر مڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں امی؟"

زہرہ بیگم کے چہرے پر لازوال مسکراہٹ ابھری۔انہوں نے اپنی شال کو کندھوں پر درست کرتے ہوئے کہا۔

"یہی دیکھ رہی ہوں کہ جن لڑکیوں کی شادی سر پر ہو وہ ان دنوں میں کام نہیں کرتیں، الٹا اپنے نخرے اٹھواتی ہیں۔اور ایک تم ہو کہ آج کل گھر کے سارے کام اپنے سر پر لیے پھر رہی ہو۔"

نیمل نے چولہا دھیما کیا، چمٹا ایک طرف رکھا اور کڑاہی نیچے اتار دی۔

"امی! میں نے ساری عمر اس گھر کا کوئی کام نہیں کیا۔آپ نے اپنی زندگی کے پچھلے اٹھائیس سال اس کچن کی نذر کر دیے۔ہمارے ذائقے سنبھالتے سنبھالتے آپ کے ہاتھ تھک گئے۔میں چاہتی ہوں کہ رخصت ہونے سے پہلے چند دن آپ کو اپنے ہاتھ کا کھانا کھلا سکوں۔اور ہاں یہ مت سوچیے گا کہ میں اگلے گھر جا کر صرف گھر ہی سنبھالوں گی..." اس نے مسکراہٹ سے کہا۔ "نیمل شبگیر وہاں جا کر بھی اپنی مرضی چلائے گی۔"

نیمل کی اس آخری بات پر زہرہ بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ تو آئی مگر اگلی ہی سیکنڈ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"تم چلی جاؤ گی تو میرا گھر کیسے چلے گا نیمل؟ سلال، نامرہ، نوفہ، تارہ اور باقی سب کو کون سنبھالے گا؟ سارا گھر تمہارے گرد ہی تو گھومتا ہے۔"

بیشک بیٹیوں کو بیاہنے کا خوبصورت ترین خواب ہر ماں باپ دیکھتے ہیں مگر جانے کیوں رخصتی کی گھڑی جیسے جیسے قریب آ رہی تھی، زہرہ بیگم کا دل بہت اداس اور بھاری ہوتا جا رہا تھا۔

"سب بڑے ہو چکے ہیں امی! اب کوئی بھی بچہ نہیں رہا۔" نیمل ان کے قریب آئی اور جھک کر انکا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی اداسی کو کم کرنا چاہا۔

"اور میں کونسا کسی دوسرے شہر جا رہی ہوں؟ اسی شہر میں تو رہوں گی۔ آپ بالکل بےفکر رہیں، ان سب کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی رپورٹس میں تب بھی خود ہی لیا کروں گی۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے والی نہیں ہوں۔"

ان دونوں کی یہ گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ زہرہ بیگم کو اچانک کچھ یاد آیا۔ انہوں نے دیوار پر لگی گھڑی دیکھی۔

"میں ذرا سلال سے کہہ دوں کہ نامرہ کو کالج سے لے آئے۔ اس کی چھٹی کا ٹائم ہو رہا ہے اور باہر موسم بہت خراب ہے۔" وہ اسٹول سے اٹھیں کچن کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلیں عین اسی لمحے بھاری داخلی دروازہ کھلا اور سقراط اندر داخل ہوا۔

"ہائے اللہ! سقراط... یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

زہرہ بیگم کی مدھم سی چیخ ابھری۔ ان کی لرزتی ہوئی آواز لاؤنج میں اس طرح گونجی کہ سلال، سرمد صاحب، دادی، نوفہ اور تارہ سب کے سب اچھل کر بدحواسی میں داخلی دروازے کی طرف بھاگے۔ سقراط دہلیز پر کھڑا تھا۔ ایک پل کو لگا کہ اس نے اس حالت میں گھر آ کر غلطی کر دی تھی۔ اس نے اپنے سر اور ماتھے پر ایک سفید رومال سختی سے باندھ رکھا تھا جو اس وقت ماتھے کے گہرے زخم سے نکلنے والے خون کی وجہ سے جگہ جگہ سے گہرا سرخ ہو چکا تھا۔ وہ حادثے کے بعد کسی ہسپتال جانے کے بجائے سیدھا گھر آیا تھا۔

" کچھ نہیں ہوا بھابھی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" سقراط نے لہجے کو حد درجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز کی لرزش اس کی اندرونی تکلیف کو چھپا نہیں پا رہی تھی۔ سلال فوراً آگے بڑھا۔

"چاچو! مُجھے دیکھنے دیں۔" اس نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر آگے بڑھ کر سقراط کا بازو تھاما اور اسے لاؤنج میں لا کر بڑی کرسی پر بٹھایا۔ جہاں سرمد صاحب سقراط کی یہ حالت دیکھ کر شدید پریشان ہو گئے تھے، تارہ اور نوفہ کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ وہاں دادی کی حالت تو دیکھنے والی تھی۔ ان کے باقاعدہ ہاتھ پیر کانپنے لگے تھے۔

"ہائے میرے بچے کو کس کی نظر لگ گئی! یہ کیا حال بنا کر آئے ہو؟"

"ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا اماں! میں ٹھیک ہوں۔" سقراط نے جبڑے بھینچ کر کہا۔
سلال کے اشارے پر نوفہ بھاگ کر اندرونی کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لائی تھی۔ مٹھوڈر کر نوفہ کے بازوؤں سے چپک گیا۔ سلال نے باکس کھولا، دستانے پہنے اور سقراط کے سر پر بندھا وہ خون آلود رومال کھولنا شروع کیا۔ جیسے ہی کپڑا ہٹا ماتھے پر موجود گہرا کٹ واضح ہوا جس سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

"کس نے ماری ہے ٹکر؟ کوئی اندھا تھا کیا؟" سلال نے سنجیدگی سے پوچھا جبکہ دادی نے باقاعدہ روتے ہوئے اس نامعلوم گاڑی والے کو بددعائیں دینا شروع کر دیں۔ "اللہ ذلیل کرے۔ بیڑہ غرق ہو۔"

سلال نے اسواب کو جراثیم کش مائع میں بھگو کر زخم صاف کرنا شروع کیا۔ "چاچو تھوڑا درد ہوگا۔" وہ ٹانکا لگانے لگا تھا۔ "کس چیز سے ہٹ ہوئی ہے بائیک؟"

"ایک گاڑی والے نے ٹکر ماری ہے۔" سقراط نے مختصر جواب دیا اور اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں جیسے وہ ماتھے کے درد کو نہیں بلکہ کسی اندرونی کرب کو دبا رہا ہو۔ سب ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"گاڑی والے کا قصور بعد میں نکالنا پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا دھیان کہاں تھا؟ مُجھے پورا یقین ہے کہ تم ہوا سے باتیں کر رہے ہو گے اور اتنی تیز بارش میں بائیک لے کر نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟" سرمد صاحب کا فکر کرنے کا طریقہ تھوڑا الگ تھا۔ "اور ہیلمٹ کہاں ہے تمہارا؟" آج وہ ہیلمٹ بھول گیا تھا۔ سقراط نے سرمد صاحب کی ڈانٹ پر کوئی جواب نہیں دیا بس اس کے لبوں پر ایک انتہائی پھیکی اور تلخ مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔
ڈائننگ ہال میں کھڑی نیمل خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ اچانک ٹھٹک گئی۔ اس کی تیز اور مشاہداتی نظروں نے سقراط کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ وہ صرف ایک ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔ سقراط کی آنکھیں اس وقت صرف جسمانی درد سے لال نہیں تھیں۔ ان میں ایک عجیب سا غصہ اور گہری شکست کا احساس تھا۔ باہر بارش اب بھی ٹپ...ٹپ...ٹپ... مسلسل برس رہی تھی اور لاؤنج کی کھڑکی کے شیشوں پر گرتی بوندوں کی یہ آواز سقراط کے ماتھے سے ٹپکنے والے خون کے اس پہلے قطرے جیسی ہی تھی۔ ماتھے کا زخم تو سلال نے صاف کر کے دو ٹانکے لگانے کے بعد پٹی باندھ دی تھی مگر اس بارش کی خنکی میں سقراط کا دل اس وقت ماتھے کے کٹ سے کہیں زیادہ گہرا اور لہولہان تھا۔

☆☆☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور باہر برستی تیز بارش نے کیمپس کے فلڈ لائٹس سے چمکتے ہوئے ہاکی اور فٹ بال گراؤنڈز پر پانی کی ایک شفاف چادر بچھا دی تھی۔

نامرہ کے لیے یہ سال مصروف ترین تھا۔ بحیثیت اسپورٹس اینڈ ری ہیب سائنٹسٹ (Sports & Rehab Scientist) یہ اس کا فائنل ایئر تھا جہاں کھلاڑیوں کی انجریز، ان کا فزیکل ڈیٹا اور ری ہیبلیٹیشن پر پریکٹیکل کام کا بوجھ پچھلے تمام سالوں سے کہیں زیادہ تھا۔ آج آئمہ نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے لیب کا سارا کام نامرہ کو اکیلے ہی سمیٹنا پڑا تھا۔ وہ اس وقت تیسری منزل پر واقع جدید لیب میں کھڑی تھی۔ لیب کی فرش سے چھت تک لگی بڑی گلاس ونڈوز اور شیشے کے سلائیڈنگ دروازوں سے باہر برستی بارش اور کالی سڑکوں پر رینگتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ نامرہ کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، کھلی نیلی جینز پر پہنی ڈینم کی جیکٹ کے کالر درست کیے اور سر پر اسپورٹس کیپ (ٹوپی) کو سیٹ کرتے ہوئے اپنا بھاری بیگ کندھے پر ٹکایا۔ باہر سلال اسے لینے کے لیے نیچے پارکنگ ایریا میں گاڑی لیے کھڑا تھا۔ وہ جانے کے لیے جیسے ہی شیشے کے دروازے کی طرف پلٹی، سامنے کھڑی ایک لڑکی کو دیکھ کر اس کے قدم ٹھہر گئے۔ وہ لڑکی فضاء تھی جو نامرہ سے ایک سال جونیئر تھی۔ نامرہ کو فضا کو وہاں دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ کچھ کچھ اس کے آنے کی وجہ سمجھ چکی تھی۔

"ہائی..." فضا نے نہایت خوش مزاجی سے کہا۔

"ہیلو..." نامرہ نے سرد اور نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارا بھائی... بی ایم سی (بزدار میڈیکل کالج) فورتھ ائیر میں فرسٹ آیا ہے نا؟" فضا نے اپنی چمکتی آنکھوں سے نامرہ کے چہرے کے تاثرات کو ٹٹولا۔ بزدار میڈیکل کالج اور اسپورٹس کالج کے اسٹوڈنٹس کے درمیان سوشل سرکلز کی وجہ سے خبریں بہت تیزی سے یہاں تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ فضاء دراصل چند ماہ پہلے سلال سے دونوں کالجز کی ایک مشترکہ کلچر اینڈ ہیومینٹی سوسائٹی کے سیمینار میں ملی تھی جہاں وہ سلال کی شخصیت اور ذہانت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس نے سلال کو انسٹاگرام پر فالو کرنا شروع کیا مگر سلال کی طرف سے کوئی خاص رسپانس نہیں آیا۔ فضا نے جب اسے بے جا میسجز کر کے تنگ کرنا شروع کیا تو سلال نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے بلاک لسٹ میں ڈال دیا تھا۔

"ہاں، وہ فرسٹ آیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح..." نامرہ نے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھنے لگی۔

"نامرہ سنو!" فضاء نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا، "مُجھے تمہارے بھائی سے ہیومینٹی سوسائٹی کے حوالے سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ کیا تم مُجھے انکا واٹس نمبر دے سکتی ہو؟ دراصل انکا انسٹاگرام بند ہے آج کل..."

نامرہ نے فضا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے پر تیکھی اور طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"انسٹاگرام بند نہیں ہے تم بلاک ہو۔" نامرہ کے یوں منہ پھاڑ کے کہنے پر فضا کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمارے بھائی کا ہم سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"تم لوگ کتنے بدتہذیب ہو۔ پرائیویسی نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" فضا کو نہایت برا لگا تھا۔ بھلا کوئی تک بنتی ہے جوان بھائی کا انسٹاگرام چیک کرنے کی؟

"میرا بھائی انسٹاگرام سوشل ورکس کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تمہیں وہاں کوئی ریسپانس نہیں ملے گا۔"

"تو پھر کہاں ملے گا؟" برجستہ سوال آیا۔ نامرہ نے کندھے اچکا دیے۔

"نمبر دے دو۔ میں بس مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔"

"میں اپنے بھائی کا نمبر تمہیں فری میں کیوں دوں؟" نامرہ نے چند پل سوچا اور اسکی آواز میں ایک کھرے بزنس مین جیسی کاٹ تھی۔ اس نے بیگ کندھے پر درست کیا اور چل پڑی۔

"تو... تمہیں بدلے میں کیا چاہیے؟"

اس سوال پر نامرہ کے قدم یکدم رک گئے۔ اس نے آہستہ سے سر گھمایا، اپنی ٹوپی کو تھوڑا پیچھے کیا اور فضا کی طرف دیکھا۔ اس لمحے نامرہ کی آنکھوں میں شاطرانہ اور غیر معمولی چمک ابھری۔

"ٹھیک ہے جلد بتاؤں گی۔"

فضا وہیں کھڑی رہ گئی۔ نامرہ لیب سے نکل کر تیزی سے راہداری اور پھر لفٹ کے ذریعے نیچے مین ہال کی طرف آئی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے اس نے کوئی بہت بڑا معرکہ مار لیا ہو۔ وہ جب ہی کالج کے بیرونی پورچ کی طرف بڑھ رہی تھی بالکل دوسری طرف موجود انڈور ہاکی فیلڈ کے دروازے سے ثالث باہر نکل رہا تھا۔ اس کی ہاکی کٹ اس کے کندھے پر تھی اور وہ اپنی پریکٹس سے فارغ ہو کر راہداری سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر تیز رفتاری سے باہر نکلتی نامرہ پر پڑی۔

نامرہ کی اسپورٹس کیپ کے نیچے سے نکلتے بال اور اس کا وہ مخصوص اندازِ رفتار دیکھتے ہی ثالث کے قدم فیلڈ کے باہر ہی رک گئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

وہ اپنی فیلڈ اور کٹ کی پرواہ کیے بغیر، لاشعوری طور پر تیز قدموں سے نامرہ کے پیچھے لپکا۔ وہ اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا

چاہتا تھا مگر وہ دیر کر چکا تھا۔
نامرہ پورچ سے باہر نکل کر پارکنگ کی گیلی سڑک پر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ چکی تھی۔ سلال ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور گاڑی کے وائپرز چل رہے تھے۔ نامرہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر دروازہ زور سے بند کر دیا۔ ثالث راہداری کے آخری ستون کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ بارش کی بوندیں پورچ کے کنارے سے ٹکرا کر اس کے جوتوں پر گر رہی تھیں۔ وہ سلال کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم وہیں روک لیے۔ اس کی اخلاقیات نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ نامرہ کے بھائی کے سامنے جا کر اس کا راستہ روکے یا اسے آواز دے۔ اسے سلال کے سامنے اس طرح نامرہ کے پیچھے آنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے خود پر ضبط کیا۔ ہاکی اسٹک پر گرفت مضبوط کی اور خاموشی سے گاڑی کو کیمپس کے بڑے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ باہر بارش اب اور دھیمی ہو چکی تھی اور ثالث بزدار اس بارانی شام کے دھند لکے میں اپنی ادھوری خواہش کے ساتھ وہیں راہداری کے سائے میں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆

بزدار میڈیکل کالج کی مرکزی راہدری جو سیدھا ساتھ ہی منسلک بزدار ہسپتال کے سرجری بلاک کی طرف جاتی تھی، آج صبح کی دھوپ میں چمک تھی۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ بارش کے بعد مطلع صاف تھا۔ یہ راہداری کالج کی تعلیمی عمارت اور ہسپتال کے وارڈز کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی تھی۔ فائنل ایئر کے اسٹوڈنس اپنے سفید لیب کوٹس پہنے، ہاتھوں میں کلینیکل ڈائریز اور اسٹیتھو سکوپس تھامے تیزی سے وارڈز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سلال ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں راہداری سے گزر رہا تھا۔ اس کے انداز میں پوزیشن کا کوئی غرور نہیں تھا بلکہ وہ پرسکون قدموں سے چلتا ہوا سرجری وارڈ 1 طرف بڑھ رہا تھا جہاں پروفیسر مسعود کا صبح کا راؤنڈ شروع ہونے والا تھا، جس میں انہوں نے بستر پر موجود مریضوں کا معائنہ کرنا تھا
اور طلبہ سے سوال جواب کرنے تھے۔
"مبارک ہو، سلال شبگیر!"
ایک پراعتماد اور جانی پہچانی آواز سلال کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر حیرت کی ایک گہری لہر دوڑ گئی جسے اس نے اپنی فطری سنجیدگی کے پیچھے چھپانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کی آنکھوں کا پھیلاؤ اس کے اندر کی حیرت کو نمایاں کر گیا۔ اس کے سامنے عالیہ کھڑی تھی۔ اس کا سفید کوٹ ہمیشہ کی طرح بے داغ تھا۔ بال نفاست سے کھلے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں وہ چمکتا ہوا بالکل نیا جرمن میڈ اسٹھتھو سکوپ لٹک رہا تھا جو اسے تحفے میں ملا تھا۔ مگر سب سے حیران کن چیز اس کا موڈ تھا۔ اس کے چہرے پر کسی شکست یا کڑھن کا کوئی نام و نشان نہیں تھا بلکہ اس کے لبوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
"تم... شکریہ..." سلال کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

" کیوں؟ کیا عالیہ بزدار اپنے واحد اور سب سے لائق حریف کو پہلی پوزیشن آنے پر مبارکباد بھی نہیں دے سکتی؟" عالیہ نے ابرو اچکا کر، انتہائی ہلکے پھلکے اور دوستانہ انداز میں کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے سلال کی طرف بڑھا دیا۔ سلال نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنی حیرت پر قابو پایا، اپنے چہرے پر مدہم مسکراہٹ سجائی اور پھر اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے اسکا مصافحہ قبول کیا۔ اس نے عالیہ کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ عالیہ کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ اس نے یہ توقع تو ہر گز نہیں کی تھی۔

"یہ میرے لیے واقعی بہت حیران کن ہے۔" سلال نے اعتراف کیا۔ "مُجھے لگا تھا کہ شاید تم رزلٹ کے بعد مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرو گی، خاص طور پر جب فرق صرف چار نمبروں کا ہو۔"

"پہلے میرا موڈ ایسا ہی تھا۔" عالیہ نے کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔ "میں پچھلے کئی دن یہی سوچ کر خود کو ہلکان کر رہی تھی کہ میں دوسرے نمبر پر کیسے آ گئی لیکن پھر مُجھے ثالث نے یاد دلایا کہ یہ رزلٹ کارڈ زندگی کا آخری فیصلہ نہیں ہوتا۔ اور سچی بات تو یہ ہے سلال... تم اس پوزیشن کے حقدار تھے۔ تم نے پورے سال سخت محنت کی ہے اور میں ایک اچھے مدمقابل کی جیت کا احترام کرنا جانتی ہوں۔"

وہ دونوں اب ایک ساتھ راہداری میں آگے بڑھ رہے تھے۔ سلال عالیہ کے اس بدلے ہوئے اور میچور رویے کو دیکھ کر کافی حیران تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی انا کو جانب رکھ کر اپنے حریف کو یوں کھلے دل سے سراہنا صرف ایک بڑے ظرف کا انسان ہی کر سکتا ہے اور عالیہ کا ظرف؟ چند دنوں میں یہ معجزہ کیسے ہو گیا؟

"تمہارا ظرف ہے عالیہ! ورنہ پیتھالوجی میں تمہارے نمبر مجھ سے زیادہ ہیں۔" سلال نے اس کی علمی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "اگر اس دن پریکٹیکل کے دوران تمہاری طبیعت خراب نہ ہوتی تو شاید آج یہ پہلی پوزیشن تمہاری ہوتی۔"

عالیہ نے ایک گہرا اور پرسکون سانس لیا۔ "جو گزر گیا، وہ گزر گیا۔ اس دن میرا جسم میرے اعصاب کا ساتھ نہیں دے پایا، لیکن اب..." اس نے رکتے ہوئے اپنی آنکھوں کو تھوڑا اسکیڑا۔ اس کے چہرے پر چیلنجنگ تاثر واپس لوٹ آیا۔ "اب فائنل ایئر شروع ہو چکا ہے۔ اس لیے اپنی اس فرسٹ پوزیشن کا جشن جلدی ختم کر لو کیونکہ اگلی بار میں تمہیں یہ چار نمبر لینے کا موقع بھی نہیں دوں گی۔"

سلال کی آنکھوں میں چمکدار سی مسکراہٹ ابھری۔ اسے عالیہ کا یہ روپ بہت پسند آیا تھا۔ ایک اچھے اور مضبوط حریف کے بغیر پڑھائی اور ہسپتال کے راؤنڈز کا مزہ ہی کہاں تھا۔

"میدان کھلا ہے، ڈاکٹر عالیہ!" سلال نے ایک ادائے خاص سے اپنا سر خم کیا۔ "میں آپکے اس چیلنج کا پورے احترام کے ساتھ استقبال کرتا

ہوں۔ دیکھتے ہیں فائنل ایر کی ٹرافی شبگیر ہاؤس جاتی ہے یا بزدار پیلس۔"

"دیکھتے ہیں... ویسے پروفیسر مسعود سرجری وارڈ پہنچ چکے ہوں گے اور ہاؤس آفیسرز ہسٹری فائلز تیار کر رہے ہوں گے۔" عالیہ نے اپنی کلینیکل ڈائری کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"اور میں نہیں چاہتا کہ پوزیشن ہولڈرز پہلے ہی دن ہسپتال کے راؤنڈ میں لیٹ پہنچ کر پروفیسر سے ڈانٹ کھائیں۔" سلال نے دھیما سا مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں ایک ساتھ، برابر قدموں سے چلتے ہوئے راہداری کے آخر میں واقع ہسپتال کے سرجری وارڈ کی طرف بڑھ گئے۔ راہداری میں موجود دوسرے اسٹوڈنٹس ان دونوں کو ایک ساتھ، اتنے اچھے موڈ میں بات کرتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

رات کے اس پہر بزدار ہسپتال کے عام وارڈز اور ایمرجنسی بلاک میں جہاں مریضوں کی چہل پہل اور تیمارداروں کا ہجوم تھا وہیں ایڈمنسٹریٹو بلاک کا یہ مخصوص ونگ بالکل الگ فضا لیے ہوئے تھا۔ یہاں کی چوڑی چمکتی ہوئی راہداریوں میں پراسرار اور بوجھل خاموشی کا راج تھا جہاں صرف دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک اور دور کہیں چلتے سینٹرل ایئر کنڈیشنڈ کی مدہم سرسراہٹ گونج رہی تھی۔ اس طویل اور سنسان راہداری کے فرش پر بھاری اور پراعتماد قدموں کی چاپ گونجی۔ حق اپنے حد درجہ پروفیشنل روپ میں تھا۔ اس کے چوڑے کندھوں پر بی ایم سی ہسپتال کا وہ مخصوص گھٹنوں تک لمبا سفید اسکرب کوٹ لہرا رہا تھا۔ راہداری میں ڈیوٹی پر موجود دو جونیئر ڈاکٹرز اور ایک نرس نے حق کو آتے دیکھا تو انہوں نے احترام سے دھیمی آواز میں کہا۔

"گڈ ایوننگ، ڈاکٹر حق!"

حق نے بغیر کچھ بولے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ہیڈ آف ایڈمنسٹریشن کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی پشت پر کوریڈور کے سائے جیسے آگے سمٹ رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر شمس بزدار ہیڈ آف ایڈمنسٹریشن کی چمکتی ہوئی تختی والے بھاری دروازے کے سامنے پہنچا۔ اس نے کسی عجلت کے بغیر دروازے پر دو دھیمی، پراعتماد دستک دیں اور ہینڈل گھما کر اندر داخل ہو گیا۔ داخل ہوتے ہی کمرے کا درجہ حرارت جیسے یکدم گر گیا۔ آفس کے اندر کا ماحول شدید تناؤ کا شکار تھا۔ ڈاکٹر شمس اپنی کرسی سے اٹھے ہوئے بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان کی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھلے تھے اور چہرے پر پچھتاوے اور غصے کے ملے جلے تاثرات واضح تھے۔ صوفے پر ہسپتال کے سینئر سرجن اور ان کے دوست ڈاکٹر یاور سر تھامے بیٹھے تھے جن کی رنگت خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔ میز پر نجف

کی مسترد کردہ وہ انکوائری فائل کھلی پڑی تھی جس پر دستخط کا خالی خانہ ان دونوں کی بے بسی کا تماشہ اڑا رہا تھا۔حق کو دیکھتے ہی ڈاکٹر شمس کے چہرے پر ایک امید کی چمک ابھری جبکہ ڈاکٹر یاور لاشعوری طور پر صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"آؤ، حق! بیٹھو!" ڈاکٹر شمس نے آگے بڑھ کر اپنے بھتیجے کا استقبال کیا، ان کی آواز میں دبی ہوئی بے چینی صاف محسوس ہو رہی تھی۔حق نے اپنی شرٹ کا اوپری بٹن کھولا اور انتہائی پرسکون قدموں سے چلتے ہوئے صوفے کی دوسری جانب نشست سنبھالی۔اس نے اپنا ایک ہاتھ صوفے کی پشت پر پھیلایا اور اپنی گہری نظریں ڈاکٹر شمس اور پھر ڈاکٹر یاور کے چہرے پر جما دیں۔

"ڈاکٹر شمس خیریت؟ آپ نے اتنا ارجنٹلی بلایا؟" حق کی آواز حد درجہ نپی تلی تھی

"ہاں ضروری بات کرنی ہے۔معاملہ اب پانی سر سے گزرنے کا ہے اور اب یہ صرف ہسپتال کا نہیں پورے خاندان کی ساکھ کا مسئلہ بن چکا ہے۔" شمس نے میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتہائی تلخ اور رازداری سے بھرپور لہجے میں کہنا شروع کیا۔"ڈاکٹر یاور سے پچھلے دنوں ایک کلینیکل ہینڈلنگ میں چوک ہو گئی تھی۔مریض کے گردے فیل ہوئے اور وہ ایکسپائر ہو چکا ہے۔تم تو جانتے ہو، میڈیا اور سوشل کمیونٹی کسی پاگل کتے کی طرح ہمارے ہسپتال کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی۔"

حق نے خاموشی سے میز پر رکھی فائل پر نظر ڈالی مگر اسے چھوا نہیں۔"تو ایڈمنسٹریشن نے اس کا کیا حل نکالا؟"

"حل بہت سیدھا تھا۔" ڈاکٹر یاور نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا ان کی آواز میں التجا اور خوف گھلا ہوا تھا،"اس وقت جو ڈیوٹی نرس تھی نفیسہ... ہم نے سارا چارج اس پر شفٹ کیا ہے کہ اس نے میڈیکیشن کا ٹائم مس کیا اور غلط ڈوز دی تاکہ ہسپتال کی ساکھ بچ سکے۔ایک نرس کو قربان کرنے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا، ہم اسے معاوضہ دے کر خاموش کرا دیں گے۔لیکن..."

"لیکن مسئلہ نرس کا نہیں ہے حق!" ڈاکٹر شمس نے بات کاٹتے ہوئے ضبط سے کہا۔"مسئلہ نجف کا ہے۔وہ ایز اے چیف میڈیکل آفیسر ضد لگا کر بیٹھ گئی ہے۔اس نے اس انکوائری رپورٹ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور کہتی ہے کہ یہ رپورٹ جھوٹ کا پلندہ ہے۔وہ الٹا مُجھے بلیک میل کر کے گئی ہے کہ اگر نرس کو نکالا گیا تو وہ اپنے تحت کام کرنے والے چار سو کے نرسنگ اور پیرامیڈیکل اسٹاف کو ہڑتال پر لے جائے گی اور اگلے دن ہسپتال میں ایک وارڈ بوائے بھی کام پر نہیں ہو گا۔"

حق کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔اس کی گہری نظریں ڈاکٹر یاور کے چہرے پر ابھرتے پسینے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ڈاکٹر شمس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انتہائی پچھتاوے سے کہا۔

"میں نے اسے اس کرسی پر اس لیے بٹھایا تھا کہ وہ ہماری اپنی ہے، سوتیلی ہی سہی لیکن چھوٹی بہن ہے۔مُجھے لگا تھا کہ وہ میرے اشاروں پر چلے گی۔پر مُجھے نہیں پتا تھا کہ وہ اس قدر بدل چکی ہے کہ پورے ہسپتال کی ساکھ داؤ پر لگا دے گی۔فی الوقت نجف کو صرف تم ہی ہینڈل کر سکتے ہو۔"

ڈاکٹر شمس اور ڈاکٹر یاور دونوں کی نظریں اب حق کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں وہ اس کے فیصلے کے منتظر تھے۔حق صوفے کی پشت سے تھوڑا آگے جھکا۔اس نے اپنی مضبوط انگلیوں سے میز پر رکھی فائل کو اپنی طرف سرکایا۔اس نے فائل کو کھولا چند سیکنڈز کے لیے نجف کے صاف

اور دوٹوک الفاظ میں لکھے گئے انکار کے نوٹ کو دیکھا اور پھر فائل کو ایک جھٹکے سے واپس بند کر دیا۔

"مریض کی اصل کاز آف ڈیتھ (Cause of Death) کیا تھی ڈاکٹر یاور؟" حق نے ڈائریکٹ ڈاکٹر یاور سے سوال کیا۔ ڈاکٹر یاور نے تھوک نگلا، ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

"وہ... پوسٹ آپریٹو پلمونری ایمبولیزم تھا مگر فائل میں ہم نے اسے نرس کی غفلت دکھایا ہے۔"

"اور اس نرس کا پچھلا ریکارڈ کیسا ہے؟" حق کا دوسرا سوال شمس کی طرف تھا۔

"ریکارڈ تو بالکل صاف ہے مگر ہسپتال کی عزت کے سامنے ایک نرس کے کیریئر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" شمس نے جلدی سے اپنے موقف کی تائید چاہی۔ حق آہستہ سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے اور اس پرشکوہ دفتر کی بڑی شیشے والی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے باہر رات کے اندھیرے میں ہسپتال کی عمارت اور لان دکھائی دے رہے تھے۔ اسکے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں ابھریں۔ کمرے میں چند لمحوں کے لیے اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ شمس اور یاور کے لیے وہ چند سیکنڈ کسی بھاری امتحان سے کم نہیں تھے کیونکہ حق کو اس معاملے میں لانے کا مطلب اپنی ہی کسی کمزوری کا اعتراف کرنا تھا۔ پھر وہ مڑا، وہ جانتا تھا کہ نجف کے اصولوں کے اس قلعے میں کہاں شگاف ڈالنا تھا اور ہسپتال کی ساکھ پر آنے والے اس وار کو کیسے روکنا تھا۔

"مجھ پر چھوڑ دیں۔" حق نے حتمی لہجے میں کہا۔

اس کے الفاظ کا اطمینان ایسا تھا کہ ڈاکٹر شمس اور یاور مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ حق نے فائل کو آخری گہری نظر سے دیکھا اور پھر الٹے قدموں سے آفس سے باہر نکل گیا جبکہ شمس اور یاور اس کے جانے کے بعد ایک گہرا سانس لے کر رہ گئے یہ جانتے ہوئے کہ اب اس کیس کا فیصلہ صرف الفا ہی کرے گا۔

اور پھر تین گھنٹے بعد حق اپنے کمرے میں بڑے لیدر کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر نرس نفیسہ کی پچھلے سات سالوں کی مکمل سروس فائل اس کی مختلف وارڈز میں ڈیوٹیز کا ریکارڈ اور ہسپتال کا ڈیجیٹل لاگ بک کھلا ہوا تھا۔ حق کی گہری نظریں اسکرین اور کاغذات پر تیر رہی تھیں۔ وہ ایک ایک تاریخ، ایک ایک نائٹ ڈیوٹی اور اس دوران آئی سی یو اور کارڈیالوجی وارڈ میں ہونے والی ہر ایک موت (Mortality Rate) کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نجف کا ارادہ بدلنے اور ڈاکٹر یاور کو بچانے کے لیے اسے نرس کے ماضی سے کوئی ایسا ہتھیار چاہیے جو اتنا دھاردار ہو کہ نجف کچھ بھی نہ کر پائے۔ وہ مسلسل تین گھنٹے سے لاگ فائلز کھنگال رہا تھا کہ اچانک اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رک گئیں اور اس کی ٹھنڈی آنکھیں جیسے چمک اٹھیں۔ اسے وہ مل گیا تھا جو وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ آج سے ٹھیک ڈھائی سال پرانا ایک کیس تھا۔ نومبر کی ایک سرد رات میں نرس نفیسہ کی ڈیوٹی نیوروسرجری کے ریکوری وارڈ میں تھی۔ اس رات ایک بوڑھے مریض کا برین سرجری کے بعد پوسٹ آپریٹو چیک اپ ہونا تھا جہاں ہر دو گھنٹے بعد اس کا بلڈ پریشر اور انٹراکرینیل پریشر نوٹ کرنا لازمی تھا۔ لاگ بک کے مطابق رات تین بجے کی ریڈنگ غائب تھی اور اگلی ریڈنگ صبح پانچ بجے لی گئی تھی، جب مریض کی حالت اچانک بگڑ گئی اور چند گھنٹوں بعد وہ کوما میں چلا گیا۔ حقیقت میں اس بوڑھے مریض کی موت عارضۂ قلب کی وجہ سے ہوئی تھی اور نیوروسرجری کے

ڈاکٹرز نے اس وقت اس غفلت کو معمولی جان کر دبا دیا تھا کیونکہ اس کا موت سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ مگر حق بزدار معمولی ڈاکٹر نہیں تھا۔ اس نے اس ڈھائی سال پرانی ریڈنگ کے غائب ہونے اور نرس کی اس دو گھنٹے کی غفلت کو اس مہارت سے جوڑا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اگر نرس نے رات تین بجے پریشر نوٹ کیا ہوتا تو مریض کو کوما میں جانے سے بچایا جا سکتا تھا۔ یہ اتنی بڑی غلطی نہیں تھی مگر حق نے اپنے میڈیکل اور قانونی دماغ سے اسے ایک قتلِ عمد جیسا سنگین کیس بنا دیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے انٹرکام اٹھایا۔

"نرس نفیسہ کو ابھی اسی وقت میرے آفس میں بھیجیں۔"

دس منٹ بعد، نرس نفیسہ ڈاکٹر حق کے آفس میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ نجف سے مسلسل بات کرنے کے بعد کافی پرامید تھا مگر جیسے ہی حق کا بلاوہ آیا اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔

"بیٹھیں..." حق نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا، اس کی آواز سرد اور سپاٹ تھی۔ نرس ڈرتے ڈرتے کرسی کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"جی ڈاکٹر حق؟ آپ نے اس وقت بلایا؟"

حق نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹکائے اور نرس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔ ڈاکٹر یاور کا جو کیس ہے اس کی انکوائری رپورٹ میرے سامنے ہے۔ سی ایم او نے اس پر سائن کرنے سے انکار کیا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ یہ کیس یہیں ختم ہو جائے۔"

نرس نے حوصلہ جمع کرتے ہوئے جواباً کہا۔

"ڈاکٹر اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ ڈاکٹر یاور نے خود غلط ڈوز لکھی تھی، میں نے تو صرف..."

"میں جانتا ہوں..." حق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی پرسکون انداز میں کہا۔ نرس پل بھر کو ساکت ہوئی۔

"میں تمہیں ایک آفر دینا چاہتا ہوں۔ تم اس نااہلی کے فارم پر دستخط کر دو۔ تمہیں ہسپتال سے آفیشلی ٹرمینیٹ نہیں کیا جائے گا بلکہ تم چھٹی پر چلی جاؤ گی۔ اور بزدار فیملی کی طرف سے تمہیں ہر مہینے تمہاری تنخواہ سے دگنا معاوضہ تمہارے اکاؤنٹ میں ملتا رہے گا جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔"

نرس نفیسہ کا رنگ فق پڑ گیا مگر اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"نہیں ڈاکٹر! میں بکنے والی نہیں ہوں۔ ڈاکٹر نجف میرے ساتھ ہیں، وہ انصاف پسند ہیں اور میں اپنے کیریئر پر یہ داغ کبھی نہیں لگنے دوں گی کہ میری وجہ سے کسی مریض کی جان گئی۔ میں سائن نہیں کروں گی۔"

حق نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے اس جواب کی پہلے سے توقع تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی غصہ نہیں ابھرا۔ اس نے آہستہ سے اپنے سامنے پڑی ایک پرانی، پیلی فائل اٹھائی اور اسے ایک جھٹکے سے نفیسہ کے سامنے میز پر پھینکا۔

"پھر ذرا اس فائل کو کھول کر دیکھو..." حق کا لہجہ کٹیلا تھا۔ نفیسہ نے کانپتے ہاتھوں سے فائل کھولی۔ جیسے ہی اس کی نظر نومبر کی اس تاریخ، نیورو وارڈ کے لاگ اور اس بوڑھے مریض کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر پڑی، وہ ساکت رہ گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"یہ... یہ تو ڈھائی سال پرانا کیس ہے ڈاکٹر! اس وقت تو انکوائری کلوز ہو گئی تھی اور اس مریض کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی۔"
نرس نے ہکلاتے ہوئے صفائی پیش کرنی چاہی۔ حق صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اس کی آنکھیں نرس کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نرس کی گھبراہٹ بہت کچھ کہہ گئی تھی۔

"انکوائری کلوز نہیں ہوئی تھی۔ وہ سرد خانے میں ڈال دی گئی تھی۔" وہ لمحہ بھر رہا۔

"اب ذرا اس کے نتائج سنو۔ اگر تم ڈاکٹر یاور والے فارم پر دستخط نہیں کرتیں تو کل صبح یہ ڈھائی سال پرانی فائل ری اوپن ہو گی۔ اس پر پی ایم ڈی سی (PMDC) اور پولیس انکوائری بیٹھے گی۔ میں خود بحیثیت سینئر سرجن یہ میڈیکل رپورٹ بورڈ کے سامنے پیش کروں گا کہ تمہاری دو گھنٹے کی غفلت اور ریڈنگ مس کرنے کی وجہ سے اس مریض کا برین ہیمرج ہوا۔" حق نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اس کا پہلا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارا نرسنگ لائسنس ہمیشہ کے لیے کینسل کر دیا جائے گا۔ تم اس ملک کے کسی ہسپتال میں ڈیوٹی نہیں کر سکو گی۔"
نرس نفیسہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے حق کو دیکھ رہی تھی جو اتنے شفاف وجود کے ساتھ اتنی تاریک باتیں کرتا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"دوسرا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ غفلت کا نہیں بلکہ Murder by Negligence کا کرمنل کیس بنے گا۔ پولیس تمہیں اسی ہسپتال سے ہتھکڑیاں لگا کر لے جائے گی۔ تمہاری بوڑھی ماں اور بچے جن کا واحد سہارا تم ہو، وہ عدالتوں کے چکر کاٹتے کاٹتے سڑک پر آ جائیں گے اور تمہارا پورا خاندان معاشرے میں ذلیل ہو جائے گا۔"

حق نے میز پر نرس کی جانب جھکتے ہوئے آخری اور حتمی ضرب لگائی۔

"اور یاد رکھنا، اس کیس میں ڈاکٹر نجف بزدار بھی تمہیں نہیں بچا پائیں گی کیونکہ میڈیکل ریکارڈ جھوٹ نہیں بولتا۔ اب یا تو خاموشی سے ڈاکٹر یاور کا کیس بند کروا کر ہر مہینے دگنا معاوضہ گھر بیٹھے وصول کرو یا پھر اگلے دس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو۔ چوائس از آل یورز!"
نرس کے پاس اب کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ حق نے اسے ایک ایسے اندھے کنویں کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ مستقبل کا سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آگئیں۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے میز پر رکھا پین اٹھایا اور نا اہلی کے اس فارم پر اپنے دستخط کر دیے۔

"میں تمہارا کریئر بچا رہا ہوں نفیسہ!"

اسے روتے دیکھ کر حق قدرے ہمدردی سے بولا۔

"اور جو میرا حق کھا رہے ہیں اسکا کیا؟" وہ ضبط کی شدت سے دبا دبا سا چلائی۔

As I said, choice is all yours!

حق نے کندھے اچکائے۔ نرس کرسی سے اٹھی، اس کا پورا وجود لرز رہا تھا اور آنکھوں میں شدید نفرت اور ذلت کے آنسو تھے۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی مگر جیسے ہی اس نے ہینڈل پکڑا، وہ یکدم رکی۔ اس نے مڑ کر حق کو دیکھا جواب بھی اسی سپاٹ اور

سنگِ مرمر جیسے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔
"میں نے سنا تھا کہ بزدار اپنے سفید کوٹ تلے کالے کرم چھپاتے ہیں..." نفیسہ نے اپنے گال رگڑتے ہوئے انتہائی کڑواہٹ سے کہا۔
"آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔"
حق کے چہرے کے عضلات میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اس کے تاثرات بالکل سپاٹ رہے جیسے اس پر ان جملوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔
نرس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر اسے زور سے بند کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ حق آہستہ سے صوفے سے اٹھا۔ اس نے میز پر پڑے دستخط شدہ فارم کو اٹھایا، اسے غور سے دیکھا اور پھر کمرے کی بڑی شیشے والی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا جہاں سے ہسپتال کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کا عکس شیشے میں مدھم سا ابھر رہا تھا۔ اس نے تیس دنوں سے چلتی ایک بڑی پریشانی کو تین گھنٹے میں نبٹا دیا تھا۔
"حق اسی کا ہوتا ہے جو لینا جانتا ہو۔"
وہ سفید کوٹ تلے کالے کرم چھپاتا تھا یا نہیں یہ الگ بحث تھی مگر وہ لوگوں کو بہت اچھے سے فریم کرتا تھا اور پھر جیسی چاہتا تھا ویسی تصویر بنا لیتا تھا۔ جیسا view دکھانا چاہتا تھا ویسا دکھا دیتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہسپتال سے باہر نکل رہا تھا۔ آج اسے اپنی بیوی بچے کو گھر واپس لانا تھا۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی بہتر کرنی تھی۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں دھیمی لائٹس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور باہر رات کا اندھیرا اب اپنے عروج پر تھا جس کے ساتھ ہی بارش کی مدہم ہوتی آواز شیشوں پر ایک بوجھل سا سماں باندھ رہی تھی۔ سلویٰ اس وقت کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندرونی کرب اور غصے سے سرخ ہو رہا تھا جبکہ مسٹر خان صوفے پر بیٹھے سگار کے دھوئیں کے مرغولوں کے پار اپنی بیٹی کو گہری اور متفکر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سلویٰ ابھی چند لمحے پہلے ہی مسٹر خان کے سامنے یہ صاف اور دوٹوک فیصلہ سنا چکی تھی کہ وہ اب حق کے ساتھ مزید ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی، ان کا رشتہ اب اپنی آخری حدوں کو چھو چکا تھا۔ مسٹر خان نے سگار کو ایش ٹرے میں رکھا، ایک گہرا سانس لیا اور دھیمے سلجھے ہوئے لہجے میں بولے۔
"سلویٰ تم تو ہمیشہ یہی کہتی تھیں نا کہ حق کو کسی کی پرواہ نہیں ہے؟ وہ ایک پتھر دل انسان ہے جو کسی سے محبت نہیں کر سکتا، اس کے سینے میں دل نہیں ہے... مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔"
مسٹر خان کی سالگرہ کی تقریب میں حق بزدار نے جو کچھ کیا تھا۔ جس انداز سے اس نے سب کے سامنے سلویٰ کے مان کو برقرار رکھا تھا وہ بات مسٹر خان کے دل کو لگ چکی تھی۔ وہ ایک جہاندیدہ انسان تھے اور مرد کی آنکھوں میں چھپی ملکیت اور پرواہ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔
"وہ سب ایک ڈرامہ ہے ڈیڈی! صرف ایک دکھاوا اور ناٹک ہے۔" سلویٰ نے یکدم مڑتے ہوئے تلخی سے کہا۔ اس کی آواز میں چھپی کڑواہٹ صاف جھلک رہی تھی۔ "وہ دنیا کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ کتنا پرفیکٹ ہے، وہ اپنے پرفیکٹ ہونے کے خبط میں یہ سب کرتا ہے تاکہ کوئی اس کی کسی چیز پر انگلی نہ اٹھا سکے۔"

مسٹر خان نے سلویٰ کی یہ تیکھی اور جذباتی باتیں انتہائی تسلی سے سنیں۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر کے ہانپنے لگی تو وہ نرمی سے اپنی جگہ سے اٹھے، اس کے پاس آئے اور اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"سلویٰ تم میری بیٹی ہو، مُجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ لیکن میں ایک باپ ہونے کے ناطے، دنیا دیکھ چکنے کے ناطے، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس فیصلے پر ایک بار پھر بالکل ٹھنڈے دماغ سے مزید سوچو۔ بعض اوقات جو ہمیں دکھائی دیتا ہے، سچائی اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ حق کا رعب اپنی جگہ مگر اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے جو حصار میں نے دیکھا ہے، وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔"

سلویٰ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دھیمی دستک ہوئی اور ان کا پرانا ملازم سر جھکائے اندر داخل ہوا۔

"صاحب... وہ... حق صاحب باہر تشریف لائے ہیں۔" ملازم نے انتہائی مؤدبانہ انداز میں اطلاع دی۔ "وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ میڈم سلویٰ اور بابا کامل کو لینے آئے ہیں۔"

ملازم کی یہ بات سنتے ہی سلویٰ کے پورے وجود میں جیسے آگ لگ گئی۔ وہ اندر ہی اندر مزید سلگ گئی مگر مسٹر خان کے سامنے مزید کچھ غلط بول کر اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے باپ اور امجد بزدار کے رشتے سے خوب واقف تھی۔

"دیکھا... وہ اپنی بیوی بچے کو لینے خود آیا ہے۔" مسٹر خان نے سلویٰ کا گال تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہیں حق سے ملنے کی ہر بار اتنی ہی خوشی ہوتی تھی جتنی پہلی بار ہوئی جبکہ سلویٰ وہیں کھڑی رہ گئی مگر کب تک؟ آخر جانا تو اسے حق کے ساتھ ہی تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی کی اسکرین پر وائپرز تیز رفتاری سے چل رہے تھے جو شیشے پر گرتی بارش کی بوندوں کو ایک ہی جھٹکے میں صاف کر دیتے مگر گاڑی کے اندر کا ماحول اس قدر گھٹن زدہ اور بھاری تھا کہ دونوں میں سے کسی کے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف لگی اسٹریٹ لائٹس کا پیلا نور گاڑی کے اندر بیٹھے ان دو وجودوں پر باری باری چمکتا اور پھر اندھیرے میں ڈوب جاتا۔ حق اسٹیئرنگ ویل پر اپنی مضبوط گرفت جمائے، انتہائی توجہ سے سامنے کالی چمکتی سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر کامل گہری نیند سو چکا تھا جس کی معصوم سانسوں کی مدہم آواز اس طوفانی خاموشی میں واحد سحر تھی۔ سلویٰ فرنٹ سیٹ پر بالکل سیدھی اور کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ اس کا پورا وجود حق کی اس زبردستی پر سلگ رہا تھا اور وہ اپنے اندر جمع ہوتے غصے کے لاوے کو باہر نکالنے کے لیے صحیح وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ حق نے ایک نظر سلویٰ کے سپاٹ اور رخ پھیرے چہرے پر ڈالی اور پھر نظریں سامنے سڑک پر جمالیں۔

"سلویٰ..." حق کی بھاری آواز رات کے اس پہر حد درجہ دھیمی اور مخلصانہ سنائی دی، "ہم... ہم دوبارہ شروعات کر سکتے ہیں۔" یہ جملہ اس نے خود کو جانے کتنی دفعہ مارنے کے بعد دہرایا تھا۔ سلویٰ کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی مگر اس کا رخ اب بھی کھڑکی کی طرف ہی رہا۔ حق نے اسٹیئرنگ پر سے اپنا ایک ہاتھ ہٹایا اور انتہائی نرمی سے جیسے وہ کسی بہت نازک چیز کو چھو رہا ہو، سلویٰ کے منجمد ہاتھ پر رکھنا چاہا مگر سلویٰ

نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔حق کا ہاتھ ہوا میں ہی رک گیا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔وہ اس وقت پورے دل سے بات کر رہا تھا۔وہ تمام ترمصنوعی پردے ہٹا کر اپنی روح اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔وہ یہ رشتہ توڑ نا نہیں چاہتا تھا۔

"میں یہ رشتہ اس طرح ختم نہیں کرنا چاہتا..." اس کے لہجے میں التجا اور کرب تھا جو اس کی شخصیت کا حصہ کبھی نہیں رہا تھا۔"مجھ سے غلطیاں ہوئیں، میں مانتا ہوں۔میرا مزاج، میرا یہ انداز شاید میں تمہیں وہ مان نہیں دے پایا جس کی تم حقدار تھیں لیکن میں اس شادی کو بچانا چاہتا ہوں۔میں اپنے پورے دل سے کہہ رہا ہوں۔چلو سب کچھ بھلا کر ایک نئی شروعات کرتے ہیں۔"

سلویٰ نے آہستہ سے اپنا سر گھمایا۔وہ کئی لمحے حق کو دیکھتی رہی پھر اس کے لبوں پر ایک تلخ اور تمسخرانہ مسکراہٹ ابھری۔

"دوبارہ شروعات؟" اس نے دھیمے مگر انتہائی کاٹ دار لہجے میں کہا۔"تم یہ رشتہ اس لیے ختم نہیں کرنا چاہتے کیونکہ تمہیں مجھ سے یا اس رشتے سے کوئی محبت ہے؟ نہیں ڈاکٹر حق بزدار! تم صرف خوفزدہ ہو۔"

حق کے قدم نے لاشعوری طور پر ایکسیلیٹر پر گرفت مدہم کی۔اس کی آنکھیں یکدم سکڑیں۔

"تم اندر سے بری طرح ڈرے ہوئے ہو..تم اس خوف میں مبتلا ہو کہ کہیں تمہاری یہ نام نہاد پرفیکٹ شادی ٹوٹ نہ جائے۔اگر یہ شادی ٹوٹ گئی تو لوگ تمہیں تمہارے ماضی کا طعنہ دیں گے۔لوگ کہیں گے کہ تاریخ نے خود کو دہرایا ہے، جیسے تمہاری ماں نے تمہارے باپ کا قتل کیا تھا ویسے ہی تمہاری بیوی نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔"

حق نے جبڑے بھینچ لیے اسٹیئرنگ پر اس کی انگلیوں کے جوڑ سفید پڑنے لگے۔سلویٰ اس کی زندگی کے اس سب سے حساس اور پوشیدہ زخم پر نمک چھڑک رہی تھی جسے اس نے ہمیشہ دنیا سے چھپا کر رکھا تھا۔

" مگر تم تو ہر معاملے میں پرفیکٹ ہو..." سلویٰ کا طنز اب اپنے عروج پر تھا اس کی آواز میں چبھن بڑھ گئی۔"ایک پرفیکٹ انسان جس کا ہر فیصلہ کامل ہوتا ہے، اس کی شادی کیسے ٹوٹ سکتی ہے؟ تم دنیا کے سامنے ناکام کیسے دکھ سکتے ہو؟ تم میری پرواہ نہیں ہے حق! تم صرف اپنے اس پرفیکٹ امیج اور خاندانی ساکھ کو بچانے کے لیے میرے سامنے یہ جھوٹی التجا کر رہے ہو۔تم صرف اس بدنامی سے بھاگ رہے ہو جو تمہارے ماں باپ کے ٹوٹے ہوئے رشتے کا سایہ بن کر تمہارے پیچھے آ رہی ہے۔"

سلویٰ اسے واقعی گھائل کر رہی تھی۔وہ جانتی تھی کہ حق کو کہاں چوٹ مارنی تھی اور اس نے بالکل صحیح جگہ پر وار کیا تھا۔اور حق جو چند منٹ پہلے تک پورے دل سے اپنے رشتے کی التجا رہا تھا، ان طنز بھرے جملوں کے بعد اندر سے کرچی کرچی ہوا۔اس کی آنکھوں کی چمک مدہم پڑ گئی اور اس کا چہرہ درد اور زردی کی ایک گہری چادر میں لپٹ گیا۔وہ واقعی گھائل ہو چکا تھا...ایسا گھائل جس کا علاج اس کے اپنے ہسپتال کے کسی سرجن کے پاس نہیں تھا۔اس نے کچھ نہیں کہا۔کوئی صفائی پیش نہیں کی، کوئی غصہ نہیں دکھایا اور نہ ہی کوئی حاکمانہ جملہ بولا۔وہ بالکل خاموش ہو گیا۔گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی اور حق نے اپنی نظریں دوبارہ سامنے سڑک پر جما دیں جہاں اندھیرا اور بارش اب اور گہرے ہو چکے تھے۔

اس بارانی رات کے دھند لکے میں ایک الفا نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور خاموش پسپائی اختیار کر لی تھی جبکہ سلویٰ دوبارہ کھڑکی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی یہ جانے بغیر کہ اس کے اس ایک وار نے حق کے اندر کیا کچھ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

صبح کی پہلی سنہری دھوپ شبگیر ہاؤس کے روشن دانوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ کچن سے چائے کی پتی اور دیسی گھی کے پراٹھوں کی اشتہا انگیز خوشبو پورے گھر میں مہک رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر دادی اماں ہمیشہ کی طرح بیٹھیں تسبیح پڑھ رہی تھیں اور ساتھ ہی کچن کے چکر لگاتی نیمل پر نظر رکھے ہوئے تھیں جو بہت سلیقے سے ناشتے کے برتن اور لوازمات میز پر سجا رہی تھی۔ اوپر کے پورشن میں سلال اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے ابھی تک گہری توجہ سے پڑھائی میں مصروف تھا جبکہ دوسری طرف نامرہ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ سرمد صاحب اپنے کمرے میں آئینہ کے سامنے کھڑے، آفس کے لیے تیار ہو رہے تھے اور ان کے جوتوں کی مدہم سی آواز کبھی کبھار راہداری میں سنائی دے جاتی تھی مگر لاؤنج کے مرکزی صوفے پر بیٹھے دو افراد بڑی سنجیدگی کے ساتھ ایک دوسرے کے مہرے کاٹ رہے تھے۔ لاؤنج کی شیشے والی میز کے ایک جانب صوفے پر سقراط بیٹھا تھا جبکہ دوسری جانب اپنے اسکول کے یونیفارم پر گہرے نیلے رنگ کا کوٹ پہنے نوفہ جم کر بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان شطرنج کا بورڈ کھلا تھا اور دونوں کی نظریں مہروں پر جمی ہوئی تھیں۔

سقراط اس وقت گھر کے عام آرام دہ کپڑوں میں تھا۔ سڑک پہ ہونے والے ہولناک حادثے نے اسے اچھی خاصی چوٹیں پہنچائی تھیں۔ ماتھے کی چوٹ کے علاوہ اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جو فریکچر کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ ٹخنے پر بھی شدید چوٹ تھی۔ اسکی کہنیاں چھل گئی تھیں۔ اس لیے آج وہ کالج نہیں گیا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد نوفہ کو بھی شطرنج کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ شطرنج کی اچھی کھلاڑی تھی اور اس وقت وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سقراط کو چاروں طرف سے گھیر چکی تھی۔ سقراط اپنے بائیں ہاتھ سے بڑی مشکل سے ایک ایک مہرہ آگے سرکا رہا تھا مگر اس کا وزیر اور ہاتھی دونوں ہی نوفہ کے پیادوں اور گھوڑے کے نرغے میں آ چکے تھے۔

"چاچو! اب آپ کا بچنا ناممکن ہے۔ اگر آپ نے یہ اونٹ آگے کیا تو میرا گھوڑا آپ کے بادشاہ کو شہ دے دے گا۔" نوفہ نے اپنی چال چلتے ہوئے انتہائی فاتحانہ اور چیلنجنگ نظروں سے سقراط کو دیکھا۔ سقراط نے اپنی گہری آنکھیں سکون سے بورڈ پر جمائیں۔ اس نے اپنی ہار کو بالکل صاف اور واضح طور پر اپنے سامنے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگلی دو چالوں میں اس کا کھیل ختم ہونے والا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک لاپرواہ سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے کسی عجلت کے بغیر اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک ہی جھٹکے میں شطرنج کے بورڈ کو الٹتے ہوئے سارے مہرے نیچے فرش پر پھینک دیے۔ لکڑی کے مہرے فرش پر ہر طرف بکھر گئے۔

"چاچو... یہ چیٹنگ ہے۔" نوفہ نے صوفے پر اچھلتے ہوئے شدید دہائی دی، اس کا چہرہ غصے اور حیرت سے سرخ ہو گیا۔ "یہ سراسر ناانصافی ہے۔"

سقراط نے انتہائی سکون سے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف سیٹ کیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ہارنے کا کوئی ملال نہیں تھا۔

" کھیل کا ایک بنیادی اصول ہوتا ہے۔" سقراط نے اپنی دھیمی اور گہری آواز میں کہا۔ "جب ہارنے لگو تو کھیل بگاڑ دو!" اس کی منطقیں نرالی تھیں۔

"یو آر اے چیٹر چاچو! میں اب آپ کے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔" نوفہ نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے غصے سے پیر پٹخا۔ سقراط نے انتہائی شاہانہ انداز میں اپنا سر خم کیا جیسے وہ کسی بہت بڑے اعزاز کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

"چیٹر ...چیٹر ...چیٹر ..." چغلی خان کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ اسی لمحے نیمل کچن سے باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشے کا گلاس تھا جس میں ہلدی ملا ہوا نیم گرم دودھ چمک رہا تھا جو وہ خاص طور پر سقراط کی چوٹوں کے لیے بنا کر لا رہی تھی تا کہ اسے درد سے کچھ راحت مل سکے۔

"تارہ کہاں ہے؟ وہ بھی تک تیار نہیں ہوئی؟"

وہ ابھی سقراط کی میز کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اچانک اس کے ایپرن کی جیب میں رکھا اس کا فون بج اٹھا۔ نیمل نے دودھ کا گلاس میز پر رکھا اور فون باہر نکالا۔

جیسے ہی اس کی نظریں فون کی اسکرین پر پڑیں، اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔ اسکرین پر سفید روشنی میں واضح طور پر فیانسی لکھا ہوا چمک رہا تھا۔ نیمل کی چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے ایک نظر لاؤنج میں بیٹھے سقراط اور نوفہ پر ڈالی جواب فرش سے مہرے اٹھانے کی بحث میں مصروف تھی اور پھر وہ فون کان سے لگاتی ہوئی دھیمے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے انتہائی دھیمے اور متوازن لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"وعلیکم السلام نیمل! کیسی ہو؟ اور گھر میں سب کیسے ہیں؟ سقراط چاچو کے حادثے کا سنا تھا، اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟" دوسری طرف سے شاہ زیب کی آواز گونجی۔ جس نے پہلے روایتی طور پر گھر کے تمام افراد کی خیریت دریافت کی۔

"اللہ کا شکر ہے، سب ٹھیک ہیں۔ چاچو کو چوٹیں آئی ہیں، فریکچر بھی ہے مگر اب وہ بہتر ہیں اور گھر پر ہی ہیں۔" نیمل نے اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"شکر ہے۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ شادی کے دن اب بہت قریب ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ آج ہم دونوں ولیمے کی شاپنگ کے لیے ساتھ چلیں۔ شام میں تمہاری طرف آجاتا ہوں۔ چاچو سے بھی مل لوں گا اور پھر شاپنگ کر لیں گے۔" تیس سالہ شاہ زیب احترام میں سقراط کو چاچو ہی کہتا تھا۔ شاہ زیب کی بات سن کر نیمل کے تاثرات میں ایک ہلکا سا تذبذب ابھرا۔ اس نے فون ہاتھ میں تھامے ہوئے نظریں اٹھائیں اور سامنے لاؤنج اور ڈائننگ ایریا کی طرف دیکھا جہاں صبح کا منظر اب پوری طرح واضح ہو چکا تھا۔ وہاں زندگی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ رواں تھی۔ تارہ جو ابھی سکول کے لیے تیار ہو کر آئی تھی اور صوفے کے پاس کھڑی، ہوم جرسی ٹی شرٹ سے جھلکتے سقراط کے کسرتی بازوؤں کو چھو کر اس کی چوٹ کا اندازہ لگا رہی تھی۔

"ویسے آپ کے بازوؤں میں دم بھی ہے یا نہیں؟"

سقراط نے اگلے ہی پل اپنے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن اپنے بازو کے حصار میں دبوچ لی جس پر تارہ کی آنکھیں اور زبان دونوں باہر نکل آئیں۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ دوسری طرف، سلال نیچے اتر آیا تھا اور اب دادی کے پاس بیٹھ کر انہیں تنگ کرنے اور ان کی تسبیح چھیننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسی بیچ سرمد صاحب بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر ڈائننگ میز پر پہنچ چکے تھے، ان کے ہاتھ میں

شادی کے اخراجات اور دوسرے کاموں کی ایک طویل لسٹ تھی جسے وہ بہت سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔گھر اس وقت مکمل تھا۔اپنے تمام رنگوں،محبتوں اور رونقوں کے ساتھ!نیمل کو ان سب کے درمیان شاہ زیب کے ساتھ یوں شاپنگ پر جانا اس لمحے کچھ عجیب سا لگا۔اس کا دل اس روایتی حصار سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔اس نے ایک گہرا سانس لیا اور انتہائی نفاست اور سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"شاہ زیب...شادی میں صرف چند دن باقی ہیں۔مجھے نہیں لگتا ہمیں یوں ملنا چاہیے۔

ولیمے کے لباس کے لیے آپ کے گھر والے جو بھی پسند کر کے لیں گے مجھے وہ پورے دل سے قبول ہوگا۔"

"نیمل!تمہارا خاندان ذہنی طور پہ اتنا پست نہیں ہے۔میرا نہیں خیال کہ انہیں اتنی سی بات پہ کوئی اعتراض ہوگا یا وہ اسے برا مانیں گے۔یہ ہماری شادی ہے اور اگر ہم ساتھ جا کر شاپنگ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"شادی کی کچھ روایات ہوتی ہیں...پھر بھی میں سوچ کر بتاؤں گی۔"

وہ فون پہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔نازک رشتہ تھا نازک موڑ تھا اسے سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔

"ٹھیک ہے۔اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو پھر جیسے تم چاہو۔میں بعد میں بات کرتا ہوں۔"شاہ زیب نے سرد اور غیر مطمئن لہجے میں کہا اور نیمل کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔اسکرین سیاہ ہو چکی تھی۔نیمل نے فون کو دیکھا،اس کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے سوچ کا گہرا سایہ لہرایا۔شاہ زیب اور اس کی شادی گھر والوں نے طے کی تھی۔یہ پسند کی شادی نہیں تھی پھر اسے پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔اس نے ایک دھیما سا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے دماغ سے اس تلخی کو باہر نکال پھینکنا چاہتی ہو اور کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج کی طرف نکل آئی۔ان چونچلوں،ناراضگیوں اور شاپنگ کے ارمانوں کے لیے تو اس کے پاس آگے چل کر ساری عمر پڑی تھی۔یہ وقت ان چیزوں کا نہیں تھا۔ابھی اس کے سامنے اس کا باپ تھا جو لسٹ ہاتھ میں تھامے اپنی بیٹی کو رخصت کرنے کی تیاریوں میں جتا ہوا تھا۔نیمل کے لیے اس وقت سب سے اہم اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا تھا اور وہ اپنے انہی مضبوط قدموں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی جہاں ناشتے کی میز اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

صبح کی تیز روشنی چیف میڈیکل آفیسر یعنی ڈاکٹر نجف بزدار کے وسیع اور جدید دفتر کے شیشوں کو پار کرتی ہوئی اندر پھیلی ہوئی تھی۔بارش کے بعد مطلع صاف تھا۔دفتر کی فضا میں ایک عجیب سی خنکی اور تناؤ تھا جو وہاں رکھی میڈیکل رپورٹس اور انکوائری فائلز کی وجہ سے مزید بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔نجف اپنی گھومنے والی لیدر چیئر پر بیٹھی سامنے میز پر کھلی ایک فائل کو سکتے کے عالم میں دیکھ رہی تھی جہاں نرس نفیسہ کا آفیشل استعفیٰ اور جرم کا اعتراف نامہ موجود تھا۔یہ فائل کوئی اور نہیں بلکہ چند لمحے پہلے ڈاکٹر حق خود اس کے دفتر میں لے کر آیا تھا۔وہ اب پرسکون سا اس کے سامنے بیٹھا تھا اور بڑی دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا بلکہ اسکے تاثرات جانچ رہا تھا۔

"وہ اپنا جرم قبول کر چکی ہے اور میرا نہیں خیال اب ہمیں اس مسئلے پر زیادہ فوکس کرنا چاہیے۔"حق نے دھیمے اور نپے تلے لہجے میں نجف کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔نجف نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا۔اس کی آنکھوں میں شدید غصہ اور پے در پے صدمے کی لہریں تھیں۔اس

نے فائل کو حق کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔
"یہ بکواس ہے ڈاکٹر حق! بالکل جھوٹ ہے۔ میں نفیسہ کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ اتنی بڑی غفلت کبھی نہیں کر سکتی۔ یقیناً اسے دھمکایا گیا ہوگا، اسے مجبور کیا گیا ہوگا کہ وہ یہ سب اپنے سر لے۔"
"کوئی اسے کیوں دھمکائے گا ڈاکٹر نجف؟" حق کے لبوں پر باریک سی طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور غائب ہوگئی۔ "میڈیکل ریکارڈ اور اس کے اپنے دستخط گواہ ہیں۔ حقیقت کے سامنے جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"
یوں تو وہ رشتے میں حق کی سوتیلی پھوپھو تھی لیکن اس ہسپتال کی چہار دیواری کے اندر ان دونوں کی پوزیشنیں، ان کا رتبہ اور ان کا اندازِ گفتگو بالکل الگ تھا۔ یہاں وہ چیف میڈیکل آفیسر تھی اور حق اس ہسپتال کا سب سے بااثر سینئر سرجن اور بورڈ کا میمبر تھا۔ فی الوقت ان کے درمیان خاندانی رشتوں کی نرمی کے بجائے ہمیشہ ایک پروفیشنل اور سرد جنگ کی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔
"آج بورڈ میٹنگ ہے۔" حق نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بات کو حتمی موڑ دیا، "میں چاہتا ہوں کہ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے آپ اپنا موقف بالکل کلیئر کر لیں۔ آپ چاہیں تو خود نرس سے بات کر کے تصدیق کر لیں۔ ہمیں یہ کیس اب ہر حال میں بند کرنا ہوگا۔"
نجف ابھی تک سکتے کی سی حالت میں تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ جو نرس کل تک اپنے انصاف کے لیے اڑی ہوئی تھی، وہ اچانک راتوں رات اس طرح گھٹنے کیسے ٹیک سکتی تھی؟ حق نے نجف کے چہرے پر ابھرتی ہوئی بے بسی کو دیکھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے آپس میں پھنسائے اور نجف کی آنکھوں میں جھانکا۔
"ڈاکٹر نجف! آپ ایک چیف میڈیکل آفیسر ہیں۔ اس کرسی پر بیٹھ کر آپ اسٹاف کے ساتھ اس طرح جذباتی طور پر اٹیچ نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی اپنی فیملی کے کسی ڈاکٹر کو بچانے یا گرانے کے لیے اپنے جذبات کا استعمال کر سکتی ہیں۔ ایڈمنسٹریشن صرف ٹھوس شواہد پر چلتی ہے۔ نرس نے سائن کر دیے ہیں، کیس کلوز ہو چکا ہے۔ اب اس مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کا مطلب ہسپتال کی بدنامی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔"
وہ چند پل کے لیے خاموش ہوا۔
"ڈاکٹر نجف! آپ اتنی جذباتی کبھی بھی نہیں تھیں..."
نجف نے خالی خالی نگاہوں سے حق کو دیکھا۔ کیا وہ واقعی جذباتی طور پہ کمزور پڑ رہی تھی؟ کیا وہ واقعی بدل گئی تھی؟ حق نے چند اور ایسی باتیں کیں جو نجف کو یہ ماننے پر مجبور کر گئیں کہ اب اس کیس کو آگے بڑھانا فضول تھا۔ وہ چند باتیں کرنے کے بعد جانے کے لیے اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس نے اپنے کوٹ کو درست کیا اور دروازے کی طرف چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ عقب سے نجف کی حد درجہ سنجیدہ اور لرزتی ہوئی آواز ابھری۔
"میں جاننا چاہتی ہوں..."
حق کے مضبوط قدم وہیں دہانے پر ٹھہر گئے۔ وہ بہت دھیرے سے پلٹا اور نجف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شہد رنگ سنہری آنکھیں، نیلی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

نجف کی ان نظروں میں اس وقت ایک ہلکی سی پوشیدہ التجا تھی جو اس نے کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

"جاننا چاہتی ہوں کہ میرے سینے میں دھڑکتا یہ دل... کس کا ہے؟"

اس ایک سوال نے جیسے پورے کمرے کی ہوا کو منجمد کر دیا۔حق کے چہرے کا رنگ یکدم بدلا...بس ایک پل کے لیے، اس کے تاثرات میں ایک ہلکی سی سختی آئی مگر اگلے ہی سیکنڈ میں وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔اس کا

چہرہ دوبارہ اسی سنگِ مرمر کی طرح سپاٹ ہو گیا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ڈاکٹر نجف!" حق نے انتہائی سنجیدگی اور بے رخی سے کہہ کر رخ موڑا اور دوبارہ دروازے کی جانب بڑھا۔وہ اکیلا گواہ تھا۔اگر وہ بھی نہ بتاتا تو نجف کہاں جاتی؟ جیسے ہی حق نے چمکتے ہوئے ہینڈل پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا، نجف کی اگلی بات نے اسے ایک بار پھر وہیں ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

"وہ لوٹ آیا ہے۔"

کمرے میں صرف یہی چار الفاظ گونجے۔حق کے ماتھے پر ہلکی سی شکنیں ابھریں، اس کی آنکھیں یکدم سکڑیں۔اس نے انجان بنتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

" کون؟"

"سقراط!" وہ بمشکل گویا ہوئی۔

" کون سقراط؟"

حق کا یہ سکون اور بے نیازی اس وقت واقعی دیدنی تھی۔نجف اپنی کرسی پر بیٹھی اسے جانچتی اور گہری نگاہوں سے مسلسل دیکھ رہی تھی۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ حق کبھی کچھ نہیں بھولتا۔وہ بھولنے والے انسانوں میں سے تھا ہی نہیں پھر وہ اتنے بڑے نام پر اس قدر انجان کیسے بن سکتا تھا؟ نجف نے ایک لمبا سانس لیا، اپنے چہرے کے تاثرات کو یکدم بدلا اور اگلے ہی پل وہ خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی جیسے وہ اس بحث کو یہیں ختم کرنا چاہتی ہو۔

"نہیں...کوئی نہیں۔" اس نے فائل بند کرتے ہوئے کہا، "میٹنگ میں ملتے ہیں۔"

حق نے سر کو ہلکا سا خم دیا، ہینڈل گھمایا اور بغیر مڑے مضبوط قدموں سے آفس سے باہر نکل گیا جبکہ نجف اس خالی دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔کیا وہ زیادہ سوچ رہی تھی؟ کیا اس کی ذہنی حالت خراب ہو رہی تھی؟ کیا وہ واقعی ٹھیک نہیں تھی؟ سوال بہت تھے مگر جواب کون دیتا؟ تھک ہار کر اس نے میز پر سر گرا دیا۔

☆☆☆☆☆

ہال کی سیڑھیوں نما نشستوں پر آخری سال کے میڈیکل اسٹوڈنٹس اپنے اپنے آئی پیڈز، لیپ ٹاپس اور موٹی میڈیکل بکس کھولے پوری توجہ سے سامنے اسٹیج پر موجود بڑی پروجیکٹر اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔اسکرین پر اس وقت نیوروپیتھالوجی کی ایک انتہائی پیچیدہ سلائیڈ کھلی تھی

جس پر ایک انسانی دماغ کے اسٹیم کے کراس سیکشنل امیجز اور کلینیکل کیس کی ہسٹری لکھی ہوئی تھی۔اسٹیج پر موجود شعبہ پیتھالوجی کے سخت گیر پروفیسر، ڈاکٹر وحید اپنے ہاتھ میں لیزر پوائنٹر تھامے عینک کے اوپر سے پوری کلاس کا جائزہ لے رہے تھے۔وہ اپنی اچانک پمپنگ (بغیر بتائے مشکل سوال پوچھنے) کی وجہ سے پورے میڈیکل کالج میں خوف کی علامت سمجھے جاتے تھے۔

"تو کلاس! یہ ہمارے سامنے ایک پچپن سالہ مریض کا کلینیکل منظر نامہ ہے۔" پروفیسر کی بھاری آواز ہال کے اسپیکرز میں گونجی۔"مریض کو اچانک چکر آتے ہیں، اسے نگلنے میں دشواری ہے اور سب سے اہم بات... اس کے چہرے کے بائیں طرف اور جسم کے دائیں طرف درد اور درجہ حرارت کی حس (Painand Temperature Sensation) ختم ہو چکی ہے۔اب مجھے کون بتائے گا کہ دماغ کے کس مخصوص حصے میں خرابی ہے، اس سنڈروم کا نام کیا ہے اور یہاں کون سی شریان بند ہوئی ہے؟"

پوری کلاس میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔بہت سے اسٹوڈنٹس بولنا چاہتے تھے مگر غلط جواب ہونے پر پروفیسر وحید کی طرف سے جو کٹیلی باتیں سننے کو ملتی تھیں اس کی وجہ سے تقریباً سبھی خاموش تھے۔جب کوئی نہیں بولا تو پروفیسر کی نظریں تیسری رو میں بیٹھی عالیہ پر رکیں۔

"یس مس عالیہ! پلیز ڈائیگنوز دس کیس۔" پروفیسر نے عالیہ کو چن لیا تھا۔عالیہ پر اعتماد انداز میں اپنی سیٹ سے کھڑی ہوئی۔اس نے اپنے سفید اسٹوڈنٹ کوٹ کو درست کیا اور اسکرین پر لکھے علامات کے تانے بانے جوڑنے لگی۔وہ ایک لائق اسٹوڈنٹ تھی اس لیے اس نے فوراً بنیادی چیز کو پکڑ لیا۔

"سر چونکہ مریض کے چہرے اور جسم کی علامات مخالف سمتوں میں ہیں اس کا مطلب ہے کہ لیژن ()Lesion ہر حال میں برین اسٹیم کے اندر موجود ہے۔" عالیہ نے اپنے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"گڈ! آگے بڑھو۔برین اسٹیم کا کون سا حصہ؟ اور سنڈروم کا نام؟" پروفیسر نے اسے مزید آگے دھکیلا۔

عالیہ یہاں آکر تھوڑا تذبذب کا شکار ہوئی۔اس کے دماغ میں میڈولا اور پونز کے مختلف ٹریکٹس آپس میں الجھنے لگے۔"سر... یہ شاید پونز کا کوئی لیژن ہے اور شریان... شریان شاید انٹیرئیر اسپیرئیر سیریبیرل آرٹری ہو گی؟" عالیہ کی آواز میں اب وہ پہلا سا اعتماد نہیں رہا تھا، وہ کنفیوز ہو رہی تھی۔

"غلط! بالکل غلط پاتھ وے پر جا رہی ہو تم عالیہ! ایک ٹاپر سے مجھے اس سطحی جواب کی امید نہیں تھی۔" پروفیسر نے ناپسندیدگی سے سر ہلایا۔

"بیٹھ جاؤ!"

عالیہ کا چہرہ ایک پل میں زرد پڑ گیا۔وہ انتہائی شرمندگی اور خفت کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میں موجود پین کی گرفت اس کے نوٹس پر سخت ہو گئی۔

"کلاس میں کوئی اور؟ جو اس نیورولوجیکل پہیلی کو سلجھا سکے؟" پروفیسر نے چیلنج کیا۔

اسی رو کے دوسرے کونے سے حد درجہ نپی تلی آواز ابھری۔

"سر میں ٹرائی کروں؟"

سب نے مڑ کر دیکھا۔ یہ سلال تھا۔ سلال نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر سیدھا پروجیکٹر اسکرین کی طرف دیکھا۔ چہرے پر سوچ کے تانے بانے ابھرے۔

"جی سلال، مائیک از یوئرز۔ ثابت کرو کہ تم نے نیورو پیتھالوجی کو صرف رٹا نہیں مارا۔" پروفیسر نے بازو سمیٹتے ہوئے کہا۔

سلال نے گہرا سانس لیا اور کیس کو کھولنا شروع کیا۔

"سر مریض کو نگلنے میں دشواری ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا نیوکلئیس ایمبیگوس متاثر ہوا ہے۔ چہرے پر اسی طرف اور جسم پر دوسری طرف درد کا ختم ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ٹرائجیمینل نیوکلئیس اور اسپائنوتھیلامک ٹریکٹ (Spinothalamic Tract) دونوں ایک ساتھ لپیٹ میں آئے ہیں۔ اور یہ تمام اسٹرکچرز دماغ کے پونز میں نہیں بلکہ لیٹرل میڈولا میں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔"

سلال نے ایک پل کا توقف کیا۔

"اس لیے یہ کلاسک لیٹرل میڈولری سنڈروم ہے جسے ہم والن برگ سنڈروم (Wallenberg's Syndrome) بھی کہتے ہیں اور یہاں جو شریان بند ہوئی ہے وہ ہے پوسٹیریئر انفیریئر سیریبیرل آرٹری یعنی PICA ہے۔"

کلاس میں گہری خاموشی چھا گئی۔ پروفیسر وحید کے سخت چہرے پر جاندار اور تعریفی مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے زور سے ڈیسک تھپتھپائی۔

"آؤٹ اسٹینڈنگ، سلال! یہ ہے ایک حقیقی میڈیکل اسٹوڈنٹ کا دماغ۔ تم نے نہ صرف کیس ڈائیگنوز کیا بلکہ اس کی اینا ٹمی کو بھی لاجیکلی درست ثابت کیا۔ ویل ڈن، بیٹھ جاؤ۔"

پوری کلاس نے سلال کے لیے ہلکی سی تالیاں بجائیں مگر ان تالیوں کی گونج عالیہ کے کانوں میں کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری۔ اس نے اپنی نظریں نیچے اپنے آئی پیڈ پر جما دیں جہاں اس کی انگلیوں کے جوڑ دباؤ کی وجہ سے سفید پڑ رہے تھے۔ اس کے اندر پھر سے جلن کی ایک زہریلی لہر پنپنے لگی مگر اسے خود پر ضبط کرنا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اپنے اندر کے اس طوفان کو وہیں دفن کیا اور اپنے چہرے پر نفاست پسندانہ اور جھوٹی پرسکون مسکراہٹ سجا لی۔ اس نے بہت نارمل انداز میں اپنا سر گھمایا اور سلال کی طرف دیکھ کر اس طرح سر ہلایا جیسے وہ ایک اچھی کلاس فیلو کی حیثیت سے اس کی ذہانت کو سراہ رہی ہو۔ گھنٹی بجی اور کلاس کا ٹائم ختم ہو گیا۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سیڑھیاں اترتی دروازے کی جانب بڑھی۔ فی الوقت اسے پروفیسر وحید کی شکل نہیں دیکھنی تھی۔

☆☆☆☆☆

سرمد صاحب کے کمرے میں میز پر شادی کے کارڈز کچھ فائلیں اور حساب کتاب کی ڈائری کھلی پڑی تھی جس کے سامنے وہ گہری سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سلال کو کچھ دیر پہلے اپنے کمرے میں بلایا تھا تاکہ نیمل کی شادی کے ایک انتہائی اہم فیصلے پر مشورہ کر سکیں۔

سلال جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے سقراط بھی تھا جو دھیمے قدموں سے چلتا ہوا وہاں آیا تھا۔ سقراط نے پہلے تو ان کے کمرے میں آنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے درمیان ماضی کی جو دوریاں، شکایتیں اور خاموش دیواریں تھیں وہ اسے اس دہلیز کو پار کرنے سے روک رہی تھیں۔ لیکن جب سلال نے اسے بتایا کہ بات نیمل کی شادی اور اس کے مستقبل کی ہے تو سقراط اپنی انا اور

تمام گلے شکوے باہر ہی چھوڑ آیا۔ نیمل کے لیے اس کا خلوص ہر رشتے سے بالاتر تھا۔ سرمد صاحب نے سقراط کو دیکھتے ہوئے گلہ کھنکارا۔

"سلال... میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں نیمل کو جہیز میں ایک گاڑی دینا چاہتا ہوں۔" سرمد صاحب نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھتے ہوئے گہرے اور سنجیدہ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ "میں اپنی بیٹی کو دنیا کی سب سے بہترین گاڑی دینا چاہتا ہوں۔ وہ گاڑی جو اس کے معیار کے مطابق ہو مگر... مگر میرا بجٹ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آرہا کہ اس محدود رقم میں کون سی گاڑی فائنل کروں۔"

سلال نے اپنے باپ کے چہرے پر پھیلی فکرمندی کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ نیمل کیسی طبیعت کی مالک تھی۔

"پاپا... میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں آپ کو ایک بار نیمل سے خود مشورہ کر لینا چاہیے۔" سلال نے نہایت نفاست سے اپنی رائے دی۔

"اگر آپ ان سے پوچھے بغیر ایسا کوئی بڑا فیصلہ کریں گے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ وہ شاید اس بات پر برا مان جائیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ نہیں مانے گی۔" سرمد صاحب نے بے بسی سے سر ہلایا۔ "اگر میں نے اس سے پوچھا تو وہ کبھی مُجھے اس کی اجازت نہیں دے گی۔ الٹا وہ مُجھے باتیں سنائے گی۔"

یہاں سقراط نے اپنا گلا کھنکارا اور اپنے بائیں ہاتھ کے اشارے سے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے نہایت سلجھے انداز میں بولنا شروع کیا۔

"اگر آپ نے نیمل کو گاڑی دینی ہی ہے تو اسے جہیز کا نام دے کر اس بساط پر مت رکھیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر گاڑی دینی ہے تو شادی کے کچھ عرصے بعد دیں یا پھر ابھی وہ رقم سیدھی نیمل کے ہاتھ میں یا اس کے اکاؤنٹ میں دے دیں تاکہ وہ اپنی مرضی سے جو لینا چاہے لے لے۔ اگر آپ اسے یہاں سے جہیز کے نام پر گاڑی دیں گے تو کل کو باقی بچیوں کے آنے والے رشتوں کے لیے خاندانی اور معاشرتی توقعات بہت زیادہ بڑھ جائیں گی۔"

سرمد صاحب نے سقراط کی بات سنی، ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی تلخی ابھری۔

"مُجھے اپنے سارے بچے جان سے زیادہ عزیز ہیں مگر جو ساتھ نیمل نے میرا اس گھر کی تنگیوں میں دیا ہے وہ کوئی نہیں دے سکتا۔ میری بیٹی اب ایک بڑی وکیل بن چکی ہے۔ میں نے دن رات اس کی محنت دیکھی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ کل کو اپنے سسرال میں یا اپنی پروفیشنل لائف میں لوکل گاڑیوں یا پبلک ٹرانسپورٹ کے دھکے کھاتی پھرے۔ وہ یہ ڈیزرو نہیں کرتی۔ میری بیٹی دنیا کی ساری آسائشیں ڈیزرو کرتی ہے۔"

سرمد صاحب کی اس بات پر کمرے میں ایک گہرا سکوت چھا گیا۔ پچھلے سات سالوں سے سرمد صاحب کے پاس ایک ہی پرانی گاڑی تھی۔ انہوں نے ان سات سالوں میں کبھی اپنی ذات پر ایک روپیہ اضافی خرچ نہیں کیا تھا، نہ کبھی اپنے آرام کا سوچا تھا۔ وہ اسی پرانی سواری پر گزارا کرتے رہے مگر جب بات ان کے بچوں کی آتی تھی تو وہ اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی اس کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے۔

"پاپا..." سلال نے اب کچھ مزید نرمی سے انہیں دیکھا۔ "شاہ زیب بھائی کے پاس اپنی دو گاڑیاں موجود ہیں، انکا لائف اسٹائل بہت اچھا ہے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ ایسے بی ہیو کر رہے ہیں جیسے ہم نیمل کو کسی ایسے گرے پڑے گھر میں پھینک رہے ہیں جہاں کچھ بھی نہیں

ہے اور وہ وہاں جا کر پریشان ہوں گی۔ حوصلہ رکھیں۔" اس نے باپ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔
سلال کی اس بات پر سرمد صاحب کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ سقراط نے مزید کچھ عملی مشورے دیے اور گاڑیوں کے مختلف ماڈلز اور مارکیٹ ویلیو کے حساب سے بات کو سمیٹا۔ کافی دیر کی بحث اور گفتگو کے بعد بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ سرمد صاحب وہ مخصوص رقم نیمل کے بینک اکاؤنٹ میں خاموشی سے ٹرانسفر کر دیں گے۔ شادی کے بعد جو بھی گاڑی اس کی ضرورت اور پسند کے مطابق ہوگی یا وہ رقم سے کچھ اور کہنا چاہے وہ لے لی گئی۔ اس طرح نیمل کا مان بھی رہ جائے گا اور سرمد صاحب کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ جب یہ بڑا مسئلہ حل ہو گیا تو سرمد صاحب نے اپنی ڈائری دیکھتے ہوئے ایک اور گہرا سانس لیا۔
"آج میرج ہال کا بھی ایک چکر مزید لگانا ہے۔ وہاں کیٹرنگ اور لائٹس کے کچھ انتظامات فائنل کرنے باقی ہیں۔ میں نے ڈیکوریشن مزید بہتر کرنے کا کہا تھا۔"
سرمد صاحب نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تو سقراط فوراً بول اٹھا۔
"میں چکر لگا آؤں گا۔" اس کے ماتھے کی چوٹ اور ہاتھ کا فریکچر اپنی جگہ تھا، سرمد صاحب سے اس کی شکایتیں اور دوریاں بھی اپنی جگہ قائم تھیں مگر جب بات نیمل کی خوشیوں کی تھی تو وہ ان سب سے بالاتر ہو کر پورے دل سے مخلص تھا۔ وہ اپنی ہر تکلیف، ہر زخم بھلا کر اس شادی کو پرفیکٹ بنانے کے لیے تیار کھڑا تھا اور شام کے وقت وہ متعلقہ میرج ہال پہنچ چکا تھا۔ ہال کے اندرونی حصے میں شادیوں کے سیزن کے سلسلے میں مزدور اور ڈیکوریٹرز اسٹیج کی سیٹنگ، صوفوں کی ارینجمنٹ اور فانوس کی صفائی میں مصروف تھے۔ فضا میں ہتھوڑے چلنے اور کپڑے کھینچنے کی ہلکی ہلکی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سقراط ہال کے مینیجر کے ساتھ مرکزی کوریڈور کے پاس کھڑا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کے اشاروں سے مینیجر کو لائٹنگ اور کیٹرنگ کے مینو کے حوالے سے آخری ہدایات دے رہا تھا۔
اقبال جو کسی کام کے سلسلے میں وہاں آیا تھا اور فون جیب میں رکھتے ہوئے جیسے ہی اس نے سامنے دیکھا، اس کے قدم وہیں فرش پر جیسے جم گئے۔ وہ پل بھر کو بالکل ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کے ایک ملے جلے تاثر سے پھیل گئیں۔ وقت اور حادثات نے سقراط کے چہرے پر سنجیدگی کی کچھ نئی لکیریں ضرور کھینچ دی تھیں، وہ پہلے جیسا بالکل نہیں رہا تھا مگر اس کے باوجود اسے پہچاننا کچھ خاص مشکل
نہیں تھا۔ مینیجر اس کی چوٹوں کو دیکھنے کے باوجود اس کے حاکمانہ لہجے کے سامنے مسلسل سر ہلا کر اس کی ہر بات نوٹ کر رہا تھا۔
"یہ... یہ واپس کب آیا؟"
اقبال کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو انہوں نے برسوں پہلے اس بساط سے بے دخل کر دیا تھا وہ یوں اچانک ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ شدید حیرانی اور اضطراب کے عالم میں اقبال نے فوراً اپنی جیب سے فون نکالا۔ اس کی نظریں اب بھی سامنے گاڑیوں کے پاس کھڑے سقراط پر جمی ہوئی تھیں جو اب مینیجر سے کوئی آخری بات کر رہا تھا۔ اقبال نے کپکپاتے انگوٹھے سے اسکرین کو سوائپ کیا اور تیزی

سے ایک مخصوص نمبر ملایا۔اس کے فون کی اسکرین پر سفید روشنی میں Alpha لکھا چمک رہا تھا اور دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ ہر گزرتا سیکنڈ اقبال کے لیے بھاری تھا۔ چند لمحوں بعد ایک بیپ کے ساتھ فون اٹھالیا گیا۔

"ہیلو..." دوسری طرف سے حق متوازن آواز ابھری۔

"وہ لوٹ آیا ہے حق!"

اقبال کے یہ الفاظ ہوا میں لہرائے اور لائن کے دوسری جانب ایک دم گہرا اور طویل خاموشی کا لبادہ چھا گیا۔حق کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"وہ اس وقت بالکل میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے، وہ واپس آچکا ہے۔"

کامل کے پرسکون کمرے میں بیٹھے حق بزدار کے ہاتھ میں تھما فون جیسے ایک پل کے لیے منجمد ہوگیا۔ایک ہی دن میں ..صرف ایک ہی دن کے اندر حق نے یہ جملہ دوسری بار سنا تھا۔صبح نجف نے بالکل یہی الفاظ دہرائے اور اب اقبال بھی اسی نام کی دہائی دے رہا تھا۔

"تم خوفزدہ ہو؟" دوسری جانب سے حق کی کھوجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

" کیا مُجھے خوفزدہ ہونا چاہیے؟" اقبال نے الٹا سوال کیا۔

"میرے ہوتے ہوئے تو ہرگز نہیں!" حق نے برجستگی سے کہا اور فون بند کردیا۔یہ اس کے بیٹے کا ٹائم تھا وہ کسی سقراط شبگیر کے لیے اسے برباد نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

شہر کے ایک پررونق ریستوران میں شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ہلکی مدھم موسیقی اور برتنوں کے شور بیچ فضا کافی خوشگوار تھی۔آج اس ریستوران میں سلال کا آخری دن تھا۔وہ اپنی میڈیکل کی پڑھائی پر پوری توجہ مرکوز کرنے کے لیے اس جاب سے باقاعدہ ریزائن کر چکا تھا اور آج اپنی شفٹ کے آخری چند گھنٹے پورے کررہا تھا۔وہ اس وقت ایک فیملی میز کے قریب بہت مؤدبانہ انداز میں کھڑا، ہاتھ میں ٹیبلٹ لیے کسٹمرز سے ان کا فیڈ بیک لے رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔اسی دوران اس کی پینٹ کی جیب میں رکھا فون وائبریٹ ہوا اور ایک مخصوص ٹون بج اٹھی۔سلال نے کسٹمرز کا شکریہ ادا کیا، لیدر پاؤچ میں ٹیبلٹ رکھا اور ایک طرف ہٹ کر جیب سے فون نکالا۔اسکرین پر نامرہ کا نام چمک رہا تھا۔سلال نے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو..." اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مُجھے دس ہزار چاہئیں ابھی!" دوسری طرف سے سلام دعا کے بغیر نامرہ کی ٹودی پوائنٹ آواز گونجی۔

"ابھی؟" سلال کو شدید حیرت ہوئی۔اس نے ماتھے پر بل لاتے ہوئے گھڑی دیکھی۔

"ارجنٹ ہے۔میں باہر ہی ہوں۔" نامرہ نے بے صبری سے کہا۔
سلال نے رخ موڑا اور ریستوران کی بڑی شفاف شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔سڑک کے کنارے،ٹریفک کے ہنگامے سے ہٹ کر نامرہ کھڑی تھی۔وہ ہمیشہ کی طرح سلال کی ہی اوور سائزڈ ڈینم جیکٹ پہنے،سر پر ہیلمٹ اوڑھے اپنی سکوٹی پر ایک پیر ٹکائے توازن برقرار رکھے ہوئے تھی۔جیسے ہی سلال نے شیشے کے پار دیکھا،نامرہ نے درست انداز میں اسے مڑتے پایا اور فوراً ہوا میں اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے انگلیوں کا پورا پنجہ دو بار دکھایا جس کا مطلب تھا کہ اسے یہ رقم ہر حال میں اور فوراً چاہیے۔
سلال نے ایک گہرا سانس لیا اور فون پر دھیمے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نامرہ! مگر ابھی تو میری فائنل کلیئرنس ہی نہیں ہوئی۔آج میرا لاسٹ ڈے ہے،سیلری مُجھے کچھ دن بعد ملے گی۔"

"لیکن مُجھے ابھی چاہئیں سلال!" نامرہ نے اپنی ضرورت دہرائی۔
"ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں اور جو تھوڑے بہت ہیں،اس سے مُجھے نیمل کی شادی کا گفٹ لینا ہے۔کچھ دن انتظار کرلو..."

سلال کے اس صاف اور دوٹوک انکار پر ہیلمٹ کے پیچھے نامرہ کی بھنویں بے طرح سکڑ گئیں۔اس کے چہرے پر غصے اور بیزاری کے تاثرات ابھرے۔اس نے سلال کی اگلی بات سننے کے لیے سیکنڈ ضائع نہیں کیا اور ٹک سے کال کاٹ دی۔
"میرے پاس اور بھی راستے ہیں۔" اس نے خود کلامی کی اور شاطرانہ مسکراہٹ لبوں پر ابھری۔اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں۔اس نے فوراً اسکرین اسکرول کی اور اگلا نمبر فضا کا ملا دیا۔ فون کی پہلی ہی بیل پر دوسری طرف سے کال اٹھا لی گئی جیسے وہ فون ہاتھ میں لیے ہی بیٹھی ہو۔نامرہ نے ہمیشہ کی طرح بنا کسی سلام دعا یا تکلف کے مدعے کی بات کی۔

"تمہیں میرے بھائی کا پرسنل نمبر چاہیے نا؟"

"ہاں..." فضا کے ہاں پر نامرہ کی آنکھوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔اس نے فضا کے سامنے ایک آفر رکھی۔دوسری طرف فضا ایک پل کو ہچکچائی مگر نامرہ کے اس ڈائریکٹ آفر پر اس نے فوراً کچھ نہیں کہا۔نامرہ نے فون کان سے لگا کر سڑک پر نظریں جماتے ہوئے دو تین

باتیں کیں اور پھر کچھ دیر بعد جیسے ہی اس کے فون پر میسج کی بیپ ہوئی، اس کے چہرے پر فاتحانہ اور دلکش چمک ابھری۔ اس نے فون جیکٹ کی جیب میں ڈالا، ہیلمٹ کا شیشہ نیچے گرایا اور سکوٹی کو ایک زوردار کِک مار کر ہنگامے سے بھرپور سڑک پر آگے بڑھا لے گئی۔ آہ نامرہ بیوپاری!

☆☆☆☆☆

بزدار پیلس کا کامن اسٹڈی روم ایک ایسی جگہ تھی جہاں خاندان کے بڑے نسل در نسل خاموشی سے بیٹھ کر اپنی بساط پلٹنے کے منصوبے بناتے رہے تھے۔ یہ کمرہ بھاری پرانے فرنیچر، پشت پر لگی کتابوں کی دیوہیکل الماریوں اور دیوار پر لگی بزدار خاندان کے مرحوم بزرگوں کی پورٹریٹس کے ساتھ ایک بوجھل اور پراسراری فضا لیے ہوئے تھا۔
شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور اسٹڈی روم میں صرف ایک قدیم لیمپ کی مدھم پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو یہاں موجود تین افراد کے چہروں پر پڑتے ہوئے ان کی سنجیدگی کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔ ایک میز کے گرد حق بزدار، اقبال بزدار اور شمس بزدار موجود تھے۔ ماحول میں ایسی خاموشی تھی جیسے طوفان آنے سے پہلے کا سناٹا ہو۔ اقبال نے میرج ہال کے باہر سقراط کو دیکھنے کے بعد سے اپنا سکون کھو دیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ذرائع کو الرٹ کیا اور اب تک سقراط کے حوالے سے وہ پوری انفارمیشن نکال چکا تھا جو اس وقت اس کے سامنے میز پر ایک کھلی فائل میں موجود تھی اور سب سے پریشانی کی بات یہ تھی کہ سقراط نے شہر کے مشہور قادری کالج میں ایز اے ہاکی کوچ جوائن کر لیا تھا۔ شمس نے ایک لمبا سانس لے کر حق کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

"تو... اقبال نے جو کچھ پتا لگایا ہے وہ سب تم نے سن لیا ہے حق!" شمس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں دبی ہوئی فکر واضح تھی۔ "سقراط شبگیر... وہ نہ صرف واپس آ چکا ہے بلکہ اس نے خاموشی سے کوچنگ بھی شروع کر دی ہے۔ وہ بھی قادری کالج جیسے ادارے میں اور یہ کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔"

حق نے اپنے سامنے رکھی فائل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی مگر اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے اپنی دونوں انگلیاں آپس میں پھنسائیں اور متوازن لہجے میں جواب دیا۔

"میرا نہیں خیال سقراط شبگیر ہمارے لیے اب کوئی خطرہ ہوگا۔ اس نے کوچنگ جوائن کر لی ہے یہ اس کی ذاتی زندگی کا فیصلہ ہے۔ وہ کھلاڑی رہا ہے تو یہی کر سکتا تھا۔ اس سے بزدار کالج یا ہمارے خاندان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

حق کی یہ بے نیازی اقبال کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

"تم اسے اتنا ہلکا کیوں لے رہے ہو حق؟" اقبال کا لہجہ کچھ تنگ ہو گیا تھا۔ "ذرا سوچو! وہ اتنے سالوں بعد کیوں لوٹا ہے؟ اور واپس آتے ہی اس نے ہاکی سے کو چنگ سے کیوں شروعات کی؟ مُجھے کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔ وہ شخص... وہ شخص ہمارے لیے ہمیشہ سے ایک دردِ سر رہا ہے اور اس کا یوں خاموشی سے ہمارے قریب آنا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔"

شمس نے اقبال کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔ "اقبال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سقراط کوئی عام دشمن نہیں ہے۔ اسے یوں خاموشی سے نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔"

حق پرسکون رہا۔ اس کی نظریں اسٹڈی روم کے اندھیرے کونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"سقراط جیسے بے وقوفوں سے لڑنا کچھ خاص مشکل کام نہیں ہے۔ وہ ایک جذباتی اور سادہ لوح انسان تھا اور اب بھی شاید ویسا ہی ہو۔ اس حادثے کو دس سال ہو چکے ہیں۔ آٹھ سال بعد وہ پاکستان آیا ہے اور صرف بدلے کے لیے تو نہیں آیا ہوگا۔ جہاں تک مُجھے لگتا ہے وہ آگے بڑھ چکا ہے اور ہمیں بھی ماضی کریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حق کو پورا یقین تھا۔ اگر سقراط دشمنی نہیں بھولا ہوتا تو یقیناً واپس لوٹنے کے بعد سب سے پہلی فون کال اسے کرتا۔

"مگر حق..." اقبال نے کچھ کہنا چاہا لیکن شمس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"خطرہ سقراط نہیں خطرہ وہ راز ہے۔ وہ بدنما حقیقت ہے جسے ہم نے سالوں پہلے اسی اسٹڈی روم میں دفن کرنے کے لیے ایک بڑی قیمت چکائی تھی۔ اگر سقراط اس راز کے قریب پہنچ گیا، اگر اس نے دبے مردوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا تو؟ تم اسے ہم سے بہتر جانتے ہو کہ وہ کتنا ضدی ہے۔"

حق نے ایک لمبا سانس لیا۔ وہ ان دونوں کے خوف سے بیزار ہو رہا تھا۔

"میں نے کہا نا مجھ پر چھوڑ دیں۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ یہ حق بزدار اور سقراط شبگیر کا آپسی معاملہ تھا۔ دس سال پہلے جو کچھ ہوا حق اسے

دہرانے کے حق میں نہیں تھا۔فی الوقت اسے پرسکون زندگی چاہیے تھی۔اس کی ازدواجی زندگی خراب ہو رہی تھی اور یہاں یہ دونوں سقراط سقراط کی رٹ لگا رہے تھے۔

"اگر وہ خطرہ بنا تو اس کا علاج میرے پاس موجود ہے۔لیکن جب تک وہ کوئی حرکت نہیں کرتا، مُجھے اس پر وقت ضائع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور آپ لوگ بھی ریلیکس رہیں۔"

وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔اسٹڈی روم کی فضا حق کے اس حتمی فیصلے کے بعد اور بھی بوجھل ہو گئی۔

"حق...." شمس بزدار نے عقب سے پکارہ۔ان کی آواز میں سنجیدگی تھی جو حق کے قدم وہیں دروازے کے دہانے پر جما گئی۔حق ٹھٹک گیا۔ وہ مڑا نہیں بس اس نے اپنے چوڑے کندھوں پر بوجھ محسوس کیا۔شاید اسے چھٹی حس اس پکار کو سمجھ چکی تھی۔

"امام بھائی کی برسی ہے پرسوں..." شمس نے انتہائی دھیمے اور بوجھل لہجے میں کہا جیسے وہ کسی بہت پرانے زخم کو چھیڑ رہے ہوں اور چھیڑنا نہ چاہتے ہوں۔"حق...تم..."

"میں مرے ہوئے لوگوں پر بات نہیں کرتا..." وہ شمس بزدار کی بات کاٹ چکا تھا۔
اس کے لہجے میں کسی قسم کی کوئی نرمی یا جذبات کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

"جو مر گیا سو مر گیا...اسے وہیں رہنے دیں۔"

وہ تیز قدموں سے اسٹڈی روم سے باہر نکل گیا جبکہ دروازہ اس کے پیچھے ایک زوردار ٹھاپ کے ساتھ بند ہوا۔اسٹڈی روم میں ایک بار پھر وہی ہولناک سناٹا چھا گیا۔شمس اور اقبال بزدار ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔حق کی اس حد درجہ سردمہری اور ماضی سے یوں انکار نے ان کے خدشات کو مزید گہرا کر دیا تھا۔الفا آج بھی زخمی تھا۔اس کے گھاؤ آج بھی نہیں بھرے تھے۔

☆☆☆☆☆

شبگیر ہاؤس میں صبح کا وقت تھا مگر آج کی صبح کچھ غیر معمولی تھی۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نامرہ جو عموماً دیر تک بے خبر سوتی تھی، آج صبح سویرے ہی اٹھ گئی تھی۔سب اسے یوں وقت پر بیدار دیکھ کر حیرت میں مبتلا تھے مگر بقول اس کے آج اسے بہت ضروری کام تھا۔وہ اپنے کمرے میں کھڑی اپنا بیگ پیک کرنے میں مصروف تھی۔لاؤنج کا منظر اس وقت انتہائی خوشگوار تھا۔سب کے مہندی کے جوڑے سل کر آچکے تھے اور وہ سب نہایت ذوق وشوق سے انہیں دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔دادی کا جوڑا ابھی بہت خوبصورت لگ رہا تھا اور وہ اسے ہاتھ لگا کر تسلی کر رہی تھیں۔اچانک اوپر کی منزل سے ایک غصے بھری آواز گونجی جس نے لاؤنج کے پرسکون ماحول میں ارتعاش پیدا کر دیا۔سب نے حیرت سے سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔

"نامرہ...نامرہ..."

سلال تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا اور اس کی آواز میں یہ غصہ اس کے مزاج کے بالکل برعکس تھا۔اس گھر میں بہت کم بلکہ شاید ہی کبھی کسی نے سلال کو اتنی اونچی آواز میں بولتے سنا تھا۔

"کیا ہوا سلال؟ سب ٹھیک ہے؟" زہرہ بیگم نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اس کا سرخ اور تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ کر انتہائی فکرمندی سے پوچھا۔

"نامرہ کہاں ہے؟" سلال نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔وہ اپنے ہاتھ میں موجود فون کو شدید بے یقینی اور صدمے سے دیکھ رہا تھا اور پھر سیدھا نامرہ کے کمرے کی جانب بڑھا۔

"کیا ہوا؟ زندہ ہوں ابھی...ایسے کیوں چلا رہے ہیں؟"

اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی نامرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔اس کے چہرے پر کمال کی ڈھٹائی تھی۔سلال نے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ نامرہ کو گھورا۔

"فضا کون ہے؟"

"کون فضا؟" وہ انجان بنی۔

"یا خدایا...!" سلال نے شدید اذیت میں اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

گزشتہ رات سے اسے فضا کے لگاتار واٹس ایپ میسجز آ رہے تھے۔ جب سلال نے حسبِ عادت اسے اگنور کیا تو اس نے صبح صبح باقاعدہ فون کر کے اسے وہ سنائی تھیں کہ سلال کے ہوش اڑ گئے۔

"ایکسکیوز می!" وہ بھی بگڑا۔

"نو یو ایکسکیوز می سلال شبگیر! کس بات کا غرور ہے آپ کو؟ آپ کی بہن نے پانچ ہزار کے عوض مُجھے بیچا ہے... آپ مُجھے اگنور نہیں کر سکتے!"

اور سلال ساکت رہ گیا۔ وہ مزید کچھ سن نہیں سکتا تھا۔ اس وقت وہ نامرہ کے سامنے کھڑا گھر والوں کو روداد سنا رہا تھا۔

"نامرہ... تم نے پانچ ہزار میں بھائی کو بیچ دیا؟" نوفہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے پوچھا، جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"میں نے صرف نمبر دیا ہے۔" نامرہ سب کی قاتلانہ نظریں خود پر پا کر تھوڑا سا گڑبڑائی۔
"نامرہ...!" زہرہ بیگم نے گہرے صدمے اور بے یقینی سے نامرہ کو دیکھا۔

"ہاں مُجھے پتا ہے کم قیمت لگائی ہے لیکن میں نے پیسے مانگے تھے نا آپ سے..." وہ سلال کو دیکھ کر انتہائی معصومیت سے بولی۔ ابھی اس کا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ زہرہ بیگم نے آگے بڑھ کر ایک زوردار دھمو کا اس کی کمر میں جڑ دیا۔

"بے شرم! کوئی بھائی کا نمبر ایسے دیتا ہے کسی کو؟" زہرہ بیگم غصے سے پھٹ پڑیں۔

"فری میں نہیں دیا امی! پانچ ہزار لیے ہیں پورے۔" نامرہ اپنی کمر مسلتے ہوئے درد سے کراہی اور پھر سے اپنی صفائی پیش کی جبکہ سلال تو اب تک صدمے کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ بس نامرہ کو خالی نظروں سے گھور رہا تھا جس نے اسے پانچ ہزار میں بیچ دیا تھا۔

"لیلیٰ... تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ گھر کی چیزیں بیچتے بیچتے اب تم بھائی کو ہی بیچ آئیں؟" دادی نے اپنی تسبیح روک کر انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"دادی یار..." سلال کو اپنے آپ کو بار بار بکاؤ سننے پر چڑ ہو رہی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم بلاک کر دو گے، اس لیے میں نے..." نامرہ سلال کو وضاحت دینے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی، لاؤنج کے دوسرے سرے سے سقراط کی بھاری اور متلاشی آواز ابھری۔

"یہاں سیڑھیوں کے نیچے میری پرانی ہاکی پڑی تھی۔ کسی نے دیکھی ہے؟"

وہ پنجوں کے بل بیٹھا، سیڑھیوں کے نیچے اندھیرے کونے میں جھکا ہوا تھا۔ آج اسے کالج جانا تھا۔ ہاکی کے نام پر تارہ نے ایک جھٹکے سے نامرہ کو دیکھا۔ اس کے دماغ میں کل کا منظر گھوم گیا جب نامرہ چھت پر بیٹھی سقراط کی اس پرانی ہاکی پر نیا رنگ کر رہی تھی۔ تارہ کے یوں گھور کر دیکھنے پر نامرہ بری طرح گڑبڑاتی ہوئی نظریں چرا گئی۔

"بیچ دی؟" تارہ نے دھیمے سے سوال کیا۔
نامرہ نے کچھ بولنے کے بجائے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"چاچو! آپ کی ہاکی اب نہیں ملے گی۔" تارہ نے اونچی آواز میں باقاعدہ اعلان کیا۔
یہ سنتے ہی سقراط تیزی سے اندر آیا۔ نامرہ کٹہرے میں کھڑی مجرم تھی مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی شرمندگی نام کو نہیں تھی۔ سلال کے نمبر کے ساتھ ساتھ آج سقراط کی برسوں پرانی ہاکی بھی نیلام ہو چکی تھی۔
" کہاں ہے میری ہاکی؟" سقراط کے اس سوال پر سب نے سوالیہ نظروں سے نامرہ کو دیکھا۔
"وہ... مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔" نامرہ نے گردن جھکا کر معصومیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی۔

سلال صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ چکا تھا۔ اسے ابھی تک فضا کے وہ الفاظ نہیں بھولے تھے۔ 'تمہاری بہن نے تمہیں بیچا ہے۔'

"بیٹھے بٹھائے پیسوں کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ پاکٹ منی ملی تھی نا؟" زہرہ بیگم اس وقت واقعی بھڑکی ہوئی تھیں اور لگ رہا تھا کہ آج نامرہ کی کوئی گھڑی جا رہی تھی۔
سقراط نے ساری صورتحال سمجھتے ہوئے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے دو قدم آگے بڑھائے اور حتمی لہجے میں کہا۔

"چلو میرے ساتھ..."

اس نے نامرہ کو پیچھے گدی (گردن) سے پکڑا اور کھینچ کر اپنے آگے کر لیا۔"ہا کی واپس لانی ہے۔"

"چاچو... چور بازار کی کوئی چیز واپس نہیں ملتی... وہاں خطرہ ہوتا ہے۔" نامرہ نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دہائی دی۔
"چولہے میں جائے خطرہ! چلو تم..." سقراط اسے بالکل کسی مرغی کی طرح گردن سے دبوچ کر باہر کی طرف کھینچ لے گیا۔ زہرہ بیگم بڑبڑاتی ہوئیں سلال کے پاس صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سلال اس وقت اپنے موبائل پر غصے سے انگلیاں پھیرتے فضا کے نمبر پر وہ پانچ ہزار روپے واپس ٹرانسفر کر رہا تھا تاکہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے۔ تارہ سلال کے پاس آئی اور شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"بھائی... ویسے بہت کم قیمت لگائی گئی ہے آپ کی۔ اتنے کم میں کیسے بیچ سکتی ہے نامرہ آپ کو؟ کم از کم آئی فون کی ڈیمانڈ تو کرتی۔"

سلال کی گھوری پر تارہ کھلکھلاتے ہوئے دادی کی جانب بڑھ گئی جو خود اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ جبکہ باہر سقراط نامرہ کی ہی سکوٹی پر بیٹھ کر (اس کی ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں) اسے اپنے ساتھ لیے چور بازار کے خطرناک سفر پر نکل پڑا تھا۔ یقیناً آج نامرہ کے مزید کچے چٹھے کھلنے والے تھے اور یہ تو بس شروعات تھی۔

☆☆☆☆☆

صبح کی ہلکی دھوپ میں شہر کا بدنام زمانہ چور بازار اپنے پورے عروج پر تھا۔ تنگ گلیاں، بے ہنگم رش، دکانوں کے باہر لٹکتا پرانا سامان، تاروں کے جال اور ہر طرف پھیلا ہوا شور و غل۔ اس ہجوم کے بیچ سقراط اپنے مضبوط قدموں کے ساتھ چل رہا تھا مگر اس وقت اس کا انداز ایک تھانیدار کا تھا جس نے ایک انتہائی خطرناک مجرم کو دبوچ رکھا تھا۔ اس نے نامرہ کی اوور سائز ڈ جیکٹ کو پیچھے کالر سے سختی سے پکڑ رکھا تھا تاکہ وہ کسی پتلی گلی سے فرار نہ ہو جائے۔ جبکہ نامرہ انتہائی بے نیازی سے ہونٹ سکیڑے اس کے آگے آگے چل رہی تھی جیسے چور بازار اس کے باپ کی جاگیر ہو۔
ابھی وہ بازار کے درمیانی حصے میں پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک دکاندار کی آواز ابھری۔

"ارے نامرہ باجی! آج کیا لائی ہیں؟ پچھلے ہفتے والا استری کا جگاڑ بڑا کمال تھا!"

سقراط کے قدم وہیں رک گئے۔اس نے جھٹکے سے اس دکاندار کو دیکھا اور پھر گردن موڑ کر نامرہ کو گھورا۔

"تمہیں یہاں لوگ پہچانتے ہیں؟"

نامرہ نے کندھے اچکائے۔"میرے بزنس ریلیشنز ہیں چاچو، مارکیٹ میں پی آر ہونی چاہیے۔"

ابھی وہ آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک پرانے الیکٹرانکس والے نے آواز لگائی۔

"چھوٹی باجی! آج کوئی لیپ ٹاپ کی بیٹری یا چارجر لائی ہو؟"
سقراط کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔یہ لڑکی شبگیر ہاؤس کی عزت دار بیٹی کم اور چور بازار کی برانڈ ایمبیسیڈر زیادہ لگ رہی تھی۔وہ نامرہ کو گھسیٹتا ہوا بازار کے آخری سرے پر موجود ایک پرانی اور کباڑ سے بھری دکان پر پہنچا، جس کے باہر گوگا اسپورٹس اینڈ اینٹیکس کا بورڈ ٹیڑھا ہو کر لٹک رہا تھا۔دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھا چاچا گوگا جو ایک موٹا اور پان چبانے والا شخص تھا نامرہ کو دیکھتے ہی بتیسی دکھا کر مسکرایا۔

"آؤ بھئی نامرہ پتر! آج صبح صبح کیا لائی ہو؟ اور یہ ساتھ باڈی گارڈ ہے؟"

"باڈی گارڈ نہیں، اس کا چاچا ہوں۔" سقراط نے آگے بڑھ کر کاؤنٹر پر اپنا سلامت بایاں ہاتھ زور سے مارا جس سے چاچا گوگا کا پان گلے میں اٹکتے اٹکتے بچا۔

"میری ہاکی نکالو جلدی!"

چاچا گوگا نے سقراط کے ہاتھ کی پٹی اور غصے سے بھرا کسرتی وجود دیکھا تو فوراً نرم پڑ گیا۔

"ارے غصہ کیوں کرتے ہیں باؤ جی...وہ تو میں نے اندر سنبھال کر رکھی ہے۔لڑکی نے رنگ بڑا سونا کیا تھا اس پہ۔"

چاچا گوگا اندر گیا اور دو منٹ بعد سقراط کی وہ برسوں پرانی ہاکی لے آیا جس پر نامرہ نے انتہائی بھونڈے انداز میں نیلا رنگ پھیر دیا تھا۔ سقراط نے اپنی ہاکی کو اس حال میں دیکھا تو اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اس نے جیب سے پرس نکالا تاکہ ہاکی کے پیسے دے کر جان چھڑائے۔

"یہ لو ہزار روپیہ اور آئندہ اس لڑکی سے میرے گھر کی کوئی چیز مت خریدنا!" سقراط نے ہاتھ اٹھا کر وارننگ دی۔ چاچا گوگا نے ہزار کا نوٹ جیب میں ڈالا اور پان کی پیک تھوکتے ہوئے انتہائی معصومیت سے بولا۔

"باؤ جی، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ نامرہ پتر تو میری پکی اور پرانی گاہک ہے۔ پچھلے تین سالوں سے تو گھر کا آدھا فالتو سامان اسی نے مُجھے بیچا ہے۔"

سقراط کا پرس بند کرتے کرتے ہاتھ رک گیا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر چاچا گوگا کو دیکھا۔

" کیا مطلب؟ کیا کیا بیچا ہے اس نے؟"

"بس نہ ہی پوچھیں چاچو... چلیں اب چلتے ہیں۔" نامرہ نے پہلی بار گڑبڑا کر سقراط کا بازو کھینچنا چاہا مگر سقراط نے اسے وہیں جم کر کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔ چاچا گوگا نے انگلیاں گنتے ہوئے شبگیر ہاؤس کے گمشدہ خزانوں کی لسٹ سنانا شروع کی۔
"مہنگا ہیئر ڈرائر... وہ مجھے پانچ سو میں دیا تھا۔ ایک ونٹیج گھڑی! وہ جو تاروں والی گھڑی تھی، بڑی کمال کی تھی باؤ جی! امپورٹڈ جوگرز، وہ جوگرز تو میں نے اپنے بھتیجے کو گفٹ کر دیے تھے۔ چاندی کا سرمہ دانی، وہ بھی تول کے حساب سے بکا تھا۔"

اور پھر چاچا گوگا نے وہ آخری بم گرایا جس نے سقراط کو حیرت سے مزید گنگ کیا۔

" کل ہاکی کے ساتھ ایک لیدر جیکٹ بھی تھی۔ پندرہ سو کی بیچی ہے۔"

سقراط نے صدمے سے گردن موڑ کر نامرہ کو دیکھا۔ یہ لڑکی کوئی عام چور نہیں تھی۔

"تم نے...تم نے میری لیدر جیکٹ بھی بیچ دی؟" سقراط نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے ایکسڈنٹ میں اس کی آستین پھٹ گئی تھی۔ میں نے گھنٹہ لگا کر اسے ٹھیک کیا۔ آپ پھٹی ہوئی جیکٹ تھوڑی پہنتے؟" نامرہ نے انتہائی ڈھٹائی سے صفائی پیش کی۔ سقراط کے پاس اس ڈھٹائی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا، اپنی ہاکی کو مضبوطی سے پکڑا اور نامرہ کو دوبارہ جیکٹ کے کالر سے پکڑ کر دکان سے باہر کی طرف موڑا۔
"چلو گھر تم...آج بھابھی کے ہاتھوں تمہارا صدقہ اترنا لازمی ہو گیا ہے۔ تم نے تو پورا شبگیر ہاؤس OLX پر لگا رکھا ہے!" سقراط اسے گھسیٹتے ہوئے سکوٹی کی طرف لے جانے لگا۔

"چاچو..."

"کیا ہے اب؟" سقراط نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"راستے سے وہ جو شوارما والا ہے نا، وہاں سے ایک زنگر شوارما تو کھلاتے چلیں۔ مارکیٹ کا چکر لگا کر بھوک لگ گئی ہے۔"

سقراط نے اسے دیکھتے ہوئے تاسف سے گردن ہلائی۔ اللہ ایسی بیوپاری بھتیجی کسی کو نہ دے۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد سقراط ایک جانب کھڑا گلی کے شور میں فون پر کسی سے الجھ رہا تھا اور جب وہ کال کاٹ کر واپس پلٹا تو منظر بدل چکا تھا۔ دھوپ اب یونیورسٹی روڈ کے فٹ پاتھ پر لگے درختوں کے پتوں سے چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ نامرہ سکوٹی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں زنگر شوارما تھا جسے وہ بڑے رغبت اور مزے سے کھا رہی تھی جیسے صبح سے اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کا اس کی صحت پر کوئی اثر ہی نہ پڑا ہو۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز، مایونیز اور چکن میں گم تھی۔ سقراط اس کے قریب آیا، اپنے سینے پر بازو باندھے وہ کچھ دیر خاموشی سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا جو شبگیر ہاؤس کی سب سے بڑی سر درد بنی ہوئی تھی۔ نامرہ نے نظر اٹھا کر بھی اپنے سقراط کو نہیں دیکھا۔

"تمہیں پیسوں کی ضرورت کیوں ہے؟" سقراط نے اس بار کوئی طنز نہیں کیا، اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ اور دھیما تھا۔ وہ واقعی اس کے پیچھے چھپی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

نامرہ نے شوارما چباتے ہوئے سرسری انداز میں کہا،" کچھ ذاتی کام ہے..."

" کون سا ذاتی کام، نامرہ؟ مُجھے جاننے کا حق ہے۔"

اس بار سقراط کا لہجہ سخت ہوگیا۔نامرہ کے شوارما چباتے ہوئے جبڑے یکدم رک گئے۔اس نے نوالہ حلق میں اتارا اور آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔اس کی چھوٹی، سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی دھند تھی۔ایک ایسی گہرائی جسے سقراط اب تک پڑھ نہیں پایا تھا۔سقراط نے بھنویں سکیڑیں اور اسے غور سے دیکھا۔وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کے قریب ایک مشہور فوڈ شاپ کے باہر کھڑے تھے جہاں طالب علموں کا رش تھا۔نامرہ نے شوارما کو دوبارہ کاغذ میں لپیٹا اور اسی لاپروائی کو اوڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
"یہاں قریب ہی ایک نیا انسٹی ٹیوٹ اوپن ہوا ہے جہاں لڑکیوں کو مارشل آرٹس اور فائٹ کرنا سکھایا جاتا ہے۔مُجھے وہاں ایڈمیشن لینا ہے۔ اس کی فیس زیادہ ہے۔"
سقراط کے چہرے پر حیرت مزید پھیل گئی۔
"تمہارا باپ زندہ ہے، بھائی ہے، چاچا بھی ہے...پھر تمہیں فائٹر کیوں بننا ہے؟" سقراط نے تعجب سے پوچھا۔اس بات پر نامرہ نے شوارما سکوٹی کی سیٹ پر رکھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر سقراط کو دیکھا تو ان آنکھوں میں اب صرف ڈھیروں شکوے اور تپش تھی۔اس نے اپنے لب بھینچ لیے تاکہ آواز نہ کانپے۔

" آپ کب سے ہیں چاچو؟ آپ کب تک ہیں؟ کیا آپ پچھلے دس سال ہمارے ساتھ تھے؟"

وہ سکوٹی سے الگ ہوکر سیدھی کھڑی ہوگئی۔اس کی آواز میں لرزش آئی اور پلکوں کے کنارے نم ہونے لگے۔

"سلال اکیلا ہے اور ہم چار بہنیں۔سلال کس کس سے لڑے گا؟"

سقراط جیسے ساکت ہوگیا۔اسے پہلی بار نامرہ کے اندر چلتے طوفانوں کا احساس ہوا تھا۔

" آپ کو پتا ہے پچھلے دس سالوں میں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے؟" نامرہ کی آواز اب اونچی اور مزید بھرائی ہوئی ہوچکی تھی۔" آپ کو پتا ہے

امی کتنا بیمار ہوئی تھیں؟ آپ کو پتا ہے کچھ لوگوں نے سازش کر کے ہماری فیکٹری بند کروا دی تھی؟ آپ کو پتا ہے پاپا راتوں کو چھپ چھپ کر روتے تھے؟ کیونکہ..." اس کا گلا رُندھ گیا۔

" کیونکہ باہر لوگ انہیں ایک ریپسٹ کا بھائی کہتے تھے! لوگوں نے ہماری فیکٹری کے مال کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ ہمیں اچھوت بنا دیا گیا تھا۔"

سقراط کے قدم جیسے زمین میں گڑھ گئے۔

" آپ کو پتا ہے امی کی بیماری اور پاپا کے کاروبار ٹھپ ہونے کے دوران نیمل آپی نے ہمیں کیسا سنبھالا؟ پاپا کے پاس تو ہم سے بات کرنے کا وقت بھی نہیں ہوتا تھا، وہ بس دن رات قرضے اتارنے کی فکر میں رہتے تھے۔" نامرہ کی آنکھوں سے اب باقاعدہ آنسو بہہ کر اس کے گالوں پر آرہے تھے، " آپ کو پتا ہے ہمیں آپ کی کتنی ضرورت تھی چاچو؟ آپ تب کہاں تھے؟"

ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ اب اپنے ضبط کے آخری بندھن توڑ چکی تھی۔ اس کے وجود کی ساری توانائی جیسے ختم ہوگئی۔ اس کی ٹانگوں کی جان نکل گئی اور وہ سکوٹی کے ساتھ لگ کر، اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگائے پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔

"لوگ ہم پر پتھر برساتے تھے چاچو! گلی سے گزرو تو گالیاں دیتے تھے۔ سلال کو ایک بار محلے کے کچھ لڑکوں نے مل کر اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو کر ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ میں نے تب نیمل آپی کو آخری بار روتے دیکھا تھا۔ کوئی ہماری مدد کو نہیں آیا... کوئی بھی نہیں! آپ تب کہاں تھے چاچو؟ کہاں تھے آپ؟"
سقراط کو ان حقیقتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد اسکے اپنوں پر کیا گزری تھی۔ نامرہ نے روتے ہوئے ہاتھوں سے بے دردی سے گال رگڑے اور پھر سے بولی۔

"نیمل آپی نے وکیل بن کر دفاع کرنا سیکھ لیا ہے۔ اب مُجھے بھی لڑنا سیکھنا ہوگا تاکہ میں اپنی فیملی کے لیے کھڑی ہوسکوں۔ میں طاقتور بننا چاہتی ہوں تاکہ کوئی میرے بہن بھائیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ کوئی میرے پاپا کو ذہنی ٹارچر نہ کر سکے۔"
سقراط کے گلے کی گلٹی ڈوب کر ابھری پچھتاوے کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے اس کی ساری سختی کو پگھلا کر رکھ دیا۔ اس نے خود کو نامرہ کے سامنے نیچے بیٹھتے پایا۔ وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ نہایت شفقت اور نرمی سے نامرہ کے سر پر رکھا۔ اس کا لمس پاتے ہی نامرہ کے سسکیاں لیتے کندھے تھم سے گئے۔ اس نے حیرت سے چہرہ اٹھا کر سقراط کو دیکھا۔

"ایم سوری بچے! مُجھے یہاں ہونا چاہیے تھا..." وہ شاید شرمندہ تھا۔

نامرہ کی ہچکی ابھری۔ بظاہر خود کو بہت لاپرواہ دکھانے والی یہ لڑکی اندر سے شدید خوفزدہ اور اکیلی تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، اب کچھ غلط نہیں ہوگا۔ میں اب کچھ بھی غلط نہیں ہونے دوں گا۔ یہ سقراط شبگیر کا وعدہ ہے...اب ہماری فیملی کی طرف اٹھنے والی ہر انگلی میں خود توڑوں گا۔ سقراط شبگیر اب سب کو دیکھ لے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس کے الفاظ میں اتنا مان تھا کہ نامرہ نے بس ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆☆☆

رات کے کھانے کا وقت تھا۔ آج زہرہ بیگم کا پورا وجود جیسے محبت کے ایک انوکھے احساس سے چمک رہا تھا۔ وہ آج حد سے زیادہ متحرک تھیں۔ کبھی سلال کی پلیٹ میں بوٹی ڈال رہی تھیں، کبھی نامرہ کو زبردستی سلاد کھانے پر ٹوک رہی تھیں تو کبھی دادی کے آگے نرم نوالا بنا کر رکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر تھکن تو تھی مگر نیمل کی شادی کی خوشی اور اپنے بچوں کو یوں ہنستا کھیلتا دیکھنے کا سکون اس تھکن پر بھاری تھا۔ وہ ہر بچے کو اس طرح نہال نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے اپنی ممتا کا سارا لعل ان پر نچھاور کر دینا چاہتی ہوں۔ وہ آنے والے دنوں کی کسی بھی تلخ پرچھائی سے بے خبر بس اپنے اس چھوٹے سے خاندان کو محبت کے قلعے میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ نیمل پانی کا گلاس لیے سب کو دیکھ رہی تھی جب اچانک سلال نے اپنا چمچ رکھا اور سب کی طرف متوجہ ہوا۔

"مُجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے شاہ زیب بھائی کا فون آیا تھا۔" سلال نے نہایت سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ وہ نیمل آپی کے ساتھ ولیمے کے جوڑے کی شاپنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اصل میں انہوں نے پہلے آپی سے ڈائریکٹ کہا تھا مگر چونکہ آپی نے صاف انکار کر دیا، اس لیے شاہ زیب بھائی نے مُجھے فون کیا کہ میں آپی کو مناؤں۔"

سلال کی یہ بات سنتے ہی ڈائننگ ٹیبل پر ایک دم گہری خامُوشی چھا گئی۔ نیمل نے حیرت سے سلال کو دیکھا۔ دادی نے بھی عینک کے اوپر سے سلال کو دیکھا۔

"ہمارے ہاں شادی سے پہلے دولہا دلہن کا یوں اکیلے شاپنگ پر جانا اب بھی بڑوں کے لیے ایک حساس معاملہ سمجھا جاتا ہے۔"

سلال خاندانی مزاج اور بڑوں کے تحفظات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً معاملے کو انتہائی نفاست اور خوبصورتی سے ہینڈل

کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اگر آپی اکیلی نہیں جانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ ہم سب ہی ساتھ چلتے ہیں۔آپی اور شاہ زیب بھائی آرام سے شاپنگ کرلیں گے اور ہم سب وہیں مال کے فوڈ کورٹ یا کسی اچھے کیفے میں بیٹھ جائیں گے۔اس طرح آپی کو اکیلے جانے کی جھجک بھی نہیں ہوگی اور ہمارا ایک فیملی آؤٹنگ کا چکر بھی لگ جائے گا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا یوں بار بار ملنا اور شاپنگ پر جانا...ہمارے خاندان میں تو بھئی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔"
ابھی دادی کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ نامرہ بیچ میں کود پڑی۔
"اوہو دادی! کیا آپ بھی پرانے زمانے کی باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔2026 آ گیا ہے دادی! دنیا ویسے ہی ختم ہونے والی ہے۔اور آپی کی شادی کون سا بار بار ہونی ہے۔زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔انجوائے کرنے دیں!"

"نامرہ...."زہرہ بیگم نے اسے گھورا مگر نامرہ کہاں رکنے والی تھی۔

"امی میں سچ کہہ رہی ہوں۔آپی اکیلی تو نہیں جا رہیں۔اور شاہ زیب بھائی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ تو بلکہ خود چاہتے ہیں کہ ولیمے کا جوڑا نیمل آپی کی اپنی پسند کا ہو،آخر پہننا تو انہوں نے ہی ہے۔جب سلال بھی ساتھ جا رہا ہے تو پھر کیسی ٹینشن؟" نامرہ نے ایک ہی سانس میں اپنی چرب زبانی سے پورا کیس سلال کے حق میں کر دیا۔

زہرہ بیگم نے نامرہ کی بات پر نیمل کی طرف دیکھا،جو خاموشی سے اپنی ماں کی رضا جاننا چاہتی تھی۔زہرہ بیگم ایک ماں تھیں،وہ جانتی تھیں کہ ایک لڑکی کے ارمان اور خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رسم و رواج کی سختی ان کی بیٹی کے اس خوبصورت دور کو پھیکا کر دے۔
انہوں نے دادی کی طرف دیکھ کر نہایت محبت سے پلو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"بچے ساتھ جا رہے ہیں،سلال جب نیمل کے ساتھ ہوگا تو ہمیں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔شاہ زیب کا یہ ارمان بھی پورا ہو جائے گا اور ہماری بچی کی پسند کا جوڑا بھی آ جائے گا۔میرے خیال سے ہمیں اس پر سوچنا چاہیے۔"

زہرہ بیگم کی اس تائید نے سب میں ایک بار پھر خوشیوں کی لہر دوڑا دی۔اس طویل گفتگو اور گھریلو بحث کے بعد بالآخر یہی فائنل ہوا کہ سلال

خود ساتھ جائے گا اور نیمل کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں لے کر جائے گا مگر اس سے پہلے زہرہ بیگم کو سرمد صاحب سے بات کرنی تھی۔ وہ آج فیکٹری سے لیٹ ہو گئے تھے۔ سقراط بھی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"شکر ہے امی آپ مان گئیں، پاپا کو تو آپ منا ہی لیں گی۔"

نامرہ نے شرارت سے کہا تو زہرہ بیگم اسے گھور کر رہ گئیں مگر پرواہ کس کو تھی؟

☆☆☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی ہونے کے باعث حویلی نما اس وسیع و عریض محل میں خاصی رونق اور چہل پہل تھی۔ ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ حق اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ آج وہ گھریلو اور آرام دہ لباس میں تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک سادہ مگر قیمتی شرٹ، گرے ٹراؤزر اور پیروں میں چپل پہنے وہ اپنی مخصوص چال کے ساتھ راہداری عبور کر کے سیڑھیوں کی جانب آ رہا تھا۔ ابھی اس نے ماربل کی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ نیچے سے اوپر آتے ہوئے ثالث کی نظر اس پر پڑی۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔

"السلام علیکم بھائی!"

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو ثالث؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں بھائی؟" ثالث نے جواب دیا اور حق کے احترام میں اپنا راستہ بدل کر، اس کے ساتھ ہی واپس نیچے کی طرف سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے حق نے اپنی نظریں سامنے جمائے جمائے ایک ہلکی سی نظر ثالث پر ڈالی اور پوچھا۔

"تمہاری پریکٹس کیسی چل رہی ہے؟"

"بہت زبردست چل رہی ہے۔" ثالث کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "ہماری ٹیم انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ کے لیے کوالیفائی کر چکی ہے اور کوچ نے مجھے فارورڈ پوزیشن دی ہے۔ آج کل بس روزانہ اسی کی ٹریننگ چل رہی ہے۔"

حق نے ہلکا سا سر ہلایا۔مگر ثالث کی یہ خوشی عارضی تھی۔سیڑھیاں ختم ہونے کے قریب تھیں جب ثالث کے چہرے پر گہری پریشانی اور خوف کا سایہ لہرا گیا۔اس نے اردگرد دیکھا اور اپنی آواز کو انتہائی حد تک دبا کر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی...وہ...وہ مریض؟"

حق کے قدموں کی رفتار میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ وہ شخص کوما میں ہے اور وہ میری ذمہ داری ہے۔تمہیں پریشان ہونے کی یا اس کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔تم اسے بھول جاؤ۔تمہارا کام صرف اپنی پڑھائی اور اپنی پریکٹس پر فوکس کرنا ہے۔سمجھ رہے ہونا۔"

حق کی اس تسلی بخش آواز میں ایسا جادو تھا کہ ثالث کا سارا خوف جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔وہ جانتا تھا کہ جب حق کسی چیز کی ذمہ داری لے لے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

"جی بھائی...شکریہ!" ثالث نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور واپس سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا۔

جیسے ہی حق سیڑھیاں اتر کر لاؤنج کے دہانے پر پہنچا، یونیفارم پہنے ملازمہ حق کی مخصوص اور پسندیدہ بلیک ٹی لے کر حاضر ہو چکی تھی۔حق نے کپ اٹھایا اور لاؤنج کے بڑے شیشے کے دروازے عبور کر کے باہر لان میں آ گیا۔باہر کا منظر انتہائی خوبصورت تھا۔وسیع و عریض سبزہ زار میں مالی اپنے اوزاروں کے ساتھ گھاس اور جھاڑیوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔دھوپ میں ایک سنہری سی چمک تھی۔
سامنے ہی لان کے بیچوں بیچ، سفید رنگ کی آؤٹ ڈور کرسیاں اور ایک گول شیشے کی میز رکھی تھی۔کچھ فاصلے پر کامل اپنی نینی کے ساتھ دوڑتے اور کھلکھلاتے ہوئے کھیل رہا تھا۔ان کرسیوں کے بالکل قریب، ایک ہائی ٹیک وہیل چیئر پر ایک وجود خاموشی سے براجمان تھا۔یہ الماس تھی۔اقبال کی اٹھائیس سالہ چھوٹی بہن! الماس کی قسمت بزدار خاندان کی دولت اور طاقت کے باوجود انتہائی تاریک تھی۔دو سال پہلے اس کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی مگر شادی کے پہلے ہی ہفتے وہ ایک ایسے ہولناک کار حادثے کا شکار ہوئی تھی جس نے اس کی ہنستی کھیلتی زندگی چھین لی تھی۔اس کا دھڑ گردن سے نیچے مکمل طور پر بے جان ہو چکا تھا۔وہ نہ اپنے ہاتھ ہلا سکتی تھی نہ پیر۔بس اس کی گردن ہلتی تھی اور وہ بول سکتی تھی باقی سارا جسم ایک زندہ لاش کی طرح مفلوج تھا۔وہیل چیئر پر بیٹھی الماس کی اداس آنکھیں کامل کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور وہ اپنے ان منجمد ہونٹوں سے مسکرانے کی دلکش کوشش کر رہی تھی۔

" کیسی ہو الماس؟" وہ چلتا ہوا ان تک پہنچ چکا تھا۔

الماس نے بمشکل اپنی گردن موڑ کر حق کو دیکھا اور دھیما سا مسکرائی۔ حق اپنا بلیک ٹی کا کپ شیشے کی میز پر رکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ جیسے ہی کپ میز کی سطح کو چھونے لگا اس کا ہاتھ فضا میں ہی منجمد ہو گیا۔ اس کی نظریں میز پر رکھے ایک انتہائی خوبصورت اور مخملی کارڈ پر پڑی تھیں۔ حق بزدار جسے دنیا کی کوئی طاقت حیران نہیں کر سکتی تھی، اس کارڈ کے اوپر لکھے ناموں پر نظر پڑتے ہی ایک پل کے لیے چونک گیا۔ اس کی پلکیں ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئیں اور چہرے پر نا قابلِ فہم حیرانی کا تاثر ابھر آیا۔ وقت جیسے بزدار پیلس کے اس خوبصورت لان میں ایک لمحے کے لیے رک سا گیا تھا۔ اس کی مضبوط انگلیوں نے میز پر پڑے مخملی کارڈ کے گوشے کو بہت دھیرے سے چھوا۔ یوں لگا جیسے صدیاں لگی ہوں اسے وہ کارڈ اٹھانے میں۔ یہ نیمل کی شادی کا کارڈ تھا۔ حق چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ گہرے نیلے رنگ کا وہ کارڈ اس کی آنکھوں کے رنگ سے حد درجہ متشابہ تھا، گہرا، پراسرار اور اب حد درجہ تکلیف دہ۔ وہ بخوبی جانتا تھا اس کارڈ کی، نیمل کے ان ارمانوں کی اس گھر میں کوئی حثیت نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد یہ یہاں کے شاہانہ کوڑے دان کی زینت بنتا۔ مگر وہ کارڈ کو دیکھتا رہا جیسے اس نیلے کاغذ میں اپنا ادھورا ماضی تلاش کر رہا ہو۔

"ہیلو ہیزی... ہیپی برتھ ڈے ہیزی..." کامل کے کسی کھلونے سے یہ آوازیں مسلسل نکل کر اس کی سماعت سے ٹکراتی رہیں۔ الماس وہیل چیئر پر بیٹھی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو، ان بدلتے ہوئے تاثرات کو بن کہے بھی پڑھ رہی تھی۔

" آپ اسے پسند کرتے ہیں نا؟" الماس کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے وہ خود سے بات کر رہی ہو۔

"نیمل شبگیر کو کوئی ناپسند کیسے کر سکتا ہے؟"

حق جیسے چونک کر دور دراز کے خیالوں سے واپس لوٹا۔ اس نے کارڈ کو ایک جھٹکے سے واپس میز پر پٹخ دیا جیسے وہ اسے جلا رہا ہو۔ اس نے اپنا رخ فوراً کامل کی طرف موڑ لیا۔ الماس اس کے دائیں جانب تھی اور اب وہ اس کی پشت دیکھ رہی تھی۔

"اور محبت؟" وہ جاننا چاہتی تھی۔

"ایسے کسی جذبے سے میرا کوئی واسطہ نہیں پڑا۔" وہ اب کامل کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بہت اچھی ہے۔خوبصورت ہے۔"الماس نے جیسے اس کی پشت کو مخاطب کیا۔

"دنیا میں بہت کچھ اچھا اور خوبصورت ہے۔"

"وہ آپ کی دوست تھی۔"

حق نے میز سے چائے کا کپ اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے۔وہ پھر سے اسی فخر اور استقامت سے کھڑا تھا جیسے دنیا میں اس سے زیادہ حق پہ کوئی نہ ہو۔

"میرے پاس دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے۔"

"لیکن اس نے آپ کے علاوہ کبھی کسی کو دوست نہیں بنایا۔اس کے پاس کوئی اور دوست نہیں تھا۔"الماس نے جیسے اسے یاد دلایا۔حق کے چہرے پر جیسے سایہ سا لہرایا۔اس نے پلکیں غیر ارادی طور پر جھپکیں۔گلے کی گلٹی ایک بار ڈوب کر ابھری۔

(" کل کو تم نے مزید دوست بنا لیے تو؟"

" آپ دس سال بعد دیکھیے گا۔نیمل کا ہینری کے علاوہ اور کوئی دوست نہیں ہوگا۔"

وہ آج بھی اپنے الفاظ پر قائم تھی۔کوئی بے وفا نکلا تھا تو ہینری تھا۔)

"اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہے۔اب وہ بچی نہیں ہے جسے میں دلاسہ دوں...اور نہ میں اس کا دوست ہوں۔بچپن کے رشتے وقت کے ساتھ دم توڑ دیتے ہیں۔"

"پھر آپ چونکے کیوں تھے اس کارڈ کو دیکھ کر؟"الماس کا اگلا سوال برجستہ تھا۔

حق نے چائے کا کپ واپس میز پر رکھا، اس بار اس کی نظریں الماس کی آنکھوں میں تھیں۔

"حیرت ہوئی۔ بزدار پیلس میں یہ کارڈ رکھنے کی جرأت کس نے کی؟"

"کیا وہ اتنا بھی ڈیزرو نہیں کرتی؟ ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ کیا وہ یہ رشتے ڈیزرو نہیں کرتی؟"

حق نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ اس نے الماس کو دیکھا پھر اس نیلے کارڈ کو اور آخر میں کھیلتے ہوئے کامل کو۔

"اگر دنیا میں کوئی انسان سب کچھ ڈیزرو کرتا ہے تو وہ نیمل شبگیر ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے وہ سب ملے جو وہ چاہتی ہے مگر افسوس سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی چاہت میں میری بربادی سرفہرست ہوگی۔" وہ پھیکا سا مسکرایا۔

"آپ کو نہیں لگتا آپ نے اسے کھو کر دنیا کھو دی؟"

"کچھ نقصان اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔"
یہ کہہ کر حق نے اپنا رخ موڑا اور تیز قدموں سے کامل کی طرف بڑھ گیا جبکہ میز کے قریب پڑا کامل کا کھلونا ابھی بھی پکار رہا تھا۔

"ہپی برتھ ڈے ہینری... ہپی برتھ ڈے!"

☆☆☆☆☆

مال کی وسیع و عریض پارکنگ میں سلال نے مہارت سے گاڑی ایک خالی سلاٹ میں پارک کی۔ شاپنگ مال کے شیشے کے بڑے دروازوں سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ نیمل ابھی گاڑی کا دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ اس کے ہینڈ بیگ میں رکھا فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ یہ پچھلے دو گھنٹوں میں چوتھی کال تھی۔ جب سے نیمل نے وہ ہائی پروفائل ڈیفنس کیس جیتا تھا، شہر کے قانونی حلقوں میں اس کے نام کی دھوم مچ چکی تھی اور بے شمار نئے کلائنٹس اپنے پیچیدہ کیسز کے سلسلے میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیمل نے ایک گہرا سانس لیا اور فون اسکرین پر چمکتا ہوا انجان نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی۔

"ہیلو؟ نیمل اسپیکنگ..." اس نے ہمیشہ کی طرح ایک حد درجہ نفاست اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں گفتگو شروع کی۔ دوسری طرف سے کوئی نیا کلائنٹ اپنے ایک اہم کیس کے لیے اس کی اپوائنٹمنٹ چاہ رہا تھا۔ نیمل نے سامنے لگی مال کی بڑی عمارت کو دیکھا پھر اس نے بہت نرمی مگر دوٹوک انداز میں معذرت کی۔

"بہت شکریہ کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا لیکن میں معذرت چاہوں گی۔ میری شادی کی وجہ سے میں اگلے ایک مہینے کے لیے مکمل چھٹی پر ہوں، اس لیے میں فی الحال کوئی نیا کیس سائن نہیں کر سکتی۔ آپ چاہیں تو میرے سینئر کے چیمبر سے رجوع کر سکتے ہیں۔"

کال بند کر کے اس نے فون واپس بیگ میں رکھا تو سلال نے اسٹیرنگ ویل سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کو اب ایک اسسٹنٹ رکھ لینا چاہیے۔ ایسے کب تک لوگوں کو جواب دیتی رہیں گی؟"

"سوچ رہی ہوں بس کچھ دن اور..." نیمل کے لبوں پر ایک پھیکی اور اداس سی مسکراہٹ ابھری۔ اس کے اندرونی احساسات اس وقت بہت عجیب تھے۔ ایک طرف اس کے کیریئر کی یہ شاندار کامیابی تھی اور دوسری طرف شادی کا یہ ہنگامہ جس نے اسے اپنے ہی حصار سے باہر نکال کھڑا کیا تھا۔ اس کا دل جیسے ان تمام تبدیلیوں کو اتنی جلدی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد، مال کا ماحول بدل چکا تھا۔ شاہ زیب وہاں خوش مزاجی کے ساتھ موجود تھا اور سلال نے واقعی پورے معاملے کو اتنی عقل مندی سے سنبھالا تھا کہ کہیں بھی کوئی عجیب صورتحال پیدا نہیں ہوئی۔ وہ تینوں شاپنگ مال کے ایک انتہائی مہنگے اور برانڈڈ برائیڈل اسٹوڈیو میں موجود تھے جہاں شاہ زیب کی گہری خواہش پر نیمل نے اپنی پسند سے ایک حد درجہ نفیس اور خوبصورت نیلے مائل سرمئی رنگ کا ولیمے کا جوڑا فائنل کر لیا تھا۔ سلال ان کے ساتھ تھا۔ نیمل چاہتی تھی وہ ساتھ رہے۔ شاہ زیب کو یوں بھی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بس شاپنگ کرنے آئے تھے۔ شاہ زیب اس وقت بے حد خوش تھا کیونکہ نیمل کا یہ انتخاب اس کے خاندانی معیار کے بالکل مطابق تھا اور اب شاپنگ مکمل ہونے کے بعد وہ سب واپس پارکنگ ایریا کی طرف آ رہے تھے۔ شاپنگ مال کے ایگزٹ گیٹ کے باہر جہاں قیمتی گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا، شاہ زیب سلال کی گاڑی کے قریب آیا۔ اس نے حد درجہ احترام اور نفاست سے آگے بڑھ کر نیمل کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ نیمل نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ شاہ زیب کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکرا کر جیسے ہی گاڑی کے اندر بیٹھنے لگی بالکل اسی لمحے قریب سے، کالے رنگ کی چمکتی ہوئی لگژری لینڈ کروزر انتہائی دھیمی رفتار سے گزری۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر حق موجود تھا۔ وقت جیسے ایک سیکنڈ کے لیے وہیں منجمد ہو گیا۔ گاڑی کے شیشے کے پار نیلی آنکھوں نے سامنے کا یہ منظر دیکھا۔ شاہ زیب کا دروازہ کھولنا، نیمل کا اس طرح مسکرا کر شکریہ کہنا اور اس کی زندگی میں آنے والا یہ نیا پرسکون بھرم... یہ

سب بس ایک پل کی جھلک تھی مگر حق بزدار کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ اس کے ماتھے پر ایک باریک شکن ابھری۔ بس وہ ایک سیکنڈ کا منظر تھا اور اگلے ہی پل حق کی تیز رفتار گاڑی شاپنگ مال کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

گاڑی کے ریئر ویو مرر میں وہ دونوں اب دھندلے نقطوں کی طرح پیچھے چھوٹ رہے تھے۔ وہ دلکش مسکراہٹ جو کبھی ہینری کو تمام تکلیفوں سے نکال لایا کرتی تھی، اب کسی اور کے ماتھے کا جھومر بننے جا رہی تھی۔ حق نے اسٹیئرنگ ویل پر اپنے ہاتھ کی گرفت کو اس حد تک سخت کر دیا کہ اس کی پوریں سفید پڑ گئیں۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ایک تپش ابھری اور پھر ہمیشہ کے لیے سرد برف کی طرح جم گئی۔ اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔ نقصان تو سالوں پہلے ہو چکا تھا اور یہ نقصان اس کی اپنی توقع سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ اتنا گہرا کہ بزدار پیلس کی تمام تر دولت اور طاقت بھی مل کر اب اس خالی پن کو نہیں بھر سکتی تھی۔ سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑتی اس سیاہ لینڈ کروزر کے بند اور ایئر ٹائٹ شیشوں کے اندر اس دم گھونٹتے سکوت میں، کامل کے کھلونے کی وہ معصوم پکار اب بھی حق کے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی۔

"ہیپی برتھ ڈے ہینری... ہیپی برتھ ڈے!"

نیمل شبگیر نے واقعی اپنے حصے کا بھرم برقرار رکھنا اور آگے بڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن ہینری کے حصے میں اب صرف اس کی اپنی ہی بربادی کا وہ سیاہ سفر باقی تھا، جس کی پہلی دستک اس نیلے مخملی کارڈ کی صورت میں اس کے دل پر پڑ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی شبگیر ہاؤس کسی شاہانہ لڑی کی طرح روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ در و دیوار پر لٹکی پیلی اور سنہری لائٹس ماحول میں ایک سحر انگیز گرمجوشی گھول رہی تھیں مگر اس کے ساتھ ہی خنکی اور سردی کا احساس بتدریج بڑھ رہا تھا۔ گھر کا وسیع صحن اور لان اس وقت مہمانوں اور رشتے داروں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا جہاں ہنسی مذاق، چڑیوں جیسی چہچہاہٹ اور روایتی شادی کے گیتوں کی دھیمی گونج فضا کو معطر کر رہی تھی۔ صحن کے وسط میں بنے ایک خوبصورت، گیندے کے پھولوں سے سجے اسٹیج پر نیمل بیٹھی تھی۔ مائیوں کا روایتی، گہرا پیلا زری کا جوڑا پہنے، بالوں میں موتیے کے گجرے سجائے اور چہرے پر ہلکے نفیس میک اپ کے ساتھ وہ حد درجہ پُرکشش اور معصوم لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک طویل عرصے بعد ایک پرسکون اطمینان تھا۔ آس پاس خاندانی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ نامرہ، تارہ اور نوفہ ہلکے پیلے رنگ کے خوبصورت لباسوں میں ملبوس، تتلیوں کی طرح پورے صحن میں منڈلا رہی تھیں۔ دوسری طرف سلال اور سقراط، سفید کلف لگے شلوار قمیص میں حد درجہ باوقار اور ذمہ دار لگ رہے تھے۔ رسم کے لیے آنے والی ہر خاتون کو شبگیر فیملی کی طرف سے ایک حد درجہ خوبصورت اور نفیس گفٹ باکس پیش کیا جا رہا تھا۔ تارہ نہایت تسلی اور مہارت سے اپنے کیمرہ سے اس پورے یادگار ایونٹ کی ویڈیو ریکارڈنگ کر رہی تھی، تاکہ زندگی کا یہ خوبصورت رنگ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

مغرب کا وقت گزر چکا تھا اور اب رات کے اندھیرے نے پیلی روشنیوں کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ اسٹیج پر اب نیمل کے ساتھ آصفہ پھوپھو بیٹھی تھیں۔ وہ پورے محلے اور رشتے داروں میں سب سے آخر میں آئی تھیں تاکہ مطابق محلے داروں کے طعنوں، طنزیہ باتوں اور فضول سوالات سے بچ سکیں۔ نیمل انہیں اپنے سامنے دیکھ کر واقعی بہت خوش ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھوپھو کے لیے احترام اور محبت چمک اٹھی۔

آصفہ پھوپھو نہایت پیار سے نیمل کے ہاتھوں پر ہلدی کی رسم کر رہی تھیں، اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دے رہی تھیں کہ اچانک نوفہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اسٹیج پر آئی۔ اس کے ہاتھ میں نیمل کا فون تھا جو مسلسل وائبریٹ کر رہا تھا۔

"آپی! آپ کا فون ہے۔" نوفہ نے شور کے باعث نیمل کے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"میں ابھی بات نہیں کر سکتی نوفہ! فون بند کر دو۔"

"آپی میں نے کال کاٹ دی تھی مگر یہ دوبارہ آیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں بہت ضروری بات ہے، ایک بار بات کر لیں۔" نوفہ کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔

نیمل نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے آصفہ پھوپھو سے نظروں سے اجازت چاہی، جنہوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ نوفہ نے فون کا اسپیکر آن کیے بغیر اسے نیمل کے کان سے لگا دیا۔ نیمل نے پیشہ ورانہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیلو، نیمل شبگیر اسپیکنگ..."

"ہیلو بیلا..."

دوسری جانب سے ابھرنے والی اس گہری بھاری آواز کے کان میں پڑتے ہی جیسے پورے شبگیر ہاؤس کا وقت ایک جھٹکے سے ساکت ہو گیا۔ نیمل کی چھوٹی، خوبصورت آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی۔ آس پاس کا وہ سارا شور، عورتوں کے گیت، چوڑیوں کی کھنکناہٹ، نامرہ کے قہقہے... سب کچھ جیسے ایک پل میں غائب ہو گیا اور اس کی سماعت میں صرف ایک گونج باقی رہ گئی۔

وہ مائیوں کے اسٹیج سے پھسل کر سیدھی ماضی کے جھروکے میں جا گری جہاں ایک جانی پہچانی آواز اس کے وجود کو پکار رہی تھی۔

"بیلا! تم بڑی ہو کر کیا بننا چاہتی ہو؟" ماضی کے دھندلکوں سے ایک سحر انگیز اور مانوس آواز ابھری۔

"مُجھے بیلامت کہا کریں!" ایک چھوٹی، ضدی لڑکی نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔

"تم مُجھے ہینری کہتی ہو، میں تمہیں بیلا کیوں نہیں کہہ سکتا؟" سامنے کھڑے گہری نیلی آنکھوں والے لڑکے کے لہجے میں ایک عجیب سا استحقاق تھا۔

"بیلا نام سن کر ایک نازک سی لڑکی کا تصور ابھرتا ہے۔" لڑکی نے اپنی دلیل پیش کی۔

"تو؟" لڑکے نے ابرو اچکائے۔

"تو میں اپنے آپ کو بہت مضبوط دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ایک طاقتور انسان بنوں گی، بیلا مجھ پر سوٹ نہیں کرے گا۔"

اور اس کی اس معصومانہ منطق پر وہ لڑکا زور سے ہنس دیا جو آج بھی اس کے اعصاب میں گونج رہا تھا۔

" کیسی ہو بیلا؟"

نیمل کا وجود مائیوں کے اس زرد اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے جیسے گرم تیل اور ہلدی کے بیچ بالکل برف بن چکا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو، اپنی انگلیوں کو معمولی سی حرکت دینے کی کوشش کی مگر اس کا پورا جسم جیسے کسی شدید صدمے سے منجمد ہو چکا تھا جیسے روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ کب آصفہ پھوپھو اپنی رسم پوری کر کے اسٹیج سے اٹھ کر جا چکی تھیں۔ وہ اب اس روشنیوں سے نہائے ہوئے اسٹیج پر بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔ آس پاس لوگ ہنس رہے تھے، روشنیاں چمک رہی تھیں، خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر، خالی خالی اور بالکل بے تاثر نظروں سے اپنے سامنے میز پر رکھے گیندے کے زرد پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں یاد ہے، پانچ سال پہلے تم نے مُجھے میری شادی کے دن فون کیا تھا؟"

اسکی خاموشی پر وہ پھر سے گویا ہوا۔ نیمل کو یاد تھا...اسے اس بساط کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک سیکنڈ یاد تھا۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی؟

"تم نے مُجھے شادی کی مبارکباد دی تھی۔"

نیمل کے لب جیسے ایک دوسرے سے چپک گئے۔ اس کی آنکھیں سامنے رکھے گیندے کے پھولوں پر جم کر رہ گئیں۔ وہ خاموش رہی، ایک ایسی خاموشی جو خود میں ایک اعتراف تھی۔

"تو محترمہ نیمل شبگیر صاحبہ...!" حق نے دوسری طرف سے ایک سرد سا سانس لیا۔

"شادی کی ایڈوانس مبارکباد! مُجھے پوری امید ہے کہ تم یقیناً خوش رہوگی۔" وہ شاید دھیما سا مسکرایا ہوگا۔ نیمل تصور کر سکتی تھی۔

"میں تب بچی تھی..." وہ بس اتنا ہی بول پائی۔

"لیکن باتیں تو تم نے بہت بڑی کی تھیں..." وہ کہہ نہیں پایا، اتنی بڑی باتیں کہ دلہا بنے اس حق بزدار کے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

نیمل نے بوجھل سانس لی اور اس سانس کے ساتھ ہی زرد روشنیوں سے نہایا ہوا شبگیر ہاؤس کا صحن دھندلا گیا۔ حق کو وہ دن بہت اچھے سے یاد تھا...حد درجہ اچھے سے۔
وہ دلہا بنے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا نکاح بس چند منٹوں میں شروع ہونے والا تھا، گواہ اور قاضی صاحب باہر ہال میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی لمحے اس کے پرفون کی اسکرین روشن ہوئی۔ ایک ایسا نمبر چمک رہا تھا جسے اس نے کبھی ڈیلیٹ نہیں کیا تھا۔

"شادی مبارک ہو حق بزدار!"

"تم مُجھے ہینری بلا سکتی ہو۔" وہ بہت نرم لہجے میں بولا تھا۔ نیمل کے لیے اسکا لہجہ کبھی سخت ہوا ہی نہیں تھا۔

"آپ یہ ڈیز رو نہیں کرتے..."

"پھر کیا ڈیزرو کرتا ہوں میں؟" وہ آئینے میں نظر آنے والے اپنے مکمل عکس کو دیکھ رہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں..."

اور اس ایک جملے نے شیروانی پہنے اس دلہے کے چہرے کے سارے تاثرات یکدم غائب کر دیے تھے۔حق نے اس وقت فون کی اسکرین کو ایسے دیکھا تھا جیسے اس پر نیمل کا چہرہ ابھر آیا ہو۔فون کٹ گیا اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"موسم بدل جاتے ہیں مگر کہے ہوئے الفاظ اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔" حق کی آواز نے ماضی کے اس خوبصورت جھروکے کو ایک جھٹکے سے توڑا اور نیمل کو واپس مائیوں کے زرد اسٹیج پر لا پٹخا۔ ہوا اب مزید خنک ہو چکی تھی اور نیمل کا ہاتھ فون پر سخت ہو چکا تھا۔

"آپ نے مُجھ سے بدلہ لینے کے لیے فون کیا ہے؟" نیمل نے اپنی آواز کو جتنا ہو سکا مضبوط بنایا حالانکہ اس کی آنکھوں کے گوشے اب گیلے ہو رہے تھے۔حق دھیمے سے ہنسا، ایک ایسی ہنسی جس میں کوئی گرمجوشی نہیں تھی۔

"تم رویا مت کرو بیلا..."

اس نے نیمل کو ایک بار پھر ساکت کیا۔

"شاہ زیب ایک اچھا لڑکا ہے، وہ تمہیں خوش رکھے گا۔"
نیمل نے کچھ کہنا چاہا مگر حق نے اسے موقع نہیں دیا۔کال کٹ گئی اور فون کی اسکرین سیاہ ہو گئی۔نیمل مائیوں کے اس چمکتے ہوئے، روشنیوں سے نہائے اسٹیج پر بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔تارہ کی ویڈیو ریکارڈنگ جاری تھی، نامرہ کے قہقہے اب بھی گونج رہے تھے مگر نیمل کا دل اب اس پیلی روشنی کے بیچ ایک ایسے اندھیرے میں گھرا ہوا تھا جہاں اس کا وہ واحد دوست اس کا سب سے بڑا دشمن بن چکا تھا اور وہ اس سے شکایتیں بھی نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆

رات اتر آئی تھی۔لان کے ایک کونے میں رکھی شیشے کی میز پر نیورو پیتھالوجی اور کلینیکل میڈیسن کے چند نوٹس اور موٹی کتابیں بکھری پڑی تھیں جن کے صفحے ہوا کے دوش پر ہلکے سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔عالیہ اس وقت میز کے قریب کھڑی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔اس کا چہرہ تھکن اور ذہنی دباؤ کی گواہی دے رہا تھا۔جیسے ہی اس نے اپنی بات مکمل کر کے فون بند کیا اپنے سامنے کرسی پر نہایت آرام دہ انداز میں بیٹھتی نشاط کو دیکھا تو وہ ایک پل کو بری طرح ٹھٹک گئی۔

"السلام علیکم، پھوپھو!" عالیہ نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا۔نشاط سے اس کی بات چیت اکثر ہو جاتی تھی۔اس سے تعلقات اچھے نہیں تھے تو برے بھی نہیں تھے۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو عالیہ؟" نشاط کی نظریں عالیہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر جم گئیں۔"تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے یہ؟"

عالیہ خاموشی سے سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی،اس کے ہاتھ لاشعوری طور پر اپنے نوٹس کو سمیٹنے لگے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"شمس بھائی نے بتایا..." نشاط نے اپنے لہجے میں جان بوجھ کر ایک ہمدردانہ زہر گھولا۔"تمہاری اس دوسری پوزیشن نے انہیں شدید مایوس کیا ہے۔وہ کہہ رہے تھے کہ عالیہ سے انہیں ایسی سطحی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔"

نشاط کے یہ الفاظ سنتے ہی عالیہ کا دل جیسے اندر سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔اس کی آنکھوں کے گوشے سلگنے لگے۔اس کا اپنا باپ...اس کا سگا باپ، اس سے خود بات کرنے اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے بجائے دنیا کے سامنے،رشتے داروں کے سامنے اس کی مایوسی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا؟ وہ اندر ہی اندر شدید سلگنے لگی اور خود کو اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرانے لگی۔

"میں ٹھیک سے نہیں پڑھ پائی..." عالیہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" نشاط نے اس کے گرتے ہوئے مورال کو ایک نئی اور تاریک سمت دیتے ہوئے اکسایا۔" کوئی بھی انسان

کیسے فرسٹ آ سکتا ہے جب اس کا مقابلہ اس لڑکے کے ساتھ ہو؟ سلال؟ یہی نام ہے نا اسکا؟ وہ خون ہی ایسا ہے۔"

سقراط کا بھتیجا...سقراط کے خیال پر نشاط کا لہجہ زہریلا، حقارت آمیز اور زہرخند لہجہ ہو گیا۔ ماضی کی عداوت اس کی آواز سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

"میں کیا کروں پھوپھو؟ میں نے اپنا سو فیصد دیا ہے۔ دن رات ایک کیے ہیں مگر..." بالآخر عالیہ پھٹ پڑی۔

نشاط نے اپنی جانچتی اور شاطرانہ نگاہوں سے عالیہ کے چہرے پر پھیلے اس کرب کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ لوہا اب گرم تھا اور اب حتمی ضرب لگانے کا وقت آ چکا تھا۔

"تم چاہتی ہو نا کہ اگلے سال میڈیکل کالج میں تم فرسٹ آؤ؟ تم دوبارہ اپنا کھویا ہوا رتبہ حاصل کرو؟" نشاط نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔
"تو پھر...کچھ ایسا کرو جو اس لڑکے کو اندر تک توڑ کر رکھ دے۔ اسے راستے سے ہٹاؤ..."
"کیا مطلب؟" عالیہ نے چونک کر اپنی نادیدہ نگاہیں اٹھائیں۔

"اس لڑکے کو سب سے زیادہ عزیز کیا ہے؟" نشاط نے پراسرار لہجے میں پوچھا۔

عالیہ کچھ دیر خاموش رہی، اپنے لبوں کو دانتوں تلے کچلتی رہی جیسے میڈیکل کالج کے اس کوریڈور میں سلال کے رویے اور اس کی شخصیت کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اسکا آنر...اس کا کردار...اسے اپنا شفاف اور بے داغ کردار سب سے زیادہ عزیز ہے۔" عالیہ نے سچائی کا اعتراف کیا۔

"تو پھر...اس کے اسی کردار کو داغ دار کر دو!" نشاط نے انتہائی سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا۔

"پھو...پھو..." عالیہ نے شدید ناسمجھی، خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے نشاط کو دیکھا۔ اس وقت رات کے اس سناٹے میں وسیع لان کے اندر ان دونوں کے علاوہ تیسرا کوئی نہیں تھا۔

"تمہیں جیتنا ہے نا عالیہ؟" نشاط نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"لیکن پھوپھو..." وہ خوفزدہ ہوئی۔

"ہاں یا ناں؟"

اور عالیہ کا سر نا چاہتے ہوئے بھی آہستہ آہستہ اثبات میں ہلتا چلا گیا۔

"گڈ!" نشاط کے سرخ لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔

"مگر... یہ سب... سب کیسے ہوگا؟" عالیہ کا تذبذب کا شکار تھی۔

"تمہیں وہی کرنا ہوگا جو سالوں پہلے ہوا تھا۔" نشاط نے مزید آگے کو جھکتے ہوئے رازدانہ لہجے میں کہا جبکہ عالیہ نا سمجھی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ "اسے Sexual Harassment کے جھوٹے کیس میں پھنسا کر جیل بھجوا دو۔"

یہ سنتے ہی عالیہ کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ شدید بے یقینی سے نشاط کو دیکھ رہی تھی، ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ کا ضمیر اس گھناؤنی سازش پر پل بھر کانپ اٹھا تھا۔

"ن..نن..نہیں..." عالیہ شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئی۔

"تو پھر ٹھیک ہے، اگلے سال بھی ہارنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ اس کے علاوہ سلال شبگیر کو راستے سے ہٹانے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔" نشاط نے بے نیازی سے کہا اور اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ عالیہ کے چہرے پر اس وقت شدید تکلیف، کرب اور الجھن کے آثار واضح تھے مگر اس کے اندر کی انا اور سلال سے جیتنے کا جنون اب اس کے ضمیر پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر اسے اپنی برتری قائم رکھنی ہے تو سلال کو اس کے راستے سے ہٹنا ہی ہوگا۔ نشاط نے ایک آخری، اچٹتی ہوئی گہری نگاہ اس پر ڈالی اور پلٹ گئی۔ وہ ابھی چند قدم ہی

چلی ہوگی کہ عقب سے عالیہ کی لرزتی آواز ابھری۔

"مُجھے کیا کرنا ہوگا، پھوپھو؟"

نشاط کے قدم وہیں ٹھہر گئے۔اس کے سیاہ دل والے سفید چہرے شیطانی مسکراہٹ ابھری۔وہ دھیرے سے پلٹی۔اس کے سامنے تذبذب کا شکار عالیہ بیٹھی تھی مگر اس کی آنکھوں میں جلتی حسد کی وہ زہریلی آگ اب نشاط صاف دیکھ سکتی تھی۔
کہا جاتا ہے کہ ماں اور بیٹی کی دوالگ گوت (نسل اور خاندان) ہوسکتی ہیں مگر پھوپھو اور بھتیجی کی گوت ہمیشہ ایک ہوتی ہے اور آج اس تاریک رات میں یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ان دونوں کی مٹی ایک ہی جیسی تھی، زہریلی، کڑوی اور حاسد!
عالیہ بزدار کی بساط پر سمّ (زہر) کا وہ پہلا قطرہ خاموشی سے ٹپک چکا تھا۔زہر کو کبھی اپنے پھیلاؤ کے لیے کسی شوروغل یا دھماکے کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ تو بس ایک دھیمی سی، رازدانہ سرگوشی کے ذریعے رگوں میں اترتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے وجود کے لہو کو نیلا کر دیتا ہے۔
عالیہ کے اندر پنپنے والا وہ حسد اب جان لیواز ہر کی شکل اختیار کر چکا تھا اور جانے اب مسموم کون ٹھہرتا۔

☆☆☆☆☆

جاری ہے۔

بزدار خاندان